تحقیق، تدوین، ترتیب
جمیل اختر

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

کلیات بلونت سنگھ

(افسانے)

حصہ سوم

تحقیق، تدوین، ترتیب

جمیل اختر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ویسٹ بلاک۔1، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔066 110

پہلی اشاعت : 2009
تعداد : 550
قیمت : 259 روپے
سلسلہ مطبوعات : 1314

Kulliyat-e-Balwant Singh, Vol.-III
Compiled by Jameel Akhtar

ISBN : 978-81-7587-280-6

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066
فون نمبر: 26103938، 26103381، 26179657، فیکس: 26108159
ای میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: ہائی ٹیک گرافکس، 167/8، سوناپریا چمبرس، جولینا، نئی دہلی۔110025
Paper used 70 Gsm TNPL

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جا سکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور

پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ انگریزی اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

کلیات بلونت سنگھ کی یہ اشاعت اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ چونکہ بلونت سنگھ کی تصانیف ان کی نگرانی میں عمل میں آیا تھا اس کے بعد اشاعت ثانی نہیں ہو سکی اس لیے پہلے اڈیشن کے متن میں کسی قسم کے ہیر پھیر کی گنجائش کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا مرتب نے کلیات کی تدوین میں اس کو ہی بنیادی نسخہ مانا ہے۔ جو افسانے ان کے کسی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہیں اور رسائل سے دستیاب ہوئے ہیں ان کی حیثیت بھی اصل ہی کی ہے۔ اس لیے کہ ان کا کوئی دوسرا متن اور کہیں دستیاب نہیں ہے۔ کلیات کی تدوین میں تقویم کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ افسانوی مجموعوں کے علاوہ درمیان میں نئے افسانوں کی شمولیت بھی تاریخی ترتیب میں ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ مرتب نے کلیات کے افسانوں کی تقویمی ترتیب رسائل میں شائع شدہ افسانوں کے سنہ اشاعت کے مطابق رکھی ہے اور جن افسانوں کا سال اشاعت رسائل سے دستیاب نہیں ہو سکا ہے انھیں مجموعے کے زمانۂ اشاعت کے مطابق اسی درمیان میں رکھا گیا ہے۔ ایک افسانہ اگر کئی رسالوں میں شائع ہوا ہے تو پہلی اشاعت کو ترجیح دی گئی ہے۔

اہل علم سے گزارش ہے کہ کتاب میں کوئی خامی نظر آئے تو تحریر فرمائیں تاکہ اگلی اشاعت میں دور کی جا سکے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

انتساب

قرۃ العین حیدر

کے نام

جنہوں نے اردو فکشن کو وقار و اعتبار بخشا

فہرست

کچھ اس کلیات کے بارے میں

بلونت سنگھ اپنے عہد کے اہم افسانہ نگار ہیں۔ جون 1921 میں چک بہلول ضلع گوجرانوالہ (پاکستان) میں ولادت ہوئی۔ بلونت سنگھ نے اسکول کے زمانے سے ہی لکھنا شروع کردیا تھا۔ ان کا پہلا افسانہ ''سزا'' ''ساقی'' اگست 1938 میں شائع ہوا۔ 1938 سے 1944 تک آٹھ افسانے ساقی میں شائع ہوئے۔ اگست 1938 کے بعد دوسرا افسانہ 'دیش بھگت' ساقی نومبر 1940، 'جگا' ساقی جنوری 1941، 'نینا' ساقی جولائی 1941، پردیس، ماتاہری، حوا کی پوتی کا افسانہ محبت 1943 تک شائع ہوئے۔ پہلی بار جولائی 1944 میں ان کا ایک افسانہ ''شہناز'' ادبی دنیا لاہور میں شائع ہوا۔ یہیں سے انہوں نے افسانوی دنیا میں اڑان بھرنا شروع کی۔ اس کی اپنی وجہ بھی ہے۔ 1942 میں بی اے کی ڈگری الہ آباد یونی ورسٹی سے حاصل کرنے کے بعد بلونت سنگھ کچھ دنوں کے لیے لاہور منتقل ہوگئے، جہاں انہیں مولانا صلاح الدین احمد (اڈیٹر ادبی دنیا) راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر کی صحبتیں ملیں۔ ان کی ملاقاتوں نے بلونت سنگھ کے اندر ایک نئی روح پھونک دی۔ بلونت سنگھ جو ابھی تک آہستہ خرام تھے برق رفتاری سے دوڑنے لگے۔ اب تقریباً ہر دوسرے تیسرے ماہ ان کا ایک افسانہ ادبی دنیا میں شائع ہونے لگا اور پھر بلونت سنگھ تواتر سے لکھنے لگے اور مختلف ادبی رسائل میں چھپنے لگے۔ ''ساقی'' میں ان

کے کل دس افسانے اور دو ڈرامے، ''قلوپطرہ کی موت'' اور ''مرغی'' شائع ہوئے۔ 'ادبی دنیا' میں سات افسانے اور ایک ڈراما ''سنگ زن'' شائع ہوئے۔ ''ساقی'' اور ''ادبی دنیا'' کے بعد ان کی کہانیاں ہمایوں لاہور، آج کل دلی، نقوش لاہور اور فسانہ میں شائع ہوئیں — کچھ کہانیاں سچی دنیا، سنگم، نئی دنیا، تیج ویکلی میں بھی شائع ہوئیں۔ لیکن ان کا ابھی تک کوئی صحیح سراغ نہیں مل سکا ہے۔ ایک کہانی ''ڈنڈ'' تیج ویکلی میں شائع ہوئی ہے جو ہندی میں ہے۔ ہندی میں ان کی کہانیاں آج کل دلی، جاگرتی، ہنس، مایا، منوہر کہانیاں اور اردو ساہتیہ الہ آباد میں شائع ہوئیں۔

لیکن رسائل کی مکمل فائل کسی ایک لائبریری میں نہیں ملنے کی وجہ سے تمام کہانیوں کی دریافت یا تلاش ممکن نہیں ہوسکی۔ دوسرے، وسائل کی کمی بھی کہانیوں کی تلاش میں مانع رہی۔ سرکاری اداروں میں اشتہار پر روپیہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے اور تحقیق کے لیے وسائل محدود کر دیے جاتے ہیں جس سے معیاری تحقیق کا عمل پورا نہیں ہو پاتا اور آدھا ادھورا جو بھی محدود وسائل میں دستیاب ہو پاتا ہے اسے غنیمت جان کر اسی پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

اس پروجیکٹ میں بھی دشواریاں رہیں۔ شروع میں جب میں نے اس پر کام کرنے کا ارادہ کیا تھا تو میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکالنی ہوگی لیکن ہوا کچھ ایسا ہی۔ بلونت سنگھ کی تخلیقات کی تلاش کا سفر کانٹوں بھرا رہا۔ دہلی کے تمام اہم کتب خانے بلونت سنگھ کی کتابوں سے محروم ہیں۔ دلّی یونی ورسٹی، جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دلّی پبلک لائبریری، ساہتیہ اکیڈمی، دلی اردو اکادمی اور لوگوں کے ذاتی کتب خانے، کہیں بھی بلونت سنگھ کی تمام کتابیں موجود نہیں ہیں۔ ایک دو کتابیں ہی ہیں۔ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری، پٹنہ کی خدا بخش لائبریری جو تحقیق کا بڑا گڑھ کہی جاتی ہیں وہاں سے بھی چند کتابیں ہی دستیاب ہوسکیں۔ الہ آباد یونی ورسٹی کی لائبریری بھی اپنے محبوب فکشن نگار کے سرمایے سے محروم ہے۔ وہاں سے تلاش کے بعد بھی [illegible] دستیاب نہ ہوسکا۔ ان کے چھ افسانوی مجموعوں میں سے تین خدا بخش لائبریری پٹنہ سے، ایک آزاد لائبریری علی گڑھ سے، ایک ساہتیہ اکیڈمی دلّی سے اور ایک

بلونت سنگھ کی بیوی منجو سنگھ (الہ آباد) سے دستیاب ہوا۔ اس طرح یہ بڑا دقت طلب مرحلہ طے ہوئی۔ میں نے یہ تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اتنی دشواریاں اس راہ میں پیش آئیں گی اور اس پر بھی جب تحقیق کے لیے ہندوستان کی اہم لائبریریوں کا دورہ کرنے کے لیے کوئی وسیلہ بھی نہ ہو۔ گھر بیٹھے تحقیق کے جاں کاہ مراحل کو انجام دینا ناممکن ہے۔ اس متن مکمل جہاں بھی نہیں ملتا۔

اس پر بھی بات صرف افسانوی مجموعوں کی تلاش تک ہی محدود ہو تو کسی حد تک بات بن بھی جاتی۔ لیکن معاملہ اگر اس سے بھی آگے کا ہو تو مشکل کی دیواریں حائل ہو جاتی ہیں۔ اپنے ذاتی وسائل کا استعمال ضروری ہو جاتا ہے۔ میں نے کلیات کی تدوین میں یہ امر ملحوظ رکھا ہے کہ افسانوی مجموعوں کو ہی کسی بھی فکشن نگار کی کل پونجی تصور نہیں کیا جائے بلکہ رسائل کی دنیائے بے پایاں میں غوطہ زن ہو کر گوہر آب دار تلاش کیا جائے اور فکشن نگار کی موجود پونجی میں اضافہ کر کے کلیات کے معنی و مفہوم کو مکمل کیا جائے۔ اس عمل میں نہ صرف دشواریاں ہزار ہیں بلکہ "انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا"

تحقیق و تلاش کا کیڑا جب تک انگ انگ کو نہ ڈسے اور جذبۂ صادق خون کی رگ رگ میں موجزن نہ ہو اس دشوار گذار عمل کا تصور محال ہے اور میں جب اس طرح کے کسی کام کو کرنے کا ارادہ کرتا ہوں تو پھر اس سے پورے طور پر عہدہ بر آ ہونا چاہتا ہوں۔ لیکن ایک حقیر انسان کی بساط میں یہ کہاں۔ یہ تو محض سمندر سے چند مشکیزہ پانی نکالنے کے مترادف ہے۔ میں نے محدود وسائل کے باوجود اپنی بساط بھر پوری دیانت داری کے ساتھ تحقیقی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہ علی گڑھ اور الہ آباد کا سفر بھی اس پروجیکٹ کے سلسلے میں ذاتی مصارف سے کیا۔ تقریباً ایک ہفتے تک الہ آباد میں رہا۔ بلونت سنگھ کی بیوی منجو سنگھ سے ملا۔ منجو سنگھ الہ آباد کے ایک کالج میں ہندی کی لکچرر ہیں۔ بے حد ملنسار، خلیق، متین اور سنجیدہ خاتون ہیں۔ اگر چہ وہ اردو نہیں جانتیں پھر بھی انہوں نے جہاں تک ممکن ہو سکا ہے بلونت سنگھ کی تمام

چیزیں بہت سنبھال کر رکھی ہیں۔ ادبی مزاج نہیں ہونے کی وجہ سے وہ بلونت سنگھ کی جمع پونجی کو اردو اور ہندی والوں سے نہ کیش کرا سکیں اور نہ ہی اپنے شوہر کی ادبی تشہیر کا کوئی سامان کرسکیں۔ بلونت سنگھ کے بیٹے اور بیٹی میں بھی باپ کی وراثت کو سنبھالنے کا ہنر نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سبھی بے حد خلیق ہیں، شگفتہ مزاج ہیں مہمان نواز ہیں۔ منجو سنگھ بے حد معاون ثابت ہوئیں انہوں نے جو کچھ بھی ان کے پاس تھا سبھی میرے سامنے لاکر رکھ دیا۔ اس میں سے جو چیز میرے کام کی تھی میں نے الگ کر لی اس طرح ان سے بہت سی چیزیں دستیاب ہوئیں۔ رسائل میں چھپے ہوئے چند افسانوں کی کٹنگ۔ اس کے علاوہ اردو اور ہندی کتابوں کی مکمل فہرست ان سے حاصل ہوئی۔ الٰہ آباد کے کچھ احباب نے بھی بھرپور تعاون کیا اور نئی معلومات فراہم ہوئیں۔ اس طرح الٰہ آباد کا سفر بہت کامیاب رہا اور پروجیکٹ کے لیے بے حد مفید ثابت ہوا۔ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں کئی ماہ تک رسائل کے ذخیرے سے تلاش وجستجو کا عمل جاری رہا جس کے نتیجے میں بہت سی نئی چیزیں دستیاب ہوئیں۔ اس کے باوجود بھی بہت سی چیزیں وسائل کی کمی کی وجہ سے معلومات ہونے کے باوجود مجھ سے دور رہیں یا دستیاب ہونے سے رہ گئیں۔ جو چیزیں معلومات ہونے کے باوجود دستیاب نہیں ہوسکیں ہیں اس کی فہرست آگے آئے گی۔ اور نئے دستیاب شدہ افسانوں، ڈراموں اور مضامین کی فہرست بھی دی جائے گی تاکہ تحقیقی کامیابی کی داستان بھی بیان ہوسکے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اتنی ہی دشواریوں اور مشکلات کے بعد رسائل کے کرم خوردہ، دیمک زدہ اور گرد آلود فائلوں سے تھپکیاں دے دے کر کوئی کہانی نکلتی ہے۔ آج کے سائنٹفک دور میں مواصلاتی انقلاب کے باوجود اردو میں تحقیق کے ٹولس وضع نہیں کیے جاسکے ہیں۔ جس کی وجہ سے تحقیق کی راہ میں صدہا دشواریاں جو پہلے تھیں وہ آج بھی موجود ہیں۔

اس لیے اردو کا محقق، تحقیق کے تمام تقاضوں سے کما حقہ عہد برآ نہیں ہوسکتا۔ اردو میں معیاری تحقیق کا فقدان ہوتا جارہا ہے اسے محقق کی مجبوری بھی کہہ سکتے ہیں جس کا بخوبی اندازہ ادھر تحقیق کے سلسلے میں مجھے بھی ہو رہا ہے۔ بعض اوقات بڑی بے بسی محسوس ہوتی ہے۔ تحقیق کے لیے جو سہولت فراہم ہونی چاہیے وہ نہیں مل پاتی اور تحقیق کا سفر نامکمل رہ جاتا ہے۔ مکمل جہاں تو مجھے بھی نہیں مل پایا اس کی وجہ وسائل کی کمی تھی جس کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ چلیے یہ عمل آدھا ادھورا ہی سہی پورا تو ہوا اور بلونت سنگھ کی تخلیقات کے ذخیرے میں اس تحقیقی کاوش کے نتیجے میں خاطر خواہ اضافہ بھی ہوا بلکہ انکساری سے کہا جائے تو ایک حقیر سا اضافہ ہوا۔

بلونت سنگھ کے کلیات کو مرتب کرنے کا خیال میرے دل میں کئی وجہوں سے پیدا ہوا جس میں سب سے بڑی وجہ اس عظیم افسانہ نگار کو ناقدوں کے ذریعے نظر انداز کیا جانا تھا۔ اردو اور ہندی میں ملا کر تین درجن سے زیادہ کتابوں کا مصنف اور بقول اوپندر ناتھ اشک تقریباً ''تین سو کہانیوں کا خالق'' ہونے کے باوجود ان کے انتقال کے بعد اخبارات میں اس کے موت کی خبر نمایاں طور پر شائع نہیں ہوئی اور جب ارتھی اٹھی تو اردو، ہندی کے ادیبوں میں سے کوئی بھی وہاں موجود نہیں تھا۔ یہ کیسی وردنا کی تھی۔ نہ ہی کسی رسالے نے اس کے شایانِ شان کوئی نمبر ہی شائع کیا۔ سوائے چند ایک کے۔ مضامین لکھنے والے لوگوں کی بھی بے حد کمی رہی زیادہ تر مضامین رسائل نے ایک دوسرے سے نقل کیے۔ شاید کسی ناقد نے لکھنے کی حامی نہیں بھری۔ یہ ناانصافی اور وردنا کی مجھ سے دیکھی نہ گئی اور یہیں سے یہ خیال پختہ تر ہوا کہ پرانی پیڑھی نے جو کیا سو کیا۔ میں نئی پیڑھی سے ان کو متعارف کراؤں تاکہ اس ناانصافی کی تلافی ہو سکے۔ یہ سوچ کر قدم آگے بڑھایا۔ ہزارہا دشواریوں کے باوجود میں اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہوسکا ہوں۔ نئی نسل اب اس کلیات کا مطالعہ کرے گی اور تنقید کی نئی عینک لگا کر پڑھے گی تاکہ بلونت سنگھ کو انصاف مل سکے

اور ادب میں ان کے مقام و مرتبے کے تعین قدر میں آسانی ہو اس سے شاید بلونت سنگھ کی روح اطمینان کی سانس لے سکے گی اور ادب تخلیق کرنے پر جو شرمندگی اسے ہو رہی تھی وہ شاید ختم ہو جائے۔

دوسرے میرے ذریعے کی گئی تحقیق کے نتیجے میں بلونت سنگھ کے موجود سرمائے میں جو کچھ بھی اضافہ ہوا ہے اس سے بھی تنقید کے نئے باب وا ہوں گے۔ ان کے افسانوں کے حوالے سے جو تنقید اب تک ہو چکی ہے شاید اس سوچ میں بھی کوئی تبدیلی واقع ہو۔ اس لیے کہ اب تک جو تنقید ہوئی تھی وہ آدھے افسانوں کو سامنے رکھ کر لکھی گئی تھی۔ اب پونجی دوگنی ہو گئی ہے۔

اردو میں بلونت سنگھ کے افسانوی مجموعے صرف چھ ہیں:

1- جگا— مکتبہ اردو لاہور، پہلی اشاعت اپریل 1944
2- تارو پود— مکتبہ جدید لاہور، سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ لیکن گمان غالب ہے کہ یہ کتاب 1945 کے اواخر یا 1946 کے اوائل میں شائع ہوئی ہے۔ اس لیے کہ اس میں شامل افسانے جولائی 1945 تک کے ہیں۔
3- ہندوستان ہمارا— سنگم پبلی شنگ ہاؤس، الہ آباد سے جون 1947 میں پہلی بار شائع ہوا۔
4- سنہرا دیس— اس میں بھی سنِ اشاعت درج نہیں ہے۔ اس میں بھی 45 اور 1946 اور اس کے بعد کی کہانیاں شامل ہیں اور اندازہ یہی ہے کہ یہ کتاب 1950 کے دہے میں شائع ہوئی ہوگی۔
5- پہلا پتھر— مکتبہ جدید لاہور، دسمبر 1953
6- بلونت سنگھ کے افسانے— مکتبہ اردو لاہور، سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ اس میں چند افسانے نئے اور بقیہ پرانے ہیں۔

ان مجموعوں کے علاوہ تین اور مجموعوں کا نام ملتا ہے۔ ''شیرازہ''، ''اجلے پھول'' اور

''پنجاب کی کہانیاں'' لیکن ان مجموعوں کا کہیں سراغ نہیں مل سکا۔
اب ذرا ان چھ مجموعوں میں شامل کہانیوں پر بھی تفصیلی نظر ڈالیے:

1- جگا

(1) جگا (2) پردیسن (3) نیتا (4) سزا (5) ماتا ہری (6) دیش بھگت
(7) حوا کی پوتی کا افسانہ محبت (8) قلوپطرہ کی موت (ڈراما)
(9) مرغی (ڈراما) (10) پیامبر (ڈراما)

2- تار و پود

(1) سمجھوتہ (2) گرہستی (3) دیمک (4) کسبی (5) مہمان (6) شہباز
(7) خوددار (8) کمپوزیشن ٹیچر (9) جنگل میں منگل (10) اس کی بیوی
(11) پیار (12) خلا (13) پنجاب کا البیلا (14) تین باتیں۔

3- ہندوستان ہمارا

(1) ہندوستان ہمارا (2) پتھر کے دیوتا (3) بھیک منگے (4) کلنک
(5) ڈاکو (6) موت (7) اجنبی (8) جھرجھری (9) آزاد فاقہ
(10) سکوت (11) روشنی (12) بھیک۔

4- سنہرا دیش

(1) چکوری (2) منی کی موت (3) بابو مانک لال جی (4) رنگ (5) سہارا
(6) سورما سنگھ (7) عذاب (8) سنہرا دیش (9) تلچھٹ (10) مداوا
(11) ہمارا مکان (12) لمس (13) کٹھن ڈگریا (14) رقیب (15) ہیپرویٹ۔

5- پہلا پتھر

(1) بازگشت (2) نہال چند (3) کلی کی فریاد (4) تین چور (5) بابو مہنگا سنگھ

(6) آشیانہ (7) کالے کوس (8) لمحے (9) ویہلے 38 (10) تعمیر
(11) ایک معمولی لڑکی (ناولٹ) (12) اعتراف (13) پہلا پتھر۔

6- بلونت سنگھ کے افسانے

(1) جگا (2) کٹھن ڈگریا (3) کرنیل سنگھ (4) خوشبودار موڑ (5) گھر کا راستہ
(6) پنجاب کا البیلا (7) شکریہ (8) گن ٹل پر رم جھم۔

ان افسانوں میں جگا، کٹھن ڈگریا اور پنجاب کا البیلا کو چھوڑ کر باقی سب افسانے نئے ہیں۔

اب ذرا ان کے ہندی افسانوی مجموعوں میں شامل افسانوں پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں۔ ہندی میں ان کے افسانوی مجموعے دس ہیں:

1- پنجاب کی کہانیاں (منتخب افسانے) اونکار شردھر پرکاش، الٰہ آباد، 1954
(1) ڈنڈ (2) جگا (3) چور (4) گرنتھی (5) البیلے (6) کچھ چھن (7) تین باتیں
(8) کالی تیتری (9) پہلا پتھر (10) ویہلے 38

2- چلمن، راج کمل پرکاشن، نئی دہلی 1970
(1) پرتی دھونی (2) شوبینہ (3) مہمان (4) منّی کی موت (5) سوا بھیمان
(6) بابو مانک لال جی (7) اس کی پتنی (8) ویہلے 38 (9) کسک
(10) بہو (11) چلمن

3- پہلا پتھر۔ لوک بھارتی پرکاشن، الٰہ آباد، 1971
(1) پہلا پتھر (2) چکوری (3) میں ضرور روؤں گی (4) پیپرویٹ (5) کچھ چھن
(6) تین باتیں (7) ویشیا (8) تعویز (9) نہال چند (10) اپریچت
(11) بابا مہنگا سنگھ (12) سورما سنگھ۔

4- میری پریہ کہانیاں، راج پال اینڈ سنز، نئی دہلی۔ 1971
(1) اندھیرا اجالا (2) تین باتیں (3) رنگ (4) سوا بھیمان (5) دیمک

(6) گلی کی فریاد (7) تین دیویں (8) بنواس (9) زندگی کا خوبصورت موڑ
(10) تیسرا سگریٹ (11) کالی تیتری

-5 دیوتا کا جنم۔ لوک بھارتی پرکاشن، الہ آباد 1977
(1) دیوتا کا جنم (2) گمراہ (3) گلیاں (4) باندھ (5) گھات (6) دوسرا ہنی مون
(7) زلف کی داستان (8) پھنکاری (9) پورا جوان (10) رکھوالا
(11) چاند اور کمند (12) پیلا پھاٹک (13) تری کون (14) جنازہ (15) شرط۔

-6 پرتی ندھی کہانیاں۔ راج کمل پرکاشن، نئی دہلی 1977
(1) گرہستھی (2) پہلا پتھر (3) کچھ چھن (4) تین باتیں (5) سورما سنگھ
(6) شہناز (7) دیمک (8) کالی تیتری (9) شرط (10) سزا (11) جگا۔

-7 بن باس تتھا انیہ کہانیاں۔ پرتیبھا پرکاشن، الہ آباد، 1978
(1) بن باس (2) ڈاکو باگر سنگھ (3) دو بہنیں (4) قبرستان کی حسینہ
(5) گوری چلی سسرال (6) پٹھان (7) رشتہ (8) ٹکسال والا (9) جھرنا
(10) بدائی (11) راہی (12) کیا کریں دونوں (13) لاٹری زندہ باد
(14) تتلیاں

-8 ایلی ایلی۔ راج کمل پرکاشن، دہلی 1982
(1) ایک بات (2) گھر کا راستہ (3) تین پتر (4) چیتنا (5) ست رنگا کبوتر
(6) کنیادان (7) گن ہل پر رم جھم (8) حسن والے (9) شکریہ (10) تنتر
(11) پیلاں (12) گرہستھی (13) چندر لوک (14) تریتی (15) گرینڈ ہوٹل

-9 میری تینتیس کہانیاں: آتما رام اینڈ سنز، دہلی 6، 1988
(1) شکریہ (2) جگا (3) ایک ہی ناؤ پر (4) وٹڈ (5) دوسری بھول (6) مہمان
(7) رقیب (8) اس کی پتنی (9) شام کے دھندلکے میں (10) پیپرویٹ
(11) شہناز (12) سنہرا دیس (13) نہال چند (14) شرط (15) چندر لوک

(16) چوبیس سال بعد (17) اڑان (18) چیتا (19) گن تن پر رم جھم
(20) چیلاں (21) تیغ (22) اداس (23) دیدار (24) کونل سنگھ کی پریمیکا
(25) دل ناداں (26) بھیگی آنکھیں (27) پریچے (28) لکھن سنگھ کا اپہرن
(29) تین دیویاں (30) پچھمن کور (31) پھنکاری (32) آگے کے دو دانت
(33) اندھیرا اجالا۔

10۔ میں ضرور روؤں گی۔ راجیو پرکاشن، الہ آباد، سال اشاعت درج نہیں ہے۔
(1) شام کے دھندلکے میں (2) دوسری بھول (3) شہباز (4) چکوری
(5) بیپر ویٹ (6) ویشیا (7) رقیب (8) میں ضرور روؤں گی (9) کسک
(10) پرتی دھونی (11) ایک ہی ناؤ پر (12) بابا مہنگا سنگھ (13) لکھن ڈگریا

ہندی میں پہلا افسانوی مجموعہ 1954 میں شائع ہوا وہ بھی صرف پنجاب کی کہانیوں کا انتخاب۔ دوسرا افسانوی مجموعہ سولہ برس بعد 1970 میں شائع ہوا۔ اتنے لمبے خلا کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ جبکہ اردو میں آخری افسانوی مجموعہ پہلا پتھر 1953 میں شائع ہو چکا تھا۔ اس کے بعد ہندی مجموعہ آیا ہے۔ اور بلونت سنگھ ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں تواتر سے لکھ رہے تھے۔ ہندی میں ان کے ناول 1961 سے 1986 تک یعنی ان کے انتقال کے سال تک لگاتار شائع ہوتے رہے ہیں اور اردو میں افسانے بھی 1983 تک پابندی سے شائع ہوئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو میں ناول صرف تین شائع ہوئے اور ہندی میں 24 ۔ اس سے یہ تو اندازہ لگایا ہی جاسکتا ہے کہ انہوں نے اردو کے مقابلے ہندی میں شائع کرنے کو زیادہ ترجیح دی۔ اس کی وجہ شاید اردو میں گھٹتے قاری اور مندا بازار ہو جبکہ ہندی میں قاری اور مالی منفعت دونوں ہی تھا۔

ہندی اور اردو کے تمام افسانوی مجموعے اور ناول ان کی حیات میں شائع ہوئے۔

ہندی افسانوی مجموعوں میں کہانیوں کی تکرار بہت ہے۔ تکرار کے ساتھ کل 132 کہانیاں ہوتی ہیں۔ تکرار کی نفی کر کے کل 100 کہانیاں ہوتی ہے۔ بارہ نئی کہانیاں

ہیں جو ان مجموعوں میں شامل نہیں ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں:

(1) تا حیات (2) آنند کارج (3) ڈاکٹر پاپڑ سنگھ (4) بادام رتنیں (5) تیجھت (6) بھیگی پلکیں (7) چار استاد (8) جیجا جی (9) سمجھوتہ (10) زن گندراں (11) اس رات کی بات (12) ننھا جھنجھکو

ان کو شامل کر کے ہندی میں کل 112 کہانیاں ہوتی ہیں۔

اردو مجموعوں میں شامل کہانیاں 65 ہیں اور نئی دریافت شدہ کہانیاں 67 ہیں۔ اس طرح کل 132 کہانیاں شمار ہوتی ہیں۔ ہندی اور اردو کی کل ملا کر 244=132+112 کہانیاں ہوتی ہیں جو اب تک میری نظروں کے سامنے آ سکی ہیں۔ اردو کی 132 کہانیوں میں سے تقریباً آدھا سے زیادہ ہندی مجموعوں میں جوں کی توں شامل کر لی گئی ہیں۔ یعنی چند کہانیوں کے صرف عنوانات میں تبدیلی ہوئی ہے۔ بقیہ کہانیوں کے عنوان ہندی اور اردو میں ایک ہی ہیں۔

وہ کہانیاں جو دونوں زبانوں میں شائع ہوئیں

	اردو کہانی	ہندی کہانی
1	آبشار	جھرنا
2	آنند کارج	آنند کارج
3	ایک ہی ناؤ میں	ایک ہی ناؤ پر
4	اس کی بیوی	اس کی پتنی
5	البیلا	البیلے
6	اجنبی	آپریچت
7	ارداس	ارداس

30	چیتا	چیتا
31	حسن والے	حسن والے
32	دیمک	دیمک
33	دوسری غلطی	دوسری بھول
34	دوسرا ہنی مون	دوسرا ہنی مون
35	ڈاکو بانگڑ سنگھ	ڈاکو بانگڑ سنگھ
36	دیدار	دیدار
37	رنگ	رنگ
38	رشتہ	رشتہ
39	رخصتی	جدائی
40	رقیب	رقیب
41	زلف کی داستان	زلف کی داستان
42	زن گذراں	زن گذراں
43	سزا	سزا
44	سمجھوتہ	سمجھوتہ
45	سنہرا دیش	سنہرا دیش
46	سورما سنگھ	سورما سنگھ
47	شہناز	شہناز
48	شکریہ	شکریہ
49	شرط	شرط
50	کلی کی فریاد	کلی کی فریاد
51	کالی تیتری	کالی تیتری

52	کوشل سنگھ کی محبوبہ	کوشل سنگھ کی پریمکا
53	کسک	کسک
54	گلیاں	گلیاں
55	گھر کا راستہ	گھر کا راستہ
56	گن مل پر رم جھم	گن مل پر رم جھم
57	گرہستھی	گرہستھی
58	گمراہ	گمراہ
59	گوری چلی سسرال	گوری چلی سسرال
60	منی کی موت	منی کی موت
61	مہمان	مہمان
62	مکھن سنگھ کا اغوا	مکھن سنگھ کا اپہرن
63	نہال چند	نہال چند
64	ویٹلے 38	ویٹلے 38

اسی طرح ہندی کی تقریباً 50 کہانیاں ایسی ہیں جو اردو میں نہیں ہیں۔ اور وہ صرف ہندی میں ہی لکھی گئی ہیں۔

آگے کے دو دانت، ایک بات، اندھیرا اجالا، اڑان، اس رات کی بات، بہو، بنواس، بھیگی پلکیں، بادام رنگیں، پرتی دھولی، پیلاں، پٹھان، پرچھے، ترچی، تنتر، تتلیاں، تا حیات، تیغ، ٹکسال والا، جنازہ، جیجا جی، چندر لوک، چالیس سال بعد، چور، دیوتا کا جنم، دو بہنیں، دل ناداں، دنڈ، ڈاکٹر پاپڑ سنگھ، رکھوالا، راہی، زندگی کا خوبصورت موڑ، سوا بھیمان، ست رنگا کبوتر، شونیہ، شام کے

دھندے میں، قبرستان کی حسینہ، گنیا دان، گچھ چھن، کیا کریں
دفنوں، گھات، گرینڈ ہوٹل، لاٹری زندہ باد، میں ضرور رووں گی،
ننھا چھچھو، ویشیا۔

اس طرح اردو میں بھی 75 کہانیاں ایسی ہیں جو صرف اردو میں لکھی گئی ہیں۔
اور ہندی میں نہیں ہیں۔

آشیانہ، آزاد فاقہ، آبگینہ، ایڈیٹر لوگ، اعتراف، اللہ کا فضل، ایک
بھیگی شام، ایک رات، اس حمام میں، بھیک، بازگشت، بیمار، بھک
منگے، بھول بھلیاں، بیڈمنٹن کی چڑیا، بات ایک رات کی، بادلوں
کی چھاؤں تلے، پھانس، پنجاب کا البیلا، پتھر کے دیوتا، پردیسن،
پامسٹ، پودے، پردیسی چاند، پاسبان، تین چور، تعمیر، تیاگ،
ٹارزن، جزیرے، جنگل میں منگل، جھرجھری، چالان، چار سو برس
پہلے، حوا کی پوتی کا افسانہ، حد فاصل، خوددار، خلا، خوشبودار موڑ،
خدا کی وصیت، دیش بھگت، دودھ بھری گلیاں، ڈاکو، دل بلبل،
دانت ایک بات ایک، دستک، راستہ چلتی عورت، روشنی، سکوت،
سہارا، سکہ زن، سنگ انداز، سپنوں کا راہی، شکار کا شکار، صابن کی
ٹکیا، صبح شام آرزو، عذاب، فلمی انٹرویو، کاکو اور اس کے پریمی،
کسبی، کمپوزیشن ٹیچر، کالے کوس، کٹھن ڈگریا، کاتے، لمس، لمحے، لنگتی
شامیں، مداوا، ماتاہری، موت، نیتا، ناگ پھنی، واپسی۔

لیکن یہ بھی ایک بڑا تحقیقی معاملہ ہے۔ اردو ہندی کی تمام کہانیوں کی چھان
پھٹک کر کے ہی اس سلسلے میں کوئی حتمی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ سرسری جائزے یا ذاتی
تاثر کی بنیاد پر کوئی ٹھوس رائے قائم کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ اس طرف اشارے کا مقصد

صرف اتنا ہے کہ کہانیوں کے بارے میں کوئی الجھن باقی نہ رہے۔ اور اردو، ہندی کے جھگڑے میں پڑ کر بھی محقق اپنا اور اپنے قارئین کا وقت ضائع نہ کرے۔ بلکہ اردو میں دستیاب کہانیوں کو ہی اردو کی میراث سمجھے اور ہندی میں موجود کہانیاں ہی ہندی کی کہلائیں۔ ترجمہ کر کے دونوں کے سرمایے میں نقب زنی کرتے وقت بھی یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ دونوں زبان کی اصل پوچھی گیا ہے۔ اور درآمد شدہ پوچھی گیا ہے۔ ناقد بھی فن کا تجزیہ کرتے وقت کہانی کے بریکٹ میں (اردو) اور (ہندی) ضرور لکھیں تا کہ قاری کا ذہن صاف رہے اور وہ کسی مخمصے میں گرفتار نہ ہو۔

اب رہی بات اشک صاحب کے قول کی بقول اشک صاحب بلونت سنگھ 300 سے زائد کہانیوں کے خالق ہیں۔ ہوسکتا ہے یہ حتمی بات نہ ہو بلکہ صرف اندازہ ہو۔ اگر اس اندازے کو تھوڑی دیر کے لیے سچ مان بھی لیا جائے تو مضائقہ نہیں۔ 244 کہانیاں تحقیقی جانفشانی کی اس جاں کاہ مہم میں میرے سامنے سرنگوں ہو گئیں۔ اور وہ جن کا وجود عام اردو قاری کے لیے پردۂ خفا میں ہے (اگر ایسا ہے) اگر وہ دستیاب ہوگئیں تو یہ تعداد مکمل بھی ہوسکتی ہے۔ ورنہ اشک صاحب کی بات کو صرف اندازہ ہی تصور کرنا پڑے گا۔ میرے خیال میں بچی ہوئی کہانیاں اردو میں اب کم ہی ہوں گی۔ ہندی میں زیادہ ہونے کا گمان اغلب ہے۔ اس لیے کہ اس ذخیرے کی چھان پھٹک ابھی میں نے کی نہیں ہے۔

اب پھر رجوع کرتے ہیں اردو مجموعوں کی طرف۔

"ہندوستان ہمارا" کو چھوڑ کر بلونت سنگھ کے باقی تمام افسانوی مجموعے پاکستان میں شائع ہوئے ہیں۔ "ہندوستان ہمارا" الٰہ آباد سے شائع ہوا ہے۔ تمام مجموعوں کے اشاعت دوم کی نوبت نہیں آئی۔ قاری نے بھی نہ جانے کیوں ایسی بے رخی برتی کہ بلونت سنگھ یا تو بد دل ہوگئے یا انہوں نے اس جانب خود توجہ نہیں دی۔ اور صرف ہندی میں کتابیں چھپوانے میں مشغول رہے۔ کیونکہ تقسیم کے کچھ دنوں بعد اردو کی زبوں حالی کو

دیکھتے ہوئے انہوں نے ہندی میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اردو میں پرانے نام چھپتے تھے۔ اس لیے اردو مجموعوں کی اشاعت کی طرف توجہ نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی میں اردو سے تین گنی کتابیں ہیں۔

چونکہ ان کی کتابوں کے ایک سے زیادہ ایڈیشن شائع نہیں ہوئے اور تمام ایڈیشن جونت سنگھ کی حیات میں ان کی نگرانی میں شائع ہوئے اس لیے پہلے ایڈیشن کے متن میں کسی بھی قسم کے ہیر پھیر کی گنجائش کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا کلیات کی تدوین میں اس کو ہی بنیادی نسخہ مانا گیا ہے جو افسانے ان کے کسی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہیں اور رسائل سے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان کی حیثیت بھی اصل کی ہے۔ بنیادی متن کے طور پر حاصل افسانے کو ہی اصل مان لیا گیا ہے۔ اس لیے کہ اس کا کوئی دوسرا متن اور کہیں دستیاب نہیں ہے۔

کلیات کی تدوین میں تقویم کا خیال رکھا گیا ہے۔ تاریخی ترتیب میں افسانوی مجموعوں کی مکمل ترتیب باقی نہیں رہی۔ بیچ بیچ میں نئے افسانوں کی شمولیت بھی تاریخی ترتیب میں ہوئی۔ پہلی جلد میں 'جگا' اور 'تارو پوڈ' کے افسانوں کے علاوہ ساقی اور ادبی دنیا میں 1945 تک شائع افسانے جو دستیاب ہو سکے ہیں وہ شامل کیے گئے ہیں۔ ایک افسانہ ''رنگ''، ادبی دنیا نومبر 1945 میں شائع ہوا تھا۔ یہ افسانہ مجموعہ سپرا ایڈیشن میں شامل ہے۔ لیکن تاریخی ترتیب میں یہ افسانہ پہلی جلد میں جگہ پا پایا۔ اس جلد میں ایک افسانہ 'خدا کی وصیت' لیا ہے۔ یہ ادبی دنیا جون 1945 میں شائع ہوا تھا۔

سن اشاعت کے لحاظ سے ترتیب اس لیے کہ تحقیقی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے یہی طریق کار زیادہ سائنٹیفک ہے۔ کسی بھی فن کار یا تخلیق کار کے فکری ارتقا کو سمجھنے میں یہ تاریخی سیڑھی بے حد معاون ہوتی ہے۔ لیکن میرے لیے ایک دشواری یہ تھی کہ تمام افسانوں کی سنہ اشاعت یا سن تخلیق مجھے دستیاب نہیں ہو سکی۔ ایسی صورت میں جو تاریخی ترتیب میں نے تیار کی اس میں جن افسانوں کی سنہ اشاعت یا دور معلوم نہیں ہو سکی اس

کے لیے میں نے یہ طریق کار اپنایا ہے کہ جس مجموعہ میں یہ افسانہ شامل ہے اس کی سنہ اشاعت کو ہی اس کی درمیانی تاریخ مان لی۔ اگرچہ اس میں مشکلات پیش آئیں۔ لیکن اور کوئی دوسری صورت سمجھ سے باہر تھی۔ مثلاً 'جگا' 1944 میں شائع ہوا۔ جگا میں شامل افسانے 1938 تا 1944 تک ہیں۔ لیکن 'تار و پوڈ' کی سال اشاعت ہی معلوم نہیں۔ اس میں 1944 تا 1945 سن کے افسانے شامل ہیں۔ لہٰذا اس کی سنہ اشاعت بھی میں نے 1945 متعین کی ہے۔ اس لیے کہ اس میں 1945 کے بعد کے افسانے نہیں ہیں۔ سنہرا دیش میں بھی سنِ اشاعت درج نہیں ہے۔ اس میں بھی 1945 تا 1946 اور اس کے بعد کی کہانیاں شامل ہیں۔ 1947 میں 'ہندوستان ہمارا' شائع ہوا۔ اس میں شامل کہانیاں بھی ظاہری بات ہے کہ 1947 تک کی ہی ہوں گی اور یہ مجموعہ 'سنہرا دیش' یقیناً 'ہندوستان ہمارا' کے بعد آیا ہوگا۔ حالات کا تجزیہ اور موجود شواہد تو یہی کہتے ہیں۔ اس لیے 1945 کے اواخر میں 'تارو پوڈ' کے شائع ہونے کا امکان اغلب ہے۔ ایسی صورت میں 'سنہرا دیش' 1947 کے بعد ہی شائع ہوا ہے۔ چاہے وہ تاریخ 1950 ہو یا 1951 ہو۔ جب تک کوئی اور تحقیقی شواہد نہیں ملتے۔ انہی تاریخوں پر یقین کرنا ہماری تحقیقی مجبوری ہے۔ لہٰذا انہی سنہ اشاعت کے لحاظ سے کلیات کی ترتیب عمل میں آئی ہے اور نئے افسانے اپنی تاریخی ترتیب میں ان کے درمیان ہی جگہ پا سکے ہیں۔

نئے حاصل شدہ افسانے جون 1945 سے لے کر 1980 تک کے ہیں۔ افسانوی مجموعہ 'جگا' (1944) کے بعد ان کا افسانوی مجموعہ سنہرا دیش ہے جو 1950 کے لگ بھگ آیا ہے۔ اس زمانے کے بھی کئی افسانے اور ڈرامے ان مجموعوں میں شامل نہیں ہوسکے۔ بعد میں ایک انتخاب ''بلونت سنگھ کے افسانے'' کے نام سے شائع ہوا۔ جس میں تین پرانے افسانے 'جگا، کٹھن ڈگریا اور پنجاب کا البیلا' کو چھوڑ کر باقی سبھی افسانے نئے ہیں اور امید قوی ہے کہ یہ مجموعہ 1980 کے دہے میں آیا ہے۔ اس لیے کہ اس میں شامل افسانہ اگست 1969 سے مارچ 1979 تک کا ہے۔ بلونت سنگھ کا انتقال

1986 میں ہوا۔ لہٰذا یہ مجموعہ ان کی زندگی میں ہی شائع ہوا ہے۔ لیکن افسوس کہ اسے بھی کسی ہندوستانی پبلشر نے نہیں شائع کیا بلکہ اسے بھی مکتبہ اردو ادب لاہور جو بلونت سنگھ کی کتابوں کے پبلشر رہے ہیں انہوں نے شائع کیا ہے۔ بلونت سنگھ کا پہلا افسانوی مجموعہ ''جگا'' کو چھوڑ کر کسی بھی مجموعے میں کوئی دیباچہ، پیش لفظ، مقدمہ، حرف آغاز نہیں ہے جس سے کہ اس کے عالم وجود میں آنے کا پتہ چل سکے۔ مجموعوں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ناشر نے اپنی صوابدید سے جو کچھ اسے میسر آیا لے کر شائع کر دیا ہے۔ ممکن ہے بلونت سنگھ سے اجازت بھی لی ہو۔

بلونت سنگھ پر اب تک میری حاصل کردہ معلومات کے مطابق ہندوستان میں تین تحقیقی مقالے بھی لکھے گئے ہیں۔ ایک دلّی یونی ورسٹی میں اور دوسرا جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اور تیسرا کلکتہ یونی ورسٹی میں۔ ممتاز آراء اور شاہدہ مفتی دونوں خاتون کو پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی تفویض ہوگئی۔ ممتاز آرا کا مقالہ 'بلونت سنگھ — فن اور شخصیت' کتابی صورت میں شائع بھی ہوگیا اور شاہدہ مفتی کے مقالے کا بیشتر حصہ سہ ماہی جامعہ کے بلونت سنگھ نمبر اور کتاب نما کے گوشۂ بلونت سنگھ میں شائع ہو چکا ہے۔ کتاب ابھی شائع نہیں ہوئی ہے۔ ان دونوں طالبات کی بھی مناسب رہنمائی نہیں کی گئی جس سے بلونت سنگھ کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاسکا اور نہ ہی تحقیق کے تقاضے پورے ہوئے۔ آدھی ادھوری معلومات کی بنیاد پر مقالے تیار کرائے گئے اور ڈگری تفویض کر دی گئی۔ کسی نے بھی نئے افسانوں کی تلاش کا جوکھم نہیں اٹھایا۔ حتیٰ کہ کتابوں کی سنہ اشاعت کے متعلق بھی مستند معلومات حاصل نہیں کی۔ شاہدہ مفتی نے بھی جامعہ کے خاص نمبر اکتوبر تا دسمبر 2001 میں کتابوں کی فہرست تو دی ہے لیکن وہ بھی مکمل نہیں ہے۔ دوسرے کسی بھی کتاب کی تاریخ اشاعت اور پبلیشر کا نام درج نہیں کیا ہے۔ نہ ہی یہ واضح کیا ہے کہ کون سا افسانوی مجموعہ ہے اور کون سا ناول، ہندی فہرست میں یہ خلط ملط خاص طور پر ہے۔ یعنی یہ فہرست بھی تحقیقی تقاضوں سے عاری ہے۔ شاہدہ مفتی نے بلونت سنگھ کے

گیارہ نمائندہ افسانوں کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے جس میں 'چاند اور کمند' اور 'بوڑھا جوان' نئی کہانی ہیں۔

اس سلسلے کی پہلی سنجیدہ کوشش بلونت کے بارے میں ہمیں پروفیسر گوپی چند نارنگ کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔ نارنگ چونکہ تحقیق کے مرد میداں ہیں اور اس سلسلے میں ان کی رائے کو وقار و اعتبار حاصل ہے۔ وہ جب بھی کسی کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں تو تحقیقی تقاضوں سے مکمل طور پر عہدہ برآ ہونے کی سعی کرتے ہیں اور اس میں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

'بلونت سنگھ کے بہترین افسانے' کے نام سے اکیس افسانوں کا ایک بہت ہی جامع انتخاب انہوں نے کیا جس کا پہلا اڈیشن 1995 میں ساہتیہ اکیڈمی سے شائع ہوا۔ یہ کتاب اردو، ہندی اور انگریزی تین زبانوں میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں انہوں نے ستر صفحے کا بسیط عالمانہ مقدمہ لکھا اور بلونت سنگھ کو نئے سرے سے ڈسکور کیا۔ ان کی کہانیوں پر بالتفصیل گفتگو کی۔ ان کی دریافت نے بلونت سنگھ کی تفہیم کے نئے دروازے کھول دیئے۔ یہ کتاب ایک ایسے وقت میں آئی جب اردو والے بلونت سنگھ کو بھول چکے تھے۔ نارنگ کی سعی خاص طور سے توجہ دلانے پر آجکل، کتاب نما اور سوغات نے بلونت سنگھ پر خاص نمبر اور گوشے نکالے۔ جیسا کہ انہوں نے تحریر کیا ہے۔

نارنگ نے تمام مجموعوں سے بہترین کہانیاں منتخب کیں۔ اس عمل میں تین نئی کہانی بھی دریافت کی۔ 'راستہ چلتی عورت'، 'کالی تیتری' اور 'گمراہ'— گویا اٹھارہ کہانی مجموعوں سے اور تین رسائل سے لیں۔ یہ بھی ایک بڑا کارنامہ ہے اور تحقیقی میدان سر کرنے کی مہم کا ایک حصہ ہے۔ لہٰذا قابل ستائش ہے۔

نارنگ نے بلونت سنگھ کی کتابوں کی فہرست بھی دی ہے۔ ناشر اور سنہ اشاعت کے ساتھ جو تحقیق کا طریقہ کار ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان سے اس میں کہیں کہیں تسامح ہوا۔ جیسے ایک ''معمولی لڑکی'' اور ''عورت اور آبشار'' ناولٹ ہے لیکن فہرست میں

ناول لکھا گیا ہے۔ اس طرح 'چک پیرا کا جٹ' ناول ہے اسے افسانوی مجموعہ لکھا گیا ہے۔ تیسرے 'تارو پوڈ' کی سنہ اشاعت 1944 درج کی گئی ہے جو درست نہیں ہے۔ جیسا کہ میں پچھلے صفحے پر تفصیل سے لکھ چکا ہوں کہ اس میں شامل تمام افسانے 44 اور 45 کے ہیں۔ لہٰذا یہ مجموعہ 1945 کے بعد ہی شائع ہوا ہے۔

ناول ''رات چور اور چاند'' 1961 میں ادارہ فروغ اردو لاہور، نقوش پریس سے شائع ہوا۔ اس سے قبل یہ ناول نقوش میں قسط وار مارچ 1956 سے اکتوبر 1961 تک متواتر شائع ہوتا رہا ہے۔ لیکن اس ناول کا سن اشاعت نارنگ نے 1948 درج کیا ہے۔

ہندی کتابوں کی فہرست بھی مقام اشاعت، سنہ اشاعت اور پبلیشرز کے ساتھ دی گئی ہے۔ لیکن اس میں ناول اور افسانوی مجموعے کی نشان دہی نہیں کی گئی ہے۔ اگر یہ بھی کردیا جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔ ہندی کتابوں کی کل تعداد فہرست کے مطابق 1929 ہے۔ بلونت سنگھ پر کیے گئے اب تک کے کاموں میں نارنگ کا کام سب سے زیادہ اعتبار کے لائق ہے۔

نارنگ نے 'بلونت سنگھ کا فن۔ سائیکی، ثقافت اور شکست رومان' کے عنوان سے جو طویل مقدمہ لکھا ہے اس کا اختتام یوں کیا ہے:

> ''ایسی پر لطف کہانیوں کا فن کار اردو افسانے کی تاریخ سے غائب نہیں ہوسکتا .... اگر چہ منٹو، بیدی، کرشن چندر اور قاسمی کے فوراً بعد کے معاصرین میں ہونے کی وجہ سے ان پر نگاہیں اس قدر نہیں ٹھہریں، اور پھر قبل از وقت موت سے وہ نگاہوں سے جلد اوجھل بھی ہوگئے۔ تاہم سکھ سائیکی اور ثقافتی معنویت کی بازآفرینی کے اعتبار سے، ٹیز ھا جگا، گرنتھی، سورما سنگھ، ویٹلے 38، پہلا پتھر، دیش بھگت، کالی تیتری یا کٹھن ڈگریا کے خالق کی حیثیت سے اردو

افسانے کی دنیا میں بلونت سنگھ کی جگہ محفوظ ہے۔ ان کی خاص
خاص کہانیوں کی قبولیت اور معنویت وقت کے ساتھ ساتھ
بڑھے گی کم نہیں ہوگی۔ ایسا افسانہ نگار وقتی طور پر نظر انداز تو ہوسکتا
ہے، وقت اسے ہمیشہ نظر انداز نہیں کرسکتا۔"

نارنگ کا یہ خیال بالکل درست ہے۔ میرے اس حقیر کام کو بلونت سنگھ کی از سر نو دریافت کی ایک کوشش ہی سمجھنا چاہیے۔ وقت بلونت سنگھ کو زیادہ دنوں تک نظر انداز نہیں کرسکا۔ نارنگ کا یہ اندازہ صحیح ثابت ہوا۔

چھ افسانوی مجموعوں کے افسانوں کے علاوہ اس کلیات میں نئے تلاش کیے گئے افسانے 67 سے زیادہ ہیں، جو حسب ذیل ہیں:

نئے افسانے : آبشار، آگینہ، آنند کارج، ایک ہی ناؤ میں، اللہ کا فضل، ایک بھیگی شام، ارداس، ایک رات، باندہ، بادلوں کی چھاؤں تلے، بھیگی آنکھیں، بات ایک رات کی، بھول بھلیاں، پھانس، پورا جوان، پامسٹ، پودے، پھلکاری، پھمن کور، پردیسی چاند، پہلا پھاٹک، پاسبان، تیسرا سگریٹ، تین خط، تین دیویاں، تعویز، تیاگ، تکون، جزیرے، چاند اور کمند، چلمن، چالان، چار سو برس پہلے، چار استاد، چیتنا، حد فاصل، حسن والے 1998 میں، خدا کی وصیت، دودھ بھری گلیاں، دیدار، دوسرا ہنی مون، دل بلبل، دستک، دانت ایک بات ایک، ڈاکو ہاگر سنگھ، راستہ چلتی عورت، زلف کی داستان، رخصتی، زن گذراں، سکہ زن، سپنوں کا راہی، شکار کا شکار، صابن کی ٹکیہ، صبح و شام آرزو، فلمی انٹرویو، کاکو اور اس کے پریمی، کالی تیتری، کومل سنگھ کی محبوبہ، گلیاں، گوری چلی سسرال، لگتی شامیں، مکھن سنگھ کا اغوا، ناگ پھنی، حوالشافی۔

اب وہ افسانے جن کا نام تو معلوم ہے لیکن اِجن تک رسائی نہیں ہوسکی ہے وہ یہ ہیں:

انبیلا، اس حمام میں، ہیڈ منشن کی چڑیا، دوسری غلطی، سنگ انداز، کاتے، واپسی، یہ لمحے، پودے۔

نئی کھوج میں ڈرامے اور مضامین بھی شامل ہیں۔

ڈرامے : پامال محبت، پھانس اور سکہ زن ہیں اور **ناولٹ**: عہدِ نو میں ملازمت کے تیس مہینے، **مضامین**: چار سو برس پہلے، فلمی انٹرویو، حضرت چھچھوندر چھچھوندری، ایڈیٹر لوگ اور کرشن چندر اور فراق گورکھپوری سے لیے گئے انٹرویو بھی شامل ہیں۔ اتنی ساری نئی سوغات اس کلیات میں شامل ہیں۔

عنوان کی سطح پر ایک تکرار اور ایک تبدیلی ہے۔ مثلاً 'کالے کوس' یہ ان کے ایک ناول کا نام ہے جو اردو اور ہندی دونوں میں شائع ہو چکا ہے۔ اس عنوان سے ایک افسانہ بھی اس کلیات میں شامل ہے۔ اسی طرح 'رشتہ' کے نام سے ایک افسانہ 'سوغات' کے شمارہ آٹھ گوشۂ بلونت سنگھ نمبر میں شائع ہوا ہے۔ یہ دراصل 'کرنیل سنگھ' نام کی کہانی کا بدلا ہوا عنوان ہے۔ یہ کہانی ہندی میں 'رشتہ' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ اور ہندی مجموعے میں اسی نام سے شامل ہے۔ اردو میں کرنیل سنگھ کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ ''آبشار'' ان کے ایک افسانے کا نام ہے جو آج کل میں مارچ 1955 میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں ''عورت اور آبشار'' کے نام سے ان کا ایک ناولٹ بھی شائع ہوا۔ کچھ لوگ اس کو ایک ہی مانتے ہیں۔ ایسا سمجھنا درست نہیں ہے۔ دراصل یہ دونوں تحریریں الگ الگ ہیں۔ آبشار افسانے کو ہی پھیلا کر ناولٹ کا روپ دیا گیا ہے۔ لیکن افسانہ اپنی جگہ مکمل ہے۔ دونوں کے متن میں بھی کافی فرق ہے۔ وہی فرق جو افسانے اور ناولٹ میں ہوتا ہے۔ یہ کہنا کہ افسانہ آبشار ہی بعد میں ''عورت اور آبشار'' کے نام سے کتابی شکل میں آیا مناسب نہیں ہے۔ عنوان میں اضافہ کے ساتھ ساتھ متن میں بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ گرچہ کہانی کا محور عورت اور آبشار ہی دونوں میں ہے۔

کلیات کے افسانوں کی تقویمی ترتیب رسائل میں شائع شدہ افسانوں کی

سنہ اشاعت کے مطابق رکھا گیا ہے اور جن افسانوں کی سال اشاعت رسائل سے دستیاب نہیں ہوسکی ہے۔ اس کی اشاعت مجموعہ کی زمانہ اشاعت کے مطابق اسی درمیان میں رکھی گئی ہے۔ ایک افسانہ اگر کئی رسالوں میں شائع ہوا ہے تو پہلی اشاعت کو صحیح و درست مانا گیا ہے۔

یہ کلیات کی جلد سوم ہے۔ اس میں کل تیئس افسانے شامل ہیں، جس میں مجموعہ "پہلا پتھر" کے تیرہ افسانوں کے علاوہ گیارہ نئے افسانے "حد فاصل"، "هو الشافی"، "رات چلتی عورت"، "گمراہ"، "کالی تیتری"، "آبشار"، "ایک ہی ناؤ میں"، "جزیرے"، "چاندنی"، "صابن کی ٹکیہ"، "ایک بھیگی شام" شامل ہیں۔

اب میں آخر میں ان افراد کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جنھوں نے اس تحقیقی کام میں میری معاونت کی۔ پروفیسر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر نجیب اختر، ڈاکٹر منجو سنگھ، ڈاکٹر عطا خورشید علی گڑھ، یوں تو ان کے تعاون کے لیے شکریے کے الفاظ ناکافی ہیں۔ میں تہ دل سے ان سب کا مشکور ہوں۔

جمیل اختر

فروری 2009

18 جی، سی پی ڈبلیو ڈی کالونی
وسنت وہار، نئی دہلی-57
موبائل: 9818318512

نہال چند

اگرچہ میں نے پرانی کتابوں کی دکان اس لیے بند کردی تھی کہ اس کی آمدنی بہت کم تھی اور لوگ پرانی کتابوں کی دکان کو زیادہ وقعت دینے کو تیار نہ تھے۔ لیکن اصل بات ایک ہی تھی۔ جس کے باعث میں کوئی کام دل جمعی کے ساتھ نہیں کرتا تھا اور وہ تھی میرے ذہن کی آوارگی۔ میں نے کئی قسم کے پیشے اختیار کیے، لیکن کچھ عرصے کے بعد ترک کردیے۔ کاشمیر کی کشش سری نگر لے گئی۔ وہاں بڑے طمطراق سے پرانی اور نایاب کتابوں کا کاروبار شروع کیا۔ کاشمیر کی جی بھر کر سیر کی۔ لیکن ایک نو عمر انسان کو جس شے کی ہوس ہوتی ہے، وہ وہاں اس قدر ارزاں نہ تھی۔ اس لیے من جلد ہی اچاٹ ہوگیا اور کاروبار بند کر کے واپس لاہور جانے کی ٹھانی۔

گلمرگ میں برف گرنی شروع ہوگئی تھی۔ اس خوف سے کہ کہیں برف اور زیادہ نہ پڑنے لگے اور راستہ بند ہوجانے کے سبب لاہور پہنچنے ہی سے رہ جاؤں، میں نے دُکان کا سامان اونے پونے بیچا اور ایک سہانی صبح کو لاری میں سوار ہو کر شام کو راولپنڈی پہنچا اور وہاں ایک رات کاٹ کر دوسری شام کو لاہور جا اترا۔

والد صاحب فوت ہوچکے تھے۔ اب بڑے بھائی ہی خاندان کے کفیل تھے۔ شام کو میں گھر پہنچا تو انہیں موجود نہ پایا۔ ماتاجی مجھے دیکھ کر بے حد خوش ہوئیں۔ انہوں نے

میری بلائیں لیں اور پراٹھے پکوا کر کھلائے۔ بھابھی، ناک بھوں چڑھائے، منہ سے تو کچھ نہ کہتی تھیں، البتہ فرش پر زور زور سے پاؤں مارتی ہوئی گھومتی رہیں۔

رات کو بھائی صاحب آئے اور انہوں نے اپنی خفگی چھپانے کی ذرہ برابر کوشش نہیں کی۔۔۔۔۔۔ ''کیا ابھی تک تو اپنے آپ کو دودھ پیتا بچہ سمجھتا ہے؟ اب تیری عمر بائیس برس کی ہوچکی۔ تو کسی کام کے نزدیک تک نہیں پھٹکتا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر تو ہے کس خیال میں۔ تو سمجھتا ہے کہ میں ساری عمر تجھے گھر بٹھائے کھلائے جاؤں گا۔'' اور اس کے بعد انہوں نے وہ پرانی کہاوت دہرا دی کہ کام پیارا ہوتا ہے چام پیارا نہیں ہوتا۔۔۔۔۔۔'' میں بال بچے دار آدمی ہوں اور تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ بچے جوں جوں بڑے ہوتے ہیں ان کے اخراجات بڑھتے جاتے ہیں لیکن تیرے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ اگر تو میری یا ماتا جی اور بہنوں کی کچھ بھی مدد نہیں کرسکتا تو کم از کم اپنا پیٹ تو پال۔ اب تک تو نے کچھ کم مزے لوٹے ہیں۔ ذرا پوچھ تو ماتا جی سے، میں نے کس عمر میں کام شروع کردیا تھا۔۔۔۔۔۔'' اور اس طرح بھائی صاحب بہت دیر تک بکتے جھکتے رہے۔ یہاں تک کہ مجھ پر غنودگی سی طاری ہوگئی۔ ماتا جی ٹانگوں میں دہکتی ہوئی انگیٹھی لیے بیٹھی تھیں۔'' اچھا اب رہنے دے بیٹا۔ بیچارہ تھکا ماندہ آج ہی تو آیا ہے۔۔۔۔۔۔''

اس پر بھائی صاحب اور بھڑک اٹھے۔'' تو ماتا جی! کون سے پہاڑ پھاند کر چلا آرہا ہے۔ ایک تو آپ کے اس بے جا لاڈ نے اسے بگاڑ دیا ہے۔''

بھائی صاحب کی کڑک سن کر، گھر کی بلی جو مزے میں میاؤں میاؤں کر رہی تھی، بدک کر بھاگ گئی۔ ماتا جی نے دبی زبان سے کہا۔'' بچہ ہی تو ہے نا! آپ سمجھ جائے گا۔۔۔۔۔۔''

اس بات پر بھائی صاحب کا پارہ اور بھی چڑھ گیا۔ لیکن میری آنکھیں بند ہوئی جارہی تھیں اور ان کی باتوں کی آوازیں لحہ بہ لحہ مدھم ہونے لگیں۔ جیسے وہ کہیں دور چلے گئے ہو۔

دوسرے روز جو میری آنکھ کھلی تو اچھا خاصا دن چڑھ آیا تھا۔ مجھے خوب گہری اور میٹھی نیند آئی تھی۔ طبیعت ہشاش بشاش تھی۔ رفتہ رفتہ رات کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اس

لیے کہ میں نے ان باتوں سے زیادہ متاثر ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن اب جو ان باتوں کا خیال آیا تو دفعتاً میری رگِ حمیت پھڑک اٹھی۔ یہ نہیں کہ بھائی صاحب کو کھری کھری سناؤں بلکہ یہ کہ آج کوئی نہ کوئی کام ڈھونڈ ہی لوں اور کچھ نہیں تو کم از کم کوئی نوکری ووکری ہی کر لوں۔

بھائی صاحب، بھابی، بچے، نہیں، گھر کے سبھی لوگ باورچی خانے میں بیٹھے تھے۔ جب میں جاگا تو ماتا جی بستر ہی میں مجھے چائے اور مٹھیاں دے گئیں اور ہدایت کر گئیں کہ جب تک بھائی صاحب دفتر نہ چلے جائیں۔ میں باورچی خانے میں نہ جاؤں۔

میں کپڑے پہن کر بھائی صاحب سے بھی پہلے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اب پھر اپنا لاہور تھا اور میں۔ وہی جانے پہچانے مقامات، بارونق سڑکیں، تانگوں، موٹروں، سائیکلوں کی ریل پیل۔ وہی دلہن کی طرح سجی ہوئی دکانیں۔ قطار در قطار مال روڈ کے کنارے کنارے......

راستے میں کوئی نہ کوئی آشنا مل ہی جاتا تھا اور دو چار منٹ سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر ہلکی پھلکی گفتگو ہو جاتی اور پھر میں آگے بڑھ جاتا۔ اسی طرح گھومتے پھرتے میں رابن روڈ کی طرف جا نکلا۔ اس جگہ اب کچھ نئی دکانیں بھی بن گئی تھیں۔ میں تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد آیا تھا۔ اس لیے مجھے تو اس جگہ کا نقشہ ہی نیا نظر آنے لگا۔ یہاں میرے ایک پرانے واقف نہال چند کی فوٹو گرافی کی دکان تھی۔ نہال چند کی عمر پچپن برس سے تجاوز کر چکی تھی۔ بال تقریباً سب کے سب سفید ہو چکے تھے۔ رنگ سرخ و سپید تھا۔ لمبی لمبی مونچھیں، تیز چمکتی ہوئی آنکھیں، اکہرا بدن، اور چھوٹا قد—— یہ تھے لالہ نہال چند۔ ان کے مزاج پر عمر اور زندگی کے جھمیلوں کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ جب بھی ان سے ملنے کا اتفاق ہوا انہیں ہمیشہ ہی خوش و خرم اور ہنسی مذاق کا دلدادہ پایا۔ اس شخص سے میرے بہت گہرے تعلقات تو کبھی نہیں رہے تھے۔ البتہ ہم ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ضرور تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اگر وہ

مجھے دیکھ پائے تو ضرور خوش ہوگا۔ بڑے مزے کا آدمی تھی، سوچا، اسے ملتا چلوں۔

جب میں اس کی دکان کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ حضرت حسب عادت اپنی دکان کے چبوترے ہی پر پاؤں کے بل اکڑوں بیٹھے گنا چوس رہے ہیں۔ میں قریب پہنچا تو امید کے مطابق اس نے فوراً مجھے پہچان لیا۔ بڑے تپاک سے ملا اور علیک سلیک کے بعد اپنے قریب ہی چبوترے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور جڑ کی طرف سے گنے کا بالشت بھر ٹکڑا مجھے دکھا کر خاص انداز میں ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لو چوس لو۔'' اس کی آنکھوں میں شرارت کی چمک تھی۔ وہ — عمر و رتبہ کا لحاظ کیے بغیر ہی ہر کسی سے بے تکلف ہوجاتا اور پھر مذاق کرنے سے بھی نہ چوکتا۔

میں اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ ڈیڑھ برس کے عرصے میں اس کی صورت میں کوئی نمایاں فرق نہ آیا تھا۔ وہی متحرک بھنویں، چمکتی ہوئی آنکھیں، پھڑکتے ہوئے ہونٹ، بے چین طبیعت، وہی ہنسی، وہی ٹھٹھول۔ میں نے اسے اپنی آوارگی کے چند چٹ پٹے واقعات سنائے اور اس نے ان میں کچھ ایسی دلچسپی لی۔ جیسی میرا کوئی ہم عمر دوست ہی لے سکتا تھا۔ بات بات پر لا استاد ہاتھ۔

آدھ پون گھنٹہ ادھر اُدھر کی باتوں میں گزر گیا۔ پھر اس نے پوچھا کہو برخوردار! اب یہ سرگشت کیسی؟

میں نے جواب دیا۔ ''بس یوں ہی گھومتے پھرتے ادھر آ نکلا۔ آپ کو بھولا نہیں تھا میں نے سوچا درشن ہی کرلوں۔''

وہ ہنسا۔ ''تو اب آئندہ کیا کام کرنے کا ارادہ ہے۔''

میں کچھ سوچ میں پڑ گیا اور پھر ایک بات جو سوجھی تو کہا۔ '' کام وام کیا اب تو نوکری کریں گے۔''

''نوکری کیسی؟''

''کوئی بھی ہو۔''

"مثلاً"

"......مثلاً......" آپ ہی کے ہاں۔ آپ کو تو معلوم ہی ہوگا کہ میں توڑ گرانی کا کام بھی بہت اچھا جانتا ہوں۔ یاد ہے نا وہ میرے ہاتھ کے بنے نکو۔"

اس کی بھنویں سکڑ گئیں۔ "او ہاں ہاں...... بھئی بات یہ ہے کہ مجھے تو ملازم کی ضرورت ہی نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی زبان منہ میں گھما پھرا کر اسے مسوڑھوں پر پھیرنے لگا۔ میں جانتا تھا۔ بوڑھا بھی ایک ہی گھاگ ہے۔ شیشے میں پری اتارنا چاہتا ہے— میں خاموش رہا۔

پھر اس نے خود بخود یہ سکوت توڑتے ہوئے کہا۔ "خیر بھئی! اب تم ہو بھی بیکار...... اور بھئی سچ بات تو یہ ہے کہ مجھے بھی تم سے کچھ انس سا ہو گیا ہے۔ کہو مانتے ہو کہ نہیں...... اچھا یہ تو بتاؤ لوگے کیا۔؟"

میں نے قدرے توقف کیا۔ "بندہ پرور! چالیس پر مان جاؤں گا۔"

وہ ہنس دیا۔ "دیکھو برخوردار یہ چالیس والیس کی بات تو ہے جھوٹ...... کیا سمجھے...... کہو بیس پر کام کرو گے......"

میں نے یہ بات نامنظور کر دی۔

"تو بھئی پچیس پر مان جاؤ۔ بتاؤ اب تمہیں پچیس ہی دے ڈالوں گا۔ جو ہو سو ہو۔ آخر تم کون پرائے ہو؟"

"ارے صاحب توبہ کیجئے۔ میں چالیس سے ایک پائی کم نہ لوں گا۔"

اب اس نے اپنے کندھوں کو حرکت دے کر کہا۔ "تو بھئی تمہاری مرضی۔"

اس کے بعد کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ جب میں اٹھ کر چلنے لگا تو اس نے میری تنخواہ تیس تک پہنچا دی۔ لیکن میں نہ مانا۔

جب میں وہاں سے لوٹا تو راستے میں اسی بات پر غور کرتا رہا کہ اگر وہ چالیس

تک منظور کر لے تو پھر کچھ نہ کچھ اوپر کی آمدنی بھی ہو سکتی ہے۔ میرا کام چل نکلا۔ ہر مہینے کچھ روپے بھائی صاحب کی ہتھیلی پر بھی دھر دیتا تو وہ خوش بھی ہو جاتے اور کبھی آڑے وقت پر کام بھی آتے۔ اتنا تو میں جانتا تھا کہ بھائی صاحب بھابی کی لگائی بجھائی کے باوجود مجھ سے محبت کرتے اور میری بہتری چاہتے ہیں۔

سوچتے سوچتے مجھے ایک بڑے مزے کی چال سوجھی۔ اس وقت میرے پاس روپیہ بھی بہت کم تھا۔ لیکن میں اپنی حقیر پونجی داؤں پر لگانے کو تیار ہو گیا۔ چناں چہ میں اسی وقت مال روڈ کی طرف چل دیا۔ وہاں پہنچ کر میں بھگا مل اینڈ سنز کی مشہور فرم کے آگے رک گیا۔

بھگا مل کا کرڑکا مکھن رائے میرا لنگوٹیا یار تھا۔ ان لالوں کے نام بھی عجیب تھے۔ باپ بھگا مل اور بیٹا مکھن رائے۔

دو تین میمیں دکان سے باہر نکل رہی تھیں۔ میں ان کی چکنی پنڈلیوں کو دیکھتا ہوا اُن کے لیے راستہ چھوڑ کر الگ کھڑا ہو گیا اور جب وہ چلی گئیں تو میں اندر داخل ہوا۔ وہی پرانی فضا تھی۔ جہاں ہم کاؤنٹر کے پیچھے چھپ کر تاش کھیلا کرتے تھے۔ میری آنکھیں مکھن رائے کو ڈھونڈ رہی تھیں اور مکھن رائے بڑی میز کے آگے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو مارے خوشی کے ہانپنے لگا۔ مکھن رائے بس مکھن کا پیڑا ہی تو تھا۔ مزے میں کرسی پر ڈھیر ہو رہا تھا۔ اجلے پلپلے گوشت کا انبار۔

" ارے یار کہاں۔ اتنی مدت......" اس نے اپنی باریک آواز میں چیخ کر پوچھا۔ "آنکھیں ترس گئیں تم کو کلے کا کارڈ بھی تو نہیں بھیجا۔"

وہ کس قدر خوش خوش نظر آ رہا تھا، لیکن اس روز مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ اس بات کا احساس ہوا کہ حد سے زیادہ موٹے آدمی کو اپنے دلی جذبات کا اظہار کرنے میں کس قدر دقت پیش آ سکتی ہے۔

مجھے کرسی پر بٹھایا گیا۔ بڑے اصرار سے آئس کریم سوڈا پلایا گیا اور پھر پان کا

بیڑا کھلانے کے بعد ہاتھ میں ایک عدد اعلیٰ قسم کا سگریٹ تھما دیا گیا۔

میں نے ایک لمبا کش لگایا اور دھواں چھوڑ کر جو الف لیلیٰ کی داستان شروع کی...... تو دو ڈھائی گھنٹے آنکھ جھپکتے میں گزر گئے۔ آخر میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ رابن روڈ پر ان کی اپنی کئی دکانیں موجود تھیں۔ میں نے کل احوال سنا کر کہا کہ مجھے عارضی طور پر ایک دکان دلوادو۔

اس نے جواب دیا کہ یہ کام فوراً ہو جائے گا—

دکان مل گئی۔

میری دکان سڑک کے دوسری جانب تھی۔ لیکن نہال چند کی دکان سے اس دکان کا فاصلہ پچاس ساٹھ قدم تھا۔ میں اپنی دکان سے نہال چند کو دکان میں گھستے یا باہر نکلتے بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دکھائی نہ دینے کے باوجود اس کی حرکات سے میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔

میں نے کپڑے کے ایک بہت بڑے ٹکڑے پر جلی حروف میں یہ عبارت لکھوائی۔ ''یہاں ڈیولپنگ مفت کی جاتی ہے''— اور اسے اپنی دکان کے آگے لگا دیا۔ گھر سے چند گری پڑی پرانی فلمیں بھی اٹھا لایا اور انہیں یوں ہی اِدھر اُدھر لٹکا دیا۔ اپنے یار دوست بھی کئی ایک تھے۔ انہیں بھی سازش میں شامل کر لیا اور نتیجہ یہ کہ میری دکان میں گاہکوں کا تانتا سا بندھا رہتا۔ تین چار روز ہی یہ تماشا ہوا ہوگا کہ ایک دن دوپہر کے وقت لالہ نہال چند پشت کی طرف ہاتھ باندھے خراماں خراماں میری دکان پر آ پہنچے۔ میں نے بڑے تپاک سے ان کا استقبال کیا۔ کرسی پر بٹھایا۔ پان منگوایا...... صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کافی مرعوب ہو چکے ہیں۔

''کہو بھائی یہ کیا تماشا ہے۔''

میں نے انکسار سے سر جھکا کر کہا۔ ''بس صاحب! سوچا کچھ کرنا تو ہے...... چلو دکان ہی کھول ڈالو اپنی......'' وہ چپ چاپ منہ ہلاتا رہا اور یوں ہی ہوا میں گھور گھور کر

دیکھنے لگا۔

پھر اس نے پیک تھوک کر منہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "اور بھئی وہ نوکری کرنے کا جو ارادہ تھا تمہارا......"

"ابی تین حرف بھیجو نوکری ووکری پر۔ میں باز آیا......"

اب نہال چند نے جبڑے ہلا ہلا کر مسوڑھوں پر چپکے ہوئے لبدے کو ہٹایا لیکن صورت سے ظاہر تھا کہ گہری سوچ میں ہے اور پھر کچھ کھانس کے حلق صاف کرتے ہوئے بولا۔ "دیکھو برخوردار! نئے سرے سے کام چلانا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔ کیا سمجھے! اور بھئی یہ تو کہو کہ میری دکان کو تم نے پرائی سمجھا۔ کیا تمہاری کھوپڑی میں ایک کوڑی بھر گودا بھی نہیں۔ اگر تنخواہ ہی کی بات تھی تو مجھ سے کہا ہوتا...... اچھا جو ہوا سو ہوا...... چلو تم جیتے میں ہارا! اب تمہاری بات ہی رہے......"

میں نے جی ہی جی میں خوش ہو کر بظاہر متین صورت بنا کر کہا۔ "دیکھئے حضور! اب وہ دن ہوا ہوئے...... کیا سمجھے آپ!...... میں اور چالیس پر مان جاؤں، ابی توبہ بندہ تو اب نوکری کرنے پر تیار ہی نہیں ہے!"

نہال چند نے بھنویں سکیڑ کر میری طرف دیکھا۔ "اچھا...... بننے لگے اب۔"

"نہیں یہ حقیقت ہے...... اپنے کام کی بات ہی کچھ اور ہے...... میں گورنمنٹ کالج میں گیا تھا۔ وہاں سب لوگ میرے واقف کار ہیں۔ پروفیسر پریم چند چوپڑا کہتے تھے کہ آئندہ سارا کام تمہیں کو دیا کریں گے۔ دیال سنگھ کالج میں بھی تیر نشانے پر بیٹھا ہے۔ اور ہاں! ایس۔ ڈی کالج بھی گیا تھا......" اس بات پر وہ چونکا۔ مجھے یاد تھا کہ جب میں پہلے دن اسے ملنے کے لیے اس کے ہاں گیا تھا تو ایس ڈی کالج کے چند طلبا اس کے ہاں آئے ہوئے تھے اور اس کی سہل انگاری کی شکایت کر رہے تھے۔ چناں چہ میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا...... "تو لڑکوں کے سکرٹری نے کہا۔ نہال چند بہت سست آدمی ہے۔ اس کا کام تسلی بخش نہیں ہے...... اس لیے آئندہ ہم سارا کام تم کو

دیا کریں گے...... اور تو اور کل مجھ سے مکتی فوج والی میم صاحب نے کہا کہ نہال چند کھراب کام کرتا...... آگے سے ہم تم کو دینا مانگتا......"

نہال چند نے اب ہتھیار ڈال دیے اور مرعوب ہو کر بولا۔" برخوردار جانتا ہوں تم نے مجھے پریشان کرنے کے لیے یہ دکان کھولی ہے۔ یہ ہے بھی درست تم خود تو کام کیا کرو گے۔ البتہ میری چلتی میں روڑا اٹکا ہی دو گے...... اچھا کہو تم کیوں کر میری جان چھوڑو گے؟"

میں نے مسکین بنتے ہوئے کہا۔" میں تو آپ کا داس ہوں...... زیادہ لالچ تو ہے نہیں۔ بس پچاس روپے پر مان جاؤں گا۔"

اس پر حضرت بری طرح تڑپے۔" یہ سراسر چار سو بیس ہے...... چار سو بیس کیا آٹھ سو چالیس ہے...... یاد رکھنا......" یہ کہا اور مٹھیاں کس کر میری جانب دیکھا۔ میں سر تسلیم خم کیے کھڑا تھا...... پھر جیسے غبارے میں سے ہوا نکل جائے۔" اچھا استاد مان لیا تمہیں۔ کل سے کام شروع کردو۔"

"اقرار نامہ لکھا جائے گا۔"

"ہاں ہاں بھئی ضرور لکھا جائے گا۔"

اور جب وہ اٹھ کر خوش و خرم واپس جانے لگا تو میری کمر میں ہاتھ ڈال کر بڑے رازدارانہ لہجے میں پوچھنے لگا۔ ہاں یار کہو تو وہ مکتی فوج کی ڈھڈو نے واقعی یہ بات کہی تھی کہ...... نہال چند کھراب کام کرتا ہے...... اور ...... آگے سے ہم تم کو دینا مانگتا......"

اس کی گھنی بھنوؤں تلے اس کی روشن آنکھیں شوخی سے چمک رہی تھیں۔

دوسرے دن سے میں اس کے ہاں ملازمت کرنے لگا۔ اقرار نامہ بھی لکھا گیا اور اس میں احتیاطاً ایک شرط میں نے یہ بھی شامل کروا دی کہ اگر اس نے مجھے نوکری سے برطرف کیا تو ایک ماہ کی تنخواہ زائد دینی پڑے گی۔

اس کی دکان میں دو ملازم پہلے ہی سے موجود تھے۔ ایک اس کا شاگرد اور دوسرا پرنٹر۔ پرنٹر ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اور اس کے گھر میں کوئی نہ کوئی بیمار ضرور رہتا تھا۔ اس لیے وہ ہمیشہ بیماریوں اور دواؤں کے اخراجات کا رونا روتا رہتا۔ نہال چند کا شاگرد عجب روکھی سی طبیعت کا تنہائی پسند نوجوان تھا۔ اس کا منہ قدرے پھولا سا تھا جیسے وہ سب سے روٹھا ہوا ہو۔

دکان کا کام عجیب طریقے سے چل رہا تھا۔ سامان اِدھر اُدھر بکھرا ہوا، گرد اڑتی ہوئی۔ دیواروں پر چھپکلیاں مکھیوں پر جھپٹتی ہوئی اور کونوں میں مکڑیوں کے جالے لہراتے ہوئے دکان میں کبھی فوٹو کا کاغذ نہ ہوتا، کبھی مسالہ ندارد اور کبھی لوشن ختم!

نہال چند اپنا کام چلانے کے لیے غیر معمولی جدو جہد نہ کرتا تھا۔ وہ اسے بس چالو رکھتا تھا۔ اس نے فوٹو گرافی کی ضروریات کی چیزیں کبھی اک ہی مرتبہ لاکر نہ رکھیں۔ حال یہ تھا کہ اِدھر کام آیا پڑا ہے اور اُدھر چھوکرے کو کاغذ کے لیے بھگایا جارہا ہے۔

دکان میں کام بالکل ہی ختم ہوجانے پر دو دو ڈھائی گھنٹے کے لیے دکان سے رخصت ہوجاتا۔ شہر کے کالجوں اور کوٹھیوں کے چکر لگاتا اور بالآخر کچھ نہ کچھ کام لے ہی آتا— یہ ایک قطعاً علاحدہ بات ہے کہ بعض اوقات بہت زیادہ کام مل ہی جاتا تھا اور اسے خاصی آمدنی ہوجاتی تھی۔ مگر اپنی طرف سے اس نے کام بڑھانے کے لیے زیادہ زور کبھی نہیں لگایا۔ بلکہ اگر کام کافی موجود ہو تو پھر ہر شخص اسے مرعوب کرسکتا تھا۔ مثلاً کوئی دن ایسا ہے کہ جیب میں پیسہ نہیں کام بھی کم ملا ہے تو گاہک کے تقاضا کرنے پر اس کے اندازِ گفتگو میں دنیا بھر کی ملائمت جمع ہوجاتی...... ''بندہ پرور! یہ ہاتھ میں تھوڑا سا کام ہے۔ بس اس کے بعد فوراً آپ ہی کا کام شروع کیا جائے گا۔''

گاہک برہم ہو کر کہتا۔ ''دیکھیے نا! آپ مجھے بہت پریشان کرتے ہیں۔ پرسوں کا وعدہ تھا۔ آپ نے کام کر کے نہیں دیا، کل آیا آپ نے انکار کردیا...... اور پھر آج......''

"حضور..... آج کا کیا ذکر ہے۔ آج تو ابھی شروع ہی ہوا ہے۔ ختم تو نہیں ہوگیا۔ رہی پرسوں کی بات، سو آپ کو معلوم ہی ہے۔ اس روز ہولی کی چھٹی تھی، اور جناب کل یوں ہی بادل گھرے رہے..... اب دیکھیے سر سے بلا ٹالنے والا کام تو ہم کرتے نہیں۔ آپ ہی کہیے کہ اگر آسمان پر بادل چھائے ہوں....."

"جی یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن..... لیکن آپ کو گاہکوں کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔".....

"ارے آپ گاہک ہیں۔" یہ کہہ کر اپنے مخصوص انداز میں ہنسنے لگتا۔ "نہیں صاحب ہم تو آپ کو گاہک نہیں سمجھتے....." پھر مجھے وہ آواز دیتا۔ "دیکھیے بابو یوگ راج جی..... یہ ہیں ہمارے..... اب کیا کہوں..... بس گاہک کے سوا کچھ ہی سمجھ لو..... ہمارے کرم فرما..... اور سنیے کان کھول کر۔ آج ان کا کام انہیں مل جانا چاہیے..... کیا سمجھے؟ ..... خواہ کچھ بھی ہو۔ گورنمنٹ کالج والوں کا کام جہاں تک کیا ہے بس وہیں چھوڑ دو کوئی ضرورت نہیں اس کے کرنے کی جب تک کہ آپ کا کام ختم نہ ہوجائے....."

اس قسم کی چکنی چپڑی باتیں سن کر گاہک خوش ہوجاتا اور نہال چند حسب موقع بعض اوقات گاہک کی کمر میں ہاتھ ڈال لیتا اور بعض دفعہ بڑے ادب سے بار بار سر تسلیم ختم کرتا اور جی بندہ پرور..... جی بندہ پرور کی رٹ لگائے جاتا..... یہ قصہ بس اسی جگہ ختم نہ ہوجاتا تھا بلکہ گاہک پر وہ کچھ ایسے ڈورے ڈالتا کہ رخصت ہونے سے پہلے وہ دوچار روپے بھی دے جاتا۔

جب کبھی نہال چند کی جیب گرم ہوتی تو پھر اس کا رویہ بالکل مختلف ہوتا تھا۔ ایسے موقع پر جب گاہک آتا۔ نہال چند دکان کے چبوترے پر اپنی ترنگ میں آنکھیں نیم وا کیے بیٹھا ہوتا یا گنا چوسنے میں مصروف ہوتا یا سنگترے کی پھانکیں کھانے میں منہمک— گاہک آتا۔ "ہمارا کام ہوگیا۔" پہلی مرتبہ سوال ہونے پر وہ عموماً چپ رہتا۔ دوبارہ سوال کیے جانے پر روکھا سا جواب دے دیتا۔ "ابھی نہیں ہوا۔"

"تو پھر؟"

"بس ہو جائے گا۔"

"کب؟"

اس پر وہ کچھ گرم ہو کر کہتا۔ "بس ہو ہی جائے گا۔ میں لکھ کر تو نہیں دے سکتا کہ کب ہوگا۔"

اس پر گاہک شکایتوں کے دفتر کے دفتر کھول دیتا۔ لیکن وہ چپ ہی رہتا۔ گاہک پوچھتا "تو پھر کب آؤں؟"

"کہہ دیا نا— کل دل آجایئے گا۔"

"یہ ناممکن ہے مجھے آج ہی شام چاہئے۔ واہ صاحب یہ بھی خوب رہی......"

اس پر وہ چمک کر کہتا۔ "بندہ پرور! ہم بھی انسان ہیں۔ جانور یا مشین تو ہیں نہیں۔ ایک تو ہمارے پاس کام زیادہ اور پھر سبھی گاہک بہترین کام کروانا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے تو کچھ وقت چاہیے۔ ان بھاڑے کے ٹٹوؤں کی طرح نہیں کہ بس اپنا تو سیدھا کر کے بچارے گاہک کو چلتا کیا۔"

اس پر گاہک مرعوب سا ہو کر واپس چلا جاتا۔

وہ روز کی آمدنی بلا ناغہ گھر لے جاتا اور جہاں تک میرا خیال ہے وہ پس انداز کچھ بھی نہیں کرتا تھا۔ جو آیا چٹ۔ اوّل تو خود ہی بڑا چٹورا تھا۔ سارا دن منہ ہلائے جاتا اور پھر گھر میں اس کا جوان بیٹا جو کالج میں پڑھتا تھا۔ نئی نویلی بہو اور آٹھ ماہ کی پوتی، نوکر وغیرہ ادھر دکان کے اخراجات علاحدہ تھے۔ تین نوکروں کی تنخواہیں، دکان کا کرایہ اور بیسیوں بکھیڑے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ ایسے کھلے خرچ کے بعد اس کے پلے کیا پڑتا ہوگا۔ ہر روز جب دکان پر آتا تو جیب خالی— بالکل بائبل کے اس مقولے کے مطابق کہ "اے خدا ہماری آج کی روٹی آج ہمیں دے۔"— مگر تھا قسمت کا دھنی۔ عام طور پر ہر روز اسے ایک اچھی خاصی رقم مل جاتی تھی۔ آمدنی کے کم و بیش ہونے کے ساتھ

ساتھ اس کا رویہ نہ صرف گاہکوں سے بدل جاتا تھا بلکہ گھر والوں سے برتاؤ میں بھی فرق پڑ جاتا تھا۔

ان کے گھریلو نوکر کا معمول تھا کہ ہر روز شام کو ''بی بی جی'' یعنی بڈھے کی بہو کے حکم کے مطابق وہ دکان پر نہال چند سے یہ پوچھنے کے لیے آتا کہ رات کو کھانے کے لیے کیا چیز پکائی جائے۔

اگر اس کی جیب میں خوب سی رقم ہوتی تو دور ہی سے نوکر کو آتے دیکھ کر اس کی باچھیں کھل جاتیں۔ رخساروں پر لہو جھلکنے لگتا۔ نوکر قریب پہنچتا تو پیش تر اس کے کہ وہ کچھ کہے۔ وہ خود ہی ہنس کر کہتا۔'' سنا بے منڈو! آج تو اتنا خوش کیوں ہے بے۔''

نوکر ابھی تیرہ چودہ برس کا لڑکا ہی تھا لیکن بڑا چلتا پرزہ۔ نہال چند کو خوش دیکھ کر وہ خود بھی خوب دانت نکال کر ہنستا۔۔۔ ''جی کچھ نہیں۔''

'' ابے کچھ نہیں کے بچے جھوٹ مت بول بتا تو کوئی لنڈیا تو نہیں پھنسالی۔ اور اب تو سالے تیری چٹکیلی کلا بھی آ گئی ہے۔ جب وہ ننھیال گئی تھی تو سور ایسا رویا ایسا رویا ...... کہ بابو یوگ راج جی......''

اس طرح کی خوشگوار سی تمہید کے بعد وہ گھر والوں کا فرداً فرداً حال دریافت کرتا......'' اور منّی! کیا کر رہی تھی منّی؟''

'' جی ہنس رہی تھی۔ جب ہی تو میں آیا نا؟''

'' ہنس رہی تھی ہاہا۔ ہاں تو آج کیا پکے گا رات کو؟''

'' آپ ہی بتایئے۔''

'' اجی نہیں...... آج تو آپ ہی بتایئے۔''

منڈو اس بات پر شرما جاتا۔ بالآخر خود ہی کہتا۔''اچھا تو آج گوشت لے جاؤ۔ کیا سمجھے...... نرم ہو۔ تھوڑا سا پردے کا بھی ڈلوا لینا۔ میرے لیے۔ اور اس میں مٹر بھی ڈالنا میرے لیے۔ مٹر دیسی لے جانا، شملے کے نہیں۔ دیسی مٹروں میں مٹھاس زیادہ ہوتی

ہے اور جب پھلیوں سے مٹر نکالے تو خیال رکھنا کہ سڑے گلے نہ ڈال دیجیو۔ اور منی کے لیے ہارلکس کی بوتل لے جائیو...... ہارلکس؟ سمجھے نہیں؟ ابے ہارلکس...... ہارلکس کہنا! لا میں تجھے لکھے دیتا ہوں...... اور ننھے کے لیے سنگترے" ننھے سے مراد اس کا وہ جوان شادی شدہ لڑکا جو ایک بچی کا باپ بھی تھا۔

اس کے بعد بالائی اور بی بی کے لیے مونگ کے دہی بڑے اور پکوڑیاں۔ اور جب شام کے وقت خود گھر جاتا تو پھل اور پھولوں کے گجرے لے جاتا۔ نوکر کو خوب چٹخارے لے لے کر سب چیزوں کے نام گنوانے کے بعد کہتا۔" بابو یوگ راج...... ارے بھائی اسے دس روپے کا ایک نوٹ تو دے دو۔"

میں اوپر والے کمرے میں فلمیں ڈیولپ کرنے میں مصروف ہوتا اور جب منڈو میرے پاس آتا تو میں اور کچھ نہیں تو کم از کم اس کی بی بی کی خیریت تو ضرور دریافت کر لیتا اور منڈو بھی دل کھول کر سب حالات بیان کرتا۔ اگر میں کرید کرید کر بی بی کی بابت سوال کرتا، تو وہ بھی جواب دینے میں بخل نہ کرتا۔ میرے پاس پہنچ کر منڈو کا رنگ کچھ اور ہو جاتا تھا۔" کہو منڈو یار کیا باتیں ہو رہی تھیں لالہ جی سے۔"

پھر میں پوچھتا۔" تمہاری بی بی جی کیا کرتی ہیں دن بھر......"

" کچھ نہیں۔" منڈو اپنی مسکین آواز میں جواب دیتا۔" بس پاؤں پھیلا کر لیٹی رہتی ہیں اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر انگڑائیاں لیتی رہتی ہیں۔"

اس قدر دل تڑپا دینے والا جواب سن کر میں منڈو کی طرف چونک کر دیکھتا۔ لیکن اس کی بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بالکل بھیگی بلی بنا چپ چاپ کھڑا رہتا۔ اس قسم کی باتیں کرتے وقت وہ کم ہی مسکراتا تھا۔ بڑی سنجیدگی سے گفتگو کرتا۔ اگر میں معمولی سی بات بھی پوچھتا تو وہ خوب تفصیل سے کل حالات بیان کرتا۔ میں پوچھتا۔" جب تو آنے لگا تھا۔ اس وقت بی بی جی کیا کر رہی تھیں۔"

"جی کچھ نہیں بس نہانے لگی تھیں۔"

"بے وقوف یہ بتا کہ وہ نہا رہی تھیں یا نہانے کے لیے تیار ہو رہی تھیں۔"

"جی کچھ نہیں اس وقت وہ انگیا پہنے آنگن میں گھوم رہی تھیں۔"

میں پھر پوچھتا۔" اب وہ تجھ سے شرماتی نہیں کیا۔ وہ کوئی بڑی بوڑھی تو ہیں نہیں......"

"جی کچھ نہیں، ابھی تو ان کی عمر بہت کم ہے۔ ایک روز مجھ سے کہتی تھیں۔ وے منڈو میں تجھ سے چار پانچ برس ہی تو بڑی ہوں...... لیکن وہ مجھ سے شرماتی نہیں ہیں۔ جب وہ چارپائی کی اوٹ میں نہاتی ہیں تو مجھ سے کہتی ہیں۔ وے منڈو! میرا تولیہ پکڑا دے، وے منڈو! میری انگیا تو لائیو۔"

منڈو سیدھے سادے سوال کا جواب بھی دلچسپ انداز میں دیتا۔ لیکن صورت بالکل معصوم اور متین بنائے رکھتا اور کہنے کا انداز بھی سرد ہوتا تھا۔

کبھی کبھی منڈو کو دو چار آنے انعام بھی دے دیتا۔ منڈو سمجھتا کہ یہ پیسے میری جیب سے نکلتے ہیں۔ حالانکہ یہ اسی لالہ کی جیب سے نکلتے تھے۔

جس روز نہال چند کو احساس ہوتا کہ آج آمدنی نہیں ہوئی۔ اس دن کا تماشا قابلِ دید ہوتا تھا۔ منڈو حسبِ معمول شام کے وقت آتا تھا لیکن نہال چند آنکھ اٹھا کر بھی اس کی طرف نہ دیکھتا۔ منڈو اپنا سوال دہراتا لیکن جواب ندارد۔ منڈو میز کا سہارا لیے چپ چاپ کھڑا رہتا اور اس پر اسرار خاموشی میں نہال چند اپنے کام میں مصروف رہتا۔ اور اپنی ایک مونچھ دانتوں میں چبائے جاتا۔ بالآخر آہستہ سے پوچھتا۔" گھر میں دال دال نہیں۔"

"جی نہیں۔"

"اور وہ جو میں مسور کی دال لایا تھا۔"

"بہت تھوڑی سی ہے۔"

"اور وہ ماش کی۔"

"بہت ہی کم ہے۔"

"وہ چنے کی دال۔"

"تھوڑے سے دانے بچے ہیں۔"

اس پر وہ چلا کر کہتا۔ "ابے الو سب کو ملا کر پکالو۔ گھی ملی دال۔ کم بخت کچھ اپنا دماغ بھی لڑایا کر......"

پھر منڈو سر جھکائے زمین کی طرف دیکھتا ہوا واپس چلا جاتا۔

نہال چند کو اپنے لڑکے سے جسے وہ "ننھا" کہہ کر پکارتا تھا، بہت زیادہ محبت تھی۔ "ننھا" شادی شدہ تھا، ایک بچی کا باپ تھا۔ لیکن ایک عرصے سے کالج میں بی اے کا متعلم تھا۔ کئی برس سے وہ امتحان پاس نہیں کر پایا تھا۔ بی اے پاس نہ ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ فیل ہوتا رہا ہو بلکہ اس نے کبھی امتحان ہی نہیں دیا تھا اور امتحان نہ دینے کا سبب یہ تھا کہ...... جب ننھا باپ کے پاس دُکان پر آتا۔ باپ پوچھتا۔ "بیٹے تم لوگوں کے امتحانات کب شروع ہوں گے۔"

"جی اپریل میں۔"

"اپریل میں۔" نہال چند منہ پھیلا کر پوچھتا۔

"جی۔" مسکین سا جواب ملتا۔

"اپریل میں تو بہت زیادہ گرمی ہو جاتی ہے بیٹے۔"

"جی۔"

"اچھا تو بیٹا! اب کے امتحان مت دے۔ پھر دے دیں گے۔ آخر جلدی بھی کیا ہے۔" اس کے بعد نہال چند مجھ سے مخاطب ہو کر کہتا۔ "کیوں بابو یوگ راج! ابھی بچہ ہی تو ہے۔"

میرے پلّے سے بھلا کیا جاتا تھا میں فوراً جواب دیتا۔ "جی اور کیا۔ ابھی تو "ننھا" بچہ ہے۔ کھیلنے کودنے کے دن ہیں۔ امتحان کا کیا ہے اور پھر اس قدر گرم

موسم......"

اس دوران میں اس کا کیم شحیم "ننھا" سر نیچے ڈالے خاموش کھڑا رہتا۔ میری یہ بات سن کر نہال چند پھولا نہ سماتا۔" ہاں اور کیا...... مت دو امتحان بیٹے...... جاؤ کھیلو۔"

اس پر بھی "ننھا" اپنی جگہ کھڑا رہتا۔ نہال چند اس کی پیٹھ تھپتھپا کر کہتا۔" بیٹے کچھ اور چاہیے۔"

اس پر ننھا کھڑے کھڑے یوں ہی فرش کو پاؤں سے کرید ڈالنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اپنا دھڑ عجب بے ڈھنگے طریقے سے ہلا ہلا کر اِدھر اُدھر جھولنے لگتا۔

"جی...... یوں ہی...... میں بائیسکوپ جاؤں گا۔"

" بائیسکوپ جاؤ گے؟ جاؤ بیٹے...... جاؤ...... بابو یوگ راج ننھے کو بائیسکوپ کے لیے پیسے دے دو۔"

" اور پتا جی۔" ننھا لاڈ سے منہ بچلا کر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہتا......" میرے ساتھ میرے چار دوست بھی ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہمیں بھی لے چلو......"

جتنے روپوں کی ضرورت ہوتی۔ نہال چند اسے دے دیتا— اس طرح اس کا بے کار لڑکا دوسرے تیسرے روز دکان پر آجاتا تھا۔ وہ درحقیقت بڑا لاڈلا اور سیدھا سادا نوجوان تھا— اگر کبھی وہ دھوپ میں چلا آئے تو چاہے سردیوں ہی کا موسم کیوں نہ ہو۔ نہال چند ہمیشہ اس سے خفا ہوتا کہ وہ دھوپ میں اتنی دور کیوں چلا آیا۔

نہال چند خود بھی کھانے پینے کا شوقین تھا۔ باہر سے گھوم پھر کر دکان پر واپس آتے ہی مجھ سے کہتا،" بابو یوگ راج کہو کچھ پیسے ویسے آئے یا نہیں۔" اور پھر تجوری میں سے نکال کر انہیں گننے لگتا اور گنتے گنتے میری آنکھ بچا کر دو تین روپے اڑا لیتا...... اس بارے میں وہ مجھ سے نہ معلوم کیوں ڈرتا تھا۔ روپے اڑا لینے کے بعد وہ ہنس ہنس کر مجھ سے باتیں کرتا اور پھر کھانستا ہوا دکان کے باہر والے کمرے میں جا کھڑا ہوتا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھل والے کی آواز آتی۔" بینگو والا۔ ہجور بینگو والا۔" بھلا نہال چند کو

''بہت ہی کم ہے۔''

''وہ چنے کی دال۔''

''تھوڑے سے دانے بچے ہیں۔''

اس پر وہ چلا کر کہتا۔'' ابے الّو سب کو ملا کر پکالو۔ کھچڑی ملی دال۔ کم بخت کچھ اپنا دماغ بھی لڑایا کر......''

پھر منڈو سر جھکائے زمین کی طرف دیکھتا ہوا واپس چلا جاتا۔

نہال چند کو اپنے لڑکے سے جسے وہ ''ننھا'' کہہ کر پکارتا تھا، بہت زیادہ محبت تھی۔ ''ننھا'' شادی شدہ تھا، ایک بچی کا باپ تھا۔ لیکن ایک عرصے سے کالج میں بی اے کا متعلم تھا۔ کئی برس سے وہ امتحان پاس نہیں کر پایا تھا۔ بی اے پاس نہ ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ فیل ہوتا رہا ہو بلکہ اس نے کبھی امتحان ہی نہیں دیا تھا اور امتحان نہ دینے کا سبب یہ تھا کہ...... جب ننھا باپ کے پاس دکان پر آتا۔ باپ پوچھتا۔'' بیٹے تم لوگوں کے امتحانات کب شروع ہوں گے۔''

''جی اپریل میں۔''

''اپریل میں۔'' نہال چند منہ پھیلا کر پوچھتا۔

''جی۔'' مسکین سا جواب ملتا۔

''اپریل میں تو بہت زیادہ گرمی ہوجاتی ہے بیٹے۔''

''جی۔''

''اچھا تو بیٹا! اب کے امتحان مت دے۔ پھر دے دیں گے۔ آخر جلدی بھی کیا ہے۔'' اس کے بعد نہال چند مجھ سے مخاطب ہو کر کہتا۔'' کیوں بابو یوگ راج! ابھی بچہ ہی تو ہے۔''

میرے پلّے سے بھلا کیا جاتا تھا میں فوراً جواب دیتا۔''جی اور کیا۔ ابھی تو ''ننھا'' بچہ ہے۔ کھیلنے کودنے کے دن ہیں۔ امتحان کا کیا ہے اور پھر اس قدر گرم

موسم......"

اس دوران میں اس کا یم شیم "ننھا" سر نیچے ڈالے خاموش کھڑا رہتا۔ میری یہ بات سن کر نہال چند پھولا نہ سماتا۔ "ہاں اور کیا...... مت دو امتحان بیٹے...... جاؤ کھیلو۔"

اس پر بھی "ننھا" اپنی جگہ کھڑا رہتا۔ نہال چند اس کی پیٹھ تھپتھپا کر کہتا۔ "بیٹے کچھ اور چاہیے۔"

اس پر ننھا کھڑے کھڑے یوں ہی فرش کو پاؤں سے کرید ڈالنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اپنا دھڑ عجب بے ڈھنگے طریقے سے ہلا ہلا کر اِدھر اُدھر جھولنے لگتا۔

"جی...... یوں ہی...... میں بائیسکوپ جاؤں گا۔"

"بائیسکوپ جاؤ گے؟ جاؤ بیٹے...... جاؤ...... بابو یوگ راج ننھے کو بائیسکوپ کے لیے پیسے دے دو۔"

"اور چا جی۔" ننھا لاڈ سے منہ پھلا کر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہتا......" میرے ساتھ میرے چار دوست بھی ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہمیں بھی لے چلو......"

جتنے روپوں کی ضرورت ہوتی۔ نہال چند اسے دے دیتا — اس طرح اس کا بے کار لڑکا دوسرے تیسرے روز دکان پر آجاتا تھا۔ وہ درحقیقت بڑا لاڈلا اور سیدھا سادا نوجوان تھا — اگر کبھی وہ دھوپ میں چلا آئے تو چاہے سردیوں ہی کا موسم کیوں نہ ہو۔ نہال چند ہمیشہ اس سے خفا ہوتا کہ وہ دھوپ میں اتنی دور کیوں چلا آیا۔

نہال چند خود بھی کھانے پینے کا شوقین تھا۔ باہر سے گھوم پھر کر دکان پر واپس آتے ہی مجھ سے کہتا۔ "بابو یوگ راج کہو کچھ پیسے ویسے آئے یا نہیں۔" اور پھر تجوری میں سے نکال کر انہیں گننے لگتا اور گنتے گنتے میری آنکھ بچا کر دو تین روپے اڑا لیتا...... اس بارے میں وہ مجھ سے نہ معلوم کیوں ڈرتا تھا۔ روپے اڑا لینے کے بعد وہ ہنس ہنس کر مجھ سے باتیں کرتا اور پھر کھانستا ہوا دکان کے باہر والے کمرے میں جا کھڑا ہوتا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھل والے کی آواز آتی۔ "ہینگو والا۔ بجور ہینگو والا۔" بھلا نہال چند کو

صبر کہاں۔ کیا مجال جو کوئی بھی خوانچے والا ادھر سے گزرے اور نہال چند کی رال نہ ٹپکے۔ چناں چہ وہ دن بھر پھل، آئس کریم، آلو کی ٹکیاں اور پاپڑ پکوڑیاں کھاتا رہتا۔ لیکن کھاتے وقت مجھے ضرور بلا لیتا۔

گاہکوں کے حساب کتاب کا یہ حال تھا کہ رُکی ہوئی رقمیں دروازے پر یا کرسی کے بازو پر یا دیوار پر لکھ لیتا تھا۔ زبانی بھی اسی طرح حساب یاد رکھتا تھا کہ فلاں بادامی رنگ کی پگڑی والے سردار سے تین روپے سوا چار آنے لینے ہیں۔ فلاں رنگ کے جمپر والی کرنٹی سے دو روپے اور فلاں مکھی کی سی مونچھوں والے آدمی سے دو روپے سات آنے اور مکتی فوج والی میم سے......

مکتی فوج والی میم سے اسے بہت انس تھا۔ وہ میم عموماً دکان پر آیا کرتی تھی اور یوں تو قبول صورت اور چال ڈھال والی عورت تھی لیکن عمر کچھ زیادہ ہوچکی تھی۔ جسم میں بھی بھاری پن پیدا ہوگیا تھا۔ گہرے نیلے رنگ کی آنکھیں بڑی کٹیلی تھیں۔ فراخ سینے میں بھی ابھی تناؤ باقی تھا اور قد و قامت میں نہال چند سے چار انگل بڑی ہی تھی۔ نہال چند اس کے سامنے بچھا جاتا تھا۔ خوب لہک لہک کر اور بعض اوقات لٹک لٹک کر باتیں کیے جاتا۔ جس وقت میم صاحب دکان میں داخل ہوتی وہ سب گاہکوں کو میرے سپرد کر کے خود اس سے باتیں کرنے لگتا۔ یورپین لوگ یوں بھی ہنس کر بات چیت کرنا معیوب نہیں سمجھتے۔ اور پھر تبلیغ کرنے والے عوام میں خوب گھل مل جانا اپنے مقصد کے لیے مفید بھی سمجھتے ہیں۔ اس لیے وہ میم بھی ضرورت سے زیادہ دُکان میں ٹھہری رہتی۔ شاید نہال چند نے اسے بھی کوئی جھانسا دے رکھا ہو۔ ورنہ اس کی آم کی سی صورت ایسی نہ تھی کہ میم اس پر ریجھ جاتی۔

اس طرح دن بڑے آرام سے گزرتے رہے۔ نہال چند نے دکان کا سیاہ و سفید میرے سپرد کر رکھا تھا اور میں بھی اس کے اعتماد کا ناجائز حد تک فائدہ نہیں اٹھاتا تھا۔ البتہ پان سگریٹ کے لیے چند آنے ادھر اُدھر کردینے میں حرج بھی نہیں سمجھتا تھا۔ جس

روز چاہتا چھٹی بھی منا لیتا تھا۔ ایک مرتبہ جب نہال چند دن کے گیارہ بجے کے قریب دکان سے باہر جانے لگا تو میں نے اس سے کہا کہ وہ دوپہر کو دو بجے سے پہلے پہلے واپس پہنچ جائے۔ مجھے خود چند دوستوں کے ساتھ سینما کا میٹنی شو دیکھنے کے لیے جانا تھا۔ میں نے بار بار تاکید کی کہ وہ ضرور وقت پر واپس پہنچ جائے تاکہ میرے دوست بائیسکوپ پر میرا انتظار ہی کرتے نہ رہ جائیں۔ اس نے بھی مجھے یقین دلایا کہ میں ضرور واپس چلا آؤں گا۔ چناں چہ میں مطمئن ہوگیا لیکن حضرت بھلا کہاں پہنچنے والے تھے۔ ہر گھڑی یہی گمان ہوتا تھا کہ شاید اب آجائے، اب آجائے لیکن اسے آنا تھا نہ آیا۔ یہاں تک کہ میں مایوس ہوگیا اور پھر آیا، تو سات بجے کے قریب، جب کہ دوسرے شو کا وقت بھی گزر چکا تھا۔ مجھے بہت کوفت ہوئی۔ جی چاہا کہ اس کا منہ نوچ لوں۔ لیکن وہ مجھ سے بات کیے بغیر دکان کے چبوترے پر جا بیٹھا۔ ادھر سے کابلی چنوں والا گزرا تو اس نے اسے بلایا اور مجھے بھی آواز دی۔ میں نے انکار کردیا۔ لیکن جب اس نے بڑا اصرار کیا تو میں اس کے پاس چلا گیا۔ اس نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی۔ میرا منہ مارے غصہ کے پھول رہا تھا۔ چنے کھانے کے بعد اس نے بڑی مسکین آواز میں کہا۔ "بیٹا یوگ راج......" وہ بزرگ تھا کبھی بیٹا بھی کہہ لیتا تھا...... "سنو بھائی اب تمھیں اصل بات سناتا ہوں۔ آج میں یوں ہی گھومتا ہوا لارنس گارڈن چلا گیا۔ وہاں ایک خاموش گوشے میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔" یہ کہہ کر اس نے ہلکی سی ایک سرد آہ بھری......" جانتے ہو کیا ہوا بس مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی...... میں سوچنے لگا۔ یہ دنیا کیا ہے۔ یہ انسان کیا ہے۔ یہ پرماتما کیا ہے۔ یہ خاک کا پتلا کیوں بنایا گیا ہے۔ اس دنیا میں آخر کسی کو رہنا تو ہے نہیں...... اف کس قدر تنہائی تھی وہاں پر۔ مکمل خاموشی۔ میں اس قسم کی باتیں سوچنے لگا۔ یہاں تک کہ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک اور گہری سانس لے کر سرد آہ بھری۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میرا جی پسیجا اور جب میں نے شام کے دھندلکے میں اس کی بے نور آنکھوں، جھریوں والے چہرے اور

نیچے کو لٹکی ہوئی سفید سفید مونچھوں کی طرف دیکھا، تو میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کی متین صورت میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئی اور دنیا کی ناپائداری کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ میں نے سوچا بچارے بوڑھے کو اپنے گزرے ہوئے دن اور کھوئی ہوئی جوانی یاد آ گئی ہوگی۔ اس قسم کی باتیں سوچ کر میرے دل سے نہ صرف ساری کدورت دور ہوگئی بلکہ میں الٹا اسی کو تسلی دینے لگا۔ زندگی کے فلسفے پر جو تھوڑا بہت میں کہہ سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ وہ غور سے میری باتیں سنتا رہا۔ لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔ بس گاہے گاہے ایک ہلکی سی سرد آہ کھینچ کر رہ جاتا۔

دوسرے روز مجھے ایک اور شخص کی زبانی معلوم ہوا کہ حضرت اس روز سارا دن گھوڑ دوڑ کے میدان میں بازی لگاتے اور کمپنی فوج کی میم صاحب کے ساتھ شام تک اِدھر اُدھر مٹرگشت کرتے اور چہکتے رہے تھے۔ مجھے یقین نہ آیا تو وہ شخص کہنے لگا کہ میں نے نہال چند کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور میں یہ اس کے منہ پر کہنے کو تیار ہوں۔ میں دکان جارہا تھا، وہ آدمی بھی میرے ساتھ ہو لیا۔ اسے بھی اسی رستے سے گزرنا تھا۔ نہال چند دور سے چبوترے پر بیٹھا دکھائی دیا۔ ہم دونوں کو ساتھ ساتھ دیکھا تو دکان کے اندر گھس گیا۔ خیر وہ شخص تو آگے بڑھ گیا اور میں دکان کے اندر چلا گیا۔ میں نے ایک تکیے کو سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''لالہ جی میں نے آپ کی ایک شکایت سنی ہے۔''

''کیا۔''

میں نے جواب دینے کے لیے اس کی طرف دیکھا تو وہ تنکے سے دانت کریدتے ہوئے شوخ انداز سے کچھ اس طرح مسکرایا کہ اور کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ رہی۔

میں تین چار ماہ تک وہاں ملازم رہا۔ آخر میں حسب عادت اس ملازمت سے جی تنگ آ گیا۔ ایک روز کسی چھوٹی سی بات پر بگڑ کر اپنے گھر جا بیٹھا اور دوسرے روز دکان پر بھی نہ گیا۔

مجھے میرے ایک دوست کی زبانی معلوم ہوا کہ اس نے جب نہال چند سے پوچھا کہ بابو یوگ راج کہاں ہے تو اس نے جواب دیا کہ میں نے اسے نکال دیا ہے۔ مجھے یہ سن کر بڑا طیش آیا۔ فوراً وکیل سے مشورہ کر کے میں نے اسے نوٹس بھیج دیا کہ چوں کہ تم نے مجھے نکال دیا ہے اور اس بات کی شہادت بھی موجود ہے اس لیے اب تم اقرار نامے کے مطابق نہ صرف میری پچھلے مہینے کی تنخواہ دو بلکہ ایک ماہ کی زائد تنخواہ بھی ادا کرو۔

نوٹس ملتے ہی اس نے فوراً کل رقم مجھے بھیج دی۔ اس کے بعد ایک روز بازار میں ملا تو کہنے لگا کہ میں نے کب کہا تھا کہ یوگ راج کو نکال دیا ہے۔ میں نے کہا۔" گواہ پیش کروں؟" اس پر وہ بڑے پیارے انداز میں مسکرایا....." اور اگر میں نے کہا بھی ہو تو کیا تم میرے بیٹے نہیں ہو۔"

اس کی مسکراہٹ اور بوڑھی آنکھوں کی چمک میں عجب دل کشی تھی۔ میں نے کہا۔"اب ساری تنخواہ کون واپس کرے۔" وہ فوراً بولا۔" تو نصف پر ہی مان جاؤ۔"

میں نے آدھی تنخواہ کے روپے اسے واپس دے دیئے۔

بھائی صاحب نے مجھے زیادہ عرصے تک بیکار نہ بیٹھنے دیا۔ بمبئی میں کارو بار کی صورت نکل آئی۔ مجھے بھی بمبئی دیکھنے کی تمنا تھی۔ فوراً آمادہ ہوگیا۔ بھائی صاحب نشیب و فراز سمجھا کر دفتر کو چل دیئے۔ میں اسٹیشن پر پہنچا۔

وہاں مجھے نہال چند دکھائی دیا۔ نہ جانے اسے کیوں کر معلوم ہوگیا کہ میں جارہا ہوں۔ مجھے الوداع کہنے کے لیے پلیٹ فارم پر آن پہنچا۔ جب میں گاڑی پر سوار ہوگیا اور گارڈ نے سیٹی بجا دی تو اس نے ایک چھوٹی سی پوٹلی بڑھاتے ہوئے کہا۔" لو اس میں آلو کے پراٹھے ہیں...... اچار بھی ہے اور پیاز بھی۔ بھوک لگے گی تو راستے میں کھا لینا۔"

میں نے پوٹلی لے لی۔ گاڑی ایک دھچکے کے ساتھ چل دی۔ میں نے پوٹلی ٹٹولتے ہوئے شرارت سے کہا۔" کیا واقعی یہ پراٹھے ہماری بھابی کے نازک ہاتھوں کے

بکے ہوئے ہیں۔"

یہ سن کر اس نے پاؤں زمین پر مار کر کہا۔" کھڑا تو رہ...... پاجی......" اور پھر اس کے لبوں پر وہی پرانی شوخ مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

گاڑی بڑھتی جا رہی تھی اور سفید شلوار اور طرّے دار پگڑی میں گڈا سا نہال چند الوداعی رومال ہلا رہا تھا۔

یہ افسانہ پہلی بار 'ادبی دنیا' لاہور جلد 24 شمارہ 12 میں شائع ہوا۔ افسانوی مجموعہ 'پہلا پتھر' میں شامل ہے۔

تین چور

سامنے کھیتوں میں اونچی سی جگہ پر جسے وہ "ٹبہ" کہتے تھے۔ کوئی گدھا گھومتا پھرتا آ پہنچا۔ اور لگا زور زور سے رینکنے۔ اس کی آواز نے گویا گھڑی کے الارم کا کام کیا اور چھیل سنگھ کی آنکھ کھل گئی۔

ابھی تڑکا ہی تھا اور چھیل سنگھ سویرے اٹھنے کا عادی نہیں تھا۔ لیکن چوں کہ دمدمے کا میلہ تھا اس لیے وہ جاگ اٹھا ورنہ گدھے کا رینکنا کیا اگر ایک چھوڑ دس گدھے اس کو روندتے ہوئے گزر جائیں تو بھی اس کی نیند میں خلل پیدا نہ ہو۔

اٹھ کر اس نے پہلے مندی مندی آنکھوں سے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ دودھ کے کٹورے میں ڈوبتے ہوئے بتاشوں کی طرح ابھی چند تارے آنکھیں جھپکا رہے تھے۔ دور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں اور چپ چاپ کھڑے ہوئے درختوں پر پھیلتی ہوئی مدھم روشنی کس قدر دل کش دکھائی دیتی تھی۔ اور پھر رات کی پرسکون اور تکان زدہ فضا میں سے سحر کے سوتے پھوٹ پڑے تھے۔ چھیل سنگھ کے لیے یہ ایک نئی کیفیت ہی سہی۔ لیکن حقیقت یہ تھی بعض لوگ اس وقت بھی کھیتوں کو جا چکے تھے۔

چھیل سنگھ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ اگرچہ قد و قامت میں چھوٹا نہیں تھا خیر سے بائیس برس کی عمر تھی۔ ماں باپ کا لاڈلا تھا۔ کام کچھ نہیں کرتا تھا۔ مگر

کھانے میں سب سے آگے۔ بڑے بھائی کبھی کبھی بڑبڑاتے ضرور تھے لیکن والدین کی موجودگی میں ان کا کچھ بس بھی نہیں چلتا تھا۔۔۔ اب جو پچھیل سنگھ جاگا تو اس نے اٹھتے ہی بازو پھیلا کر اینڈتے ہوئے ایک جماہی لی اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں سے رانیں سہلاتا ہوا ٹخنوں تک لے گیا۔

یوں تو روز بے فکری ہی میں گزرتا تھا۔ لیکن آج اسے قطعاً کوئی پریشانی نہ تھی۔ چہرے سے نہ صرف بے فکری ٹپکتی تھی بلکہ ایک روحانی سرور بھی۔ کیوں کہ آج کا دن کہیں سال بھر کے بعد آتا تھا۔ اور ہر شخص کو اعلانیہ خوشیاں منانے کا حق تھا کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔

اپنی چھوٹی چھوٹی داڑھی پر جو اس وقت خشک گھاس کی مانند محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچنا شروع کیا کہ آخر وہ انجانے طور پر اس قدر خوش کیوں تھا۔۔۔ تھوڑی دیر بعد اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی اور آنکھیں چمک اٹھیں...... پریتو سسرال سے واپس آگئی تھی۔ شادی سے پہلے دونوں کی گاڑھی چھنتی تھی۔ یہ بات کچھ اڑ نکلی تو پریتم کور کے والدین نے اس کی شادی کردی۔ اس بات پر پچھیل سنگھ بڑا تلملایا۔ لیکن پریتو نے ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا کہ میں سسرال جاکر وہیں کی تو نہیں ہوجاؤں گی۔ میکے بھی آیا ہی کروں گی۔ اور کبھی کبھار تم بھی میرے سسرال میں پہنچ جایا کرنا۔ پریتو مضبوط ہاتھ پاؤں کی ایک بے باک سی لڑکی تھی۔ چھوٹی موٹی تکلیفوں سے پریشان نہیں ہوتی تھی۔ اس کی اس قسم کی باتوں سے پچھیل سنگھ کی ڈھارس بندھ گئی ورنہ اس نے دوچار کے سر اُتار دیئے ہوتے۔ اگر سچ مچ وہ اس قسم کی حرکت کر بیٹھتا تو ان کے میل جول کی افواہ کی تصدیق ہوجاتی۔ لیکن پریتو چاہتی تھی کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ چناں چہ اس نے لاٹھی نہیں ٹوٹنے دی۔

جب پریتو پہلی بار سسرال سے واپس آئی تھی تو خوب گلے سے لپٹ کر روئی تھی۔ لیکن اب کے وہ کچھ کترا رہی تھی۔ پچھیل سنگھ نے کہہ دیا کہ دیکھنا کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے...... سردار پکوڑا سنگھ کا سر گلیوں میں ٹھوکریں کھاتا پھرے۔

پچھیل سنگھ اب بات بات میں لوگوں کو دھمکیاں دیا کرتا تھا۔ ڈاکوؤں اور خونیوں

میں تو اس کا اٹھنا بیٹھنا تھا ہی۔ اب اس نے خود بھی کچھ سر نکال لیا تھا۔ پھر جب امر سنگھ اور جگیر سنگھ جیسے شہدے اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگیں تو اور کسی کی کیا مجال تھی کہ دم مار سکے۔

پریتو نے جب اس کی دھمکی سنی تو لگی اسے پچکارنے، ادھر پریتو کی باہیں اس کی گردن میں حائل ہوئیں۔ ادھر سردار چھیل سنگھ فوراً پگھل گئے۔ سب ہتھیار ڈال دیئے اور کہا کہ میں تو یوں ہی دل لگی کر رہا تھا۔

چھیل سنگھ نے پوچھا "کہو میلے جاؤ گی؟"

"ہاں— تم تو جاؤ گے ہی—"

"ہاں— اور راستے میں ملاقات بھی رہے گی۔"

"میرے لیے کیا لاؤ گے؟—" جیسا کہ ہر عورت کا قاعدہ ہے مرد سے ضرور پوچھتی ہے کہ میرے لیے کیا لاؤ گے۔

ان باتوں کے تصور سے چھیل سنگھ کی باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ اس کا جوڑا ڈھیلا ہو کر ایک طرف کو ڈھلک گیا تھا۔ پگڑی ٹخنوں میں الجھی ہوئی تھی۔ وہ خلا میں دیکھ دیکھ کر یوں ہی مسکرائے جا رہا تھا۔ اور نہ معلوم وہ کب تک اس کیفیت میں غرق رہتا— مگر اس کے لنگوٹیے دوست امر سنگھ اور جگیر سنگھ بھی آ پہنچے۔ تاڑ کے درخت کی مانند لمبے تڑنگے۔ سانسیوں کے شکاری کتوں کی طرح چوکنے۔

آتے ہی انہوں نے اسے للکار کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ آج میلے کا دن تھا اور چھیل سنگھ گدھے بیچ کر سویا ہوا نہیں تھا۔ تو کم از کم بیٹھا تو تھا۔ دوستوں نے آتے ہی چارپائی اُلٹ دی۔ اس نے ڈھیلی ڈھالی پگڑی سر پر لپیٹی اور تینوں گاؤں کی طرف چل دیئے۔

ادھر سورج طلوع ہوا ادھر گاؤں میں گہما گہمی شروع ہو گئی۔ آج وہ ہر روز کی سست رفتار زندگی مفقود تھی۔ بلکہ بچے بچے کو گویا پر لگ گئے تھے۔ بڑے بوڑھوں کو تو خیر

گھر ہی پر لگے رہتے تھے۔ لیکن نوجوانوں کے امنگ بھرے دلوں کو چین کہاں۔ ایک طرف دوشیزاؤں نے کاجل کنگھی سنبھالی تو دوسری جانب نوجوان نے بھی سنگی تہبند لہرا دیے۔ ترچھے بانکے نوجوان اپنی اپنی اڑیل سانڈنیوں یا صبا رفتار گھوڑوں پر سوار شملے اڑاتے گاؤں کے گرد چکر کاٹنے لگے۔

چھیل سنگھ نے آج خاص طور پر آئینہ سامنے رکھ کر پگڑی باندھی۔ کھدر کی دودھیا قمیص پر مخمل کی واسکٹ اور نیچے سلک کا تہبند۔ پاؤں میں پشاوری جوتا۔ ہاتھ میں پیتل کے تاروں سے بندھی ہوئی لمبی اور مضبوط لاٹھی۔

گاؤں سے باہر آ کر نوجوان ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے اور پھر پھبتیاں کس کس کر ایک دوسرے کا مذاق اڑانے لگے۔ مختلف ذوق کے لوگ علاحدہ علاحدہ گروہوں میں تقسیم ہو کر چل دیے۔ چھیل سنگھ اپنی گھوڑی کی ننگی پیٹھ پر بیٹھا ادھر اُدھر تاک جھانک کر رہا تھا۔ جگیر سنگھ اور امر سنگھ ایک نہایت بدتمیز سانڈنی پر سوار تھے جو لمحہ بھر کو چین سے کھڑی نہ ہوتی تھی اور بے طرح بلبلائے جا رہی تھی۔

چھیل سنگھ پرتو کا انتظار کر رہا تھا۔ روانہ ہونے سے پہلے وہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ کن عورتوں کے گروہ میں شامل ہے تاکہ راستے میں اُسے تلاش کرنے میں دقت نہ رہے...... وہ بار بار اپنے گندمی سینے پر لٹکتے ہوئے سنہرے کنٹھے کو انگلیوں سے چھوتا اور گردن اٹھا اٹھا کر گاؤں سے باہر نکلنے والی سب سے بڑی گلی کی طرف دیکھتا۔

بالآخر جیسے خربوزوں سے بھرا ہوا چھکڑا باہر نکلا۔ اس میں گاؤں کی نوجوان عورتیں سوار تھیں۔ بیل ڈھنوان کی طرف بڑی تیزی سے سینگ ہلاتے ہوئے بھاگے۔ اور ان کی گھنٹیوں کی ٹناٹن سے فضا گونج اٹھی۔ پرتو اتفاقاً چھکڑے کے سب سے پچھلے حصے میں بیٹھی تھی۔ اُسے دیکھ کر ادھر چھیل سنگھ کی مونچھیں متحرک ہوئیں اور ادھر وہ عاشق کی سج دھج دیکھتے ہی کھل گئی۔ اس نے اطلاعاً اپنا ہاتھ ایک خاص انداز سے اوپر اٹھایا اور پھر بڑی صفائی سے اسی ہاتھ سے دوپٹہ کھینچ کر اس نے چھوٹا سا گھونگٹ نکال لیا۔

اب کیا تھا۔ چھیل سنگھ نے اپنی چینی گھوڑی کو ایڑ لگائی اور وہ گرد اڑاتی ہوئی اس تیزی سے چل نکلی جیسے غلیل میں سے غلہ نکلے۔

جب وہ چھکڑے کے قریب سے گزرا تو اپنی مخصوص آواز میں کھانسا— چھکڑے میں اس کی اپنی بہن بھی بیٹھی تھی اس نے پرتو کو تاکید کردی تھی کہ وہ راستے میں جہاں کہیں بھی اتریں اور میلے میں جس جگہ بھی ٹھہریں یا گھومیں وہ اس کی بہن کے ساتھ ساتھ رہے تاکہ آپس میں بات چیت کرنے میں کوئی دقت نہ ہو۔

اس طرح سارا راستہ ہنستے کھیلتے کٹ گیا اور جب وہ میلے میں پہنچے تو گھنے درخت کی چھاؤں تلے چھیل سنگھ نے ایک بڑی سی دری بچھا دی اس کی بہن، پرتو اور اڑوس پڑوس کی واقف کار عورتیں وہیں پر بیٹھ گئیں۔ گھوڑی اور سانڈنی کو بھی وہیں پر چھوڑ دیا گیا۔

میلے میں ارد گرد کے سینکڑوں لوگ آن جمع ہوئے تھے۔ اگرچہ چھیل سنگھ کا جی نہیں چاہتا تھا کہ درخت کے تلے سے اٹھ کر اِدھر اُدھر جائے۔ لیکن دوست کہاں چھوڑنے والے تھے۔

دوپہر سے پہلے پہلے عورتیں بھی میلے میں شامل رہتی تھیں لیکن اس کے بعد یہ مخلوط میلہ صرف مردوں کا میلہ رہ جاتا تھا۔ کیوں کہ مردوں کے ہجوم اور نشے میں بدمست نوجوانوں کے شور وغل میں عورتوں کا وہاں پر رہنا مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا— عورتوں کے چلے جانے کے بعد مرد خوب کھل کھیلتے۔ چناں چہ دوپہر کے وقت جب عورتیں واپس آنے لگیں تو انہوں نے گھوڑی اور سانڈنی بھی واپس بھیج دیں تاکہ رات کو چارے کی زحمت نہ ہو— چھیل سنگھ کو پرتو سے کھل کر باتیں کرنے کا موقع نہ ملا اور اب اس خیال سے وہ بہت اداس ہوگیا۔ اس نے موقع پا کر چھکڑے کے پیچھے پرتو کو جادبوچا۔ اور اس سے وعدہ لیا کہ وہ دوسرے روز شام کو ساگ توڑنے کے بہانے اس کے کنوئیں پر ضرور آئے گی۔ پرتو نے وعدہ کر لیا اور اس خوف سے کہ کوئی دیکھ نہ لے

پیچھے سرک گئی۔ اور اس کے کنٹھے کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی۔ ''خود تو کنٹھے پہنتے پھرتے ہو اور ہمارے لیے پیتل کی زنجیر بھی نہیں۔''

دوپہر کے بعد دفعتاً لوگ گھر لیو شراب کی بوتلیں بغلوں میں دبائے آئے۔ اور برسر عام منہ سے بوتلیں لگا کر غٹاغٹ پی گئے۔ اور پھر لگے جھومنے...... ایک بہت بڑے مجمع کے لوگ گھیرا بنا کر کھڑے ہوگئے۔ مہنتی کلیوں میں لپٹے ہوئے الغوزے بجنے لگے۔ اور ایک بانکے نے کان پر ہاتھ رکھ کر تان اٹھائی۔

ٹلّے ٹلّے ہئی روٹی لے کے دیور دی چلی
سرتے ڈوریا گنڈے دی چھل ورگا
ہئی روٹی لے کے

(یعنی ایک رسیلی عورت اپنے دیور کے لیے کھیت پر روٹی لے جارہی ہے اور سر پر دوپٹہ اس قدر باریک جیسے پیاز کا چھلکا)

پہلے بول کے بعد اک دم ٹلّے ٹلّے کا شور بلند ہوا اور جگیر سنگھ بل کھا کر چھیل سنگھ کی بغل سے نکلا۔ اور لاٹھی کو دونوں سروں سے پکڑ کر اسے ہوا میں بلند کیا۔ اور پاؤں سے گرد اڑا کر لگا بے ڈھنگے انداز سے رقص کرنے اس کی لانبی لہراتی ہوئی داڑھی نے ایک سماں باندھ دیا۔ وہ بڑی پھرتی سے ناچ رہا تھا۔ اور اپنی لمبی ٹانگوں کے طفیل دو چار سپاٹوں میں ادھر سے اُدھر جا نکلتا تھا۔

بھانت بھانت کی آوازیں بلند ہوئیں اور اپنے دیور کے لیے روٹی لے جانے والی البیلی عورت کے قصے نے جو طول کھینچا تو پھر نوبت کہیں کی کہیں جا پہنچی۔ جب کہانی آخری منزل میں داخل ہوئی تو لوگوں کو صبر کا یارانہ رہا۔ ہائے وائے کے نعرے تیز تر ہوتے گئے۔ اس افراتفری میں چند ایک لوگوں کی پگڑیاں اچھال دی گئیں۔ اس بات پر لٹھ برس گئے۔ پانچ سات کے ٹخنے اتر گئے۔ مگر اپنے اپنے زخموں پر دھجیاں لپیٹ کر وہ پھر کھیل کے میدان میں داخل ہوگئے۔

سونچی کا کھیل شروع ہوا۔ جگبیر سنگھ اور امر سنگھ دونوں تہبند پرے پھینک کر خم ٹھونک کر میدان میں جا کھڑے ہوئے۔ اگر چہ وہ دونوں چھیل سنگھ سے دس دس بارہ بارہ سال بڑے تھے۔ لیکن کھیل کود میں کسی سے پیچھے رہنے والے نہ تھے۔ اور اس قدر پختہ دم تھے کہ میلوں بلا تکان دوڑے چلے جاتے تھے — سورج کی تیز روشنی میں وجیہہ جوانوں کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑے دیکھ کر ایک مرتبہ تو چھیل سنگھ کا دل بھی لہرایا لیکن اس کی طبیعت در حقیقت اداس تھی۔ اس لیے باوجود اصرار کے اس نے کھیل میں حصہ نہ لیا۔

تاریکی چھانے لگی تو کھیل ختم ہوا۔ چھیل سنگھ کا نشہ اُتر چکا تھا۔ لیکن سر میں گرانی باقی تھی۔ جگبیر سنگھ اور امر سنگھ بھی پسینہ پونچھتے ہوئے اس کے قریب چلے آئے۔ پھر وہ لوگ باتیں کرتے ہوئے مہرے تنور والے کے دکان پر پہنچے۔ کھانا وانا کھانے کے بعد جگبیر سنگھ نے کہا: یار دن تو اچھا گزر گیا۔ لیکن پیسہ ایک بھی نہیں بچا۔ گھر والوں کے لیے ہمیں کچھ نہ کچھ تو لے جانا چاہیے تھا۔

ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد دفعتاً جگبیر سنگھ نے تجویز پیش کی کہ کیوں نہ آج کسی کے ہاں دست درازی کی جائے۔

چھیل سنگھ یہ سن کر اچھل پڑا۔ واہ کیسی معقول تجویز تھی۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ آخر اسے یہ بات کیوں نہ سوجھی۔ اس میں اسے اپنی نجات کا راستہ بھی نظر آ گیا۔ ممکن ہے اس طرح پرتو کے طعنے کا کوئی موثر جواب نکل آئے۔

چناں چہ یہ صلاح ٹھہری کہ ذرا رات بھیگ جائے تو وہ لوگ ستانے کے بعد کسی طرف کا رخ کریں اور راتوں رات کچھ نہ کچھ لے اڑیں۔ اس طرح گھر والے بھی یہ نہیں کہیں گے کہ اُن کے لیے میلے سے کوئی سوغات بھی نہ لائے۔ یہ طے کر کے وہ لوگ بھیڑ بھاڑ سے ہٹ کر ایک کھیت کی مینڈھ پر سر رکھ کر لیٹ گئے۔

کچھ دیر اونگھنے اور آرام کرنے کے بعد وہ اٹھ بیٹھے۔ ہر ایک نے اپنی اپنی کمر

سے بندھا ہوا نیچے سا جھاڑن اتارا اور اس میں جوتے باندھ کر دوبارہ کمر سے پیٹ لیے
اور پھر اُٹھ کر ایک سمت کو دبی چال سے بھاگ کھڑے ہوئے۔
چاندنی رات تھی دور دور تک کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ ہر طرف خاموشی اور سکون
کا راج تھا۔ وہ آپس میں باتیں کرتے ہوئے مڑے مڑے دوڑے چلے جارہے تھے۔
جب یہ لوگ تقریباً چھ کوس کا فاصلہ طے کر چکے تو ایک گاؤں کے قریب کچھ
فاصلے پر رک گئے۔ تجویز یہ تھی کہ پہلے اس بات کی کوشش کی جائے کہ گاؤں کے سرے
پر ہی کسی مکان میں کام بن جائے لیکن اگر مال ملنے کی کوئی امید نہ ہو تو پھر گاؤں کے
اندر داخل ہو۔

انہوں نے پگڑیوں کے شملوں کو گھما کر سر کی دوسری جانب اس طریقے سے
ٹھونس لیا کہ دیکھنے والوں کو محض ان کی آنکھیں نظر آئیں باقی چہرہ دکھائی نہ دے۔ اور
پھر سنبھل سنبھل قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھے۔ اگرچہ وہ چوکنے تھے اور دھیرے دھیرے
چل رہے تھے۔ لیکن تجربہ کار مجرموں کی طرح انہوں نے اس قسم کی حرکات سے پرہیز کیا
جن سے کسی دیکھنے والے کو کچھ شبہ ہو۔ مگر بھلا آدھی رات کو وہاں کون بیٹھا تھا۔
آج چوری کرنے کا مناسب موقع بھی نہیں تھا۔ خاص گرمیوں کا موسم۔ لوگ صحن
میں یا چھتوں پر سو رہے تھے۔ اور پھر اس پر طرہ یہ کہ چاند اپنے پورے جوبن پر تھا۔۔۔
لیکن آج وہ مجبوراً چوری کر رہے تھے۔ اور اسی لیے وہ گاؤں کے اندر جہاں ساہوکاروں
کے مکان تھے جانے سے کترا رہے تھے..... دفعتاً ان کے قریب ہی ایک درخت کے
سائے تلے سے ایک کتا نکلا اور انہیں اجنبی جان کر غرانے لگا۔ دوسرے لمحے میں چھیل
سنگھ نے لاٹھی کا ایک ہی بھرپور وار دیا اور کتا ٹھنڈا ہوگیا۔ اس کی دبی سی چیخ بھی اس
کے حلق سے نہ نکل سکی۔

ایک سائے تلے سے دوسرے سائے تک وہ چاروں طرف دیکھتے ہوئے بڑھ
رہے تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے ایک چھوٹے سے مکان کو تاکا۔ جو گاؤں سے قطعاً

الگ بنا ہوا تھا۔ اور پھر خاص بات یہ تھی کہ چھت پر قریب کھڑے ہوئے شرینہہ کے درخت کا سایہ بھی پڑ رہا تھا۔ مکان کے قریب ایک کوڑے کرکٹ کا ڈھیر تھا جس پر چڑھ کر وہ لوگ بڑی آسانی سے چھت پر پہنچ سکتے تھے۔

وہ لپک کر اس مکان کی دیوار کے سائے تلے جا کھڑے ہوئے۔ حسب معمول کچی اینٹوں کا بنا ہوا مکان تھا۔ پچھواڑے سے شگاف کرنا بھی کچھ مشکل نہ تھا۔ لیکن ان کے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا۔ بہرحال چھت پر چوں کہ کوئی نہیں تھا اور نہ چاند کی روشنی ہی وہاں پہنچتی تھی۔ اس لیے یہی مناسب سمجھا گیا کہ پہلے چھت سے صحن کی طرف جھانک کر موقع و محل کا جائزہ لیا جائے اور پھر جو مناسب ہو عمل میں لایا جائے۔

دیوار کی طرف منہ کر کے امر سنگھ اکڑوں بیٹھ گیا۔ اور چھیل سنگھ نے اس کے دونوں کندھوں پر پاؤں رکھ دیئے۔ پہلے امر سنگھ اٹھ کر سیدھا کھڑا ہوا اور پھر چھیل سنگھ اس کے کندھوں پر کھڑا ہوگیا۔ اس نے دبی زبان سے انہیں بتلایا کہ وہ آسانی سے چھت پر پہنچ جائے گا۔

چھیل سنگھ نے چھت پر نظر دوڑا کر پہلے لاٹھی آگے سرکائی اور پھر خود اچک کر اوپر جا پہنچا اور گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل سرکتا ہوا صحن کی طرف بڑھا۔ اس کے دونوں ساتھی انتظار میں کھڑے تھے کہ دفعتاً وہ لوٹ کر آیا۔ اور انہیں جلدی سے اوپر آنے کو کہا۔ ایک دوسرے کو اٹھا کھینچ کر چند لمحوں کے اندر اندر وہ سب اوپر پہنچ گئے، ایک دوسرے کے متوازی رینگتے ہوئے آگے بڑھے اور پرلی منڈیر کے قریب پہنچ کر لیٹ گئے۔ گردنیں آگے بڑھائیں تو وہ منظر دکھائی دیا کہ جگبیر سنگھ اور امر سنگھ کے منہ سے حیرت و مسرت کی ہلکی سی چیخیں نکل گئیں۔

صحن کے بیچوں بیچ ایک جوان اور حسین عورت چار پائی پر سوئی پڑی تھی اور اس کے بدن پر سونے کے اتنے زیورات تھے جتنے کہ وہ تصور کر سکتے تھے۔ سر پر چونک، کنپٹیوں پر جگلیاں کانوں میں بالیاں، گلے میں ہار، اور کلائیوں پہ یہ موٹے موٹے

گوکھر وا اور لال چوڑا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی شادی کو بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا— اس قدر خوش شکل عورت بھی ان کی نظر سے کبھی نہیں گزری تھی۔ سوتے میں عورت کی ٹانگیں شلوار کے پائنچوں سے باہر نکل آئی تھیں۔ ایسی متناسب گدرائی ہوئی رانیں اور پنڈلیاں بھی انہوں نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھی تھیں۔ گرمی کی وجہ سے عورت نے قمیص بھی نہایت باریک جالی دار کپڑے کی پہن رکھی تھی۔ ایک بازو سر کے نیچے تھا اور دوسرا اوپر کی طرف اٹھ کر سرہانے کے پیچھے کی طرف لٹک رہا تھا۔

تینوں چور درخت کے سائے میں مبہوت سے بنے بیٹھے تھے۔ چند لمحوں کے لیے تو انہیں اپنے آپ کا ہوش نہ رہا۔ اور پھر اس منظر سے توجہ ہٹی تو عورت کے قریب والی دوسری چار پائی پر نگاہ پڑی اس پر ایک نوجوان مرد لیٹا تھا۔ وہ بھی ہزاروں میں انتخاب تھا۔ صورت شکل اتنی اچھی نہ تھی لیکن اس کا جسم ایسا تھا کہ اچھے سے اچھے جوان کو دیکھ کر رشک آئے۔ وہ مرد محض ایک جانگیا پہنے سو رہا تھا۔ اس کا سینہ، اس کے بازو اور رانیں اور پھر اس کی مکمل شخصیت ایسی تھی کہ دیکھ کر دل پر ہیبت طاری ہوجاتی تھی۔ ایک مرتبہ تو وہ تینوں ساری چوکڑی بھول گئے۔

وہ چپ چاپ پیٹ کے بل لیٹے ہوئے حالات کا جائزہ لیتے رہے کافی وسیع صحن تھا۔ پرلے گوشے میں دو بہت اعلا نسل کی بھورے رنگ کی بھینسیں بندھی تھیں۔ ان میں شاید ایک دودھ دینے والی اور دوسری ابھی بیاہنے والی تھی۔ سامنے کی دیوار پر کھونٹے سے دودھ بلونے کی بڑی بلونی لٹک رہی تھی۔ اس طرف کے گوشے میں رسوئی بنی ہوئی تھی جس میں چند برتن چمک رہے تھے۔

منڈیر سے ذرا پرے کھسک کر وہ آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ واقعی خطرے کی بات تھی ایک طرف سونا تھا اور دوسری جانب دیو ہیکل جوان۔ ظاہر تھا کہ اگر ایسے میں وہ جاگ اٹھا تو ان میں سے ایک آدھ کو تو رکھ ہی لے گا۔ چھیل سنگھ نے کہا کہ اس قدر عظیم الجثہ انسان ان کے برابر لمبی دوڑ نہیں لگا سکتا۔ اور اگر صحن کی بجائے باہر کھلے

کھیتوں میں مقابلہ ہو جائے تو وہ تینوں اس سے شاید ہی مار کھائیں۔
تینوں جوان جن کی طاقت، ہتھکنڈوں اور دلیری کی علاقے بھر میں دھوم تھی۔ ڈر رہے تھے کہ کہیں اپنے گھر سے اٹھارہ بیس کوس پرے مفت میں مارے نہ جائیں۔ آخر چھیل سنگھ کے گرم خون نے جوش مارا۔ اس نے کہا میں صحن میں اترتا ہوں اور عورت کے زیور اتارتا ہوں اگر مرد کی آنکھ کھل گئی یا عورت کے شور مچانے پر وہ جاگ اٹھا تو ظاہر ہے کہ وہ پہلے اس کی طرف متوجہ ہوگا۔ اس وقت وہ دونوں فوراً چھت سے کود کر اس کے پیچھے سے حملہ کردیں۔ امر سنگھ نے سوال کیا کہ کیوں نہ ہم دونوں نیچے اُتر کر اس کے سرہانے پر کھڑے رہیں۔ چھیل سنگھ نے کہا یہ درست نہیں کیوں کہ اس صورت میں کہ اگر ہمیں بھاگنا پڑا اور ہم تینوں صحن میں ہوئے تو فرار ہونا مشکل ہو جائے گا۔
یہ کہہ کر وہ چوکے کے قریب اٹھی ہوئی دیوار پر پاؤں رکھ نیچے اُتر گیا۔ اور دبے پاؤں عورت کے قریب جا پہنچا۔
جب وہ اس کی چار پائی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا تو اُس نے نزدیک سے عورت کے بدن پر نگاہ دوڑائی۔ اس کی جلد کی نزاکت، صحت، رنگ، اور مہک سے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اس کی باریک جالی دار قمیص میں اس کا بدن اور بھی دل فریب دکھائی دے رہا تھا۔۔۔ پھر اس نے اپنے ذہن کو اس قسم کے خیالات سے آزاد کیا اور اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔
سوئی ہوئی عورت کے بدن سے زیور اتارنے میں اس کا ہاتھ بہت صاف ہو چکا تھا۔۔۔ چناں چہ ہر زیور اتارنے کے بعد اس کی مونچھوں تلے اس کی باچھیں کھل جاتی تھیں۔ اور وہ ایک نظر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ لیتا تھا وہ دونوں رات کی خاموشی میں چھت پر اوندھے لیٹے تھے۔ ان کی ٹھوڑیاں تین چار انگل بلند منڈیر پر رکھی تھیں۔ چہرے پگڑیوں کے شملوں میں چھپے ہوئے تھے اور بھیڑوں کی مانند دہکتی ہوئی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔۔۔ البتہ جگہیر سنگھ کی لمبی داڑھی منڈیر سے نیچے لٹکتی ہوئی ہوا کے

جھونکوں سے ہولے ہولے ہل رہی تھی۔ چھیل سنگھ نے یہ منظر دیکھا تو اسے ہنسی آنے لگی۔

چھیل سنگھ نے کمر سے لپٹے ہوئے جھاڑن کو زمین پر بچھا دیا تھا۔ گہنے اتار اتار کر اس میں رکھے جاتا تھا۔

اس نے عورت کے ماتھے اور سر کے سب زیورات نہایت صفائی سے اتار لیے۔ دونوں کلائیوں کے گوگھرو بڑی ترکیب سے اتارے۔ یعنی گوگھروؤں کے دونوں سروں میں مضبوط ڈوری کا پھندا ڈال کر وہ انہیں مخالف سمتوں کی جانب کھینچتا اور جب ان کے منہ کھل جاتے تو وہ انہیں اتار لیتا۔ گلے کا ہار بھی اتار لیا اور پھر کانوں کی بالیاں اُتارنے میں اس نے نہایت صفائی سے کام لیا۔

تقریباً سب بھاری زیورات اتر چکے تھے۔ صرف دوسرے کان کی بالیاں رہ گئی تھیں۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ عورت کا چہرا پرلی طرف جھکا ہوا تھا۔ اور کان نیچے دب گیا تھا۔ چھیل سنگھ سوچ میں پڑ گیا کہ وہ عورت کا سر کس طرح گھمائے۔ اس کی نظر اٹھی دیکھا کہ اس کے ساتھی اشاروں ہی اشاروں میں اسے بھاگ آنے کے لیے کہہ رہے ہیں لیکن وہ اپنی کامیابی پر اس قدر نازاں تھا کہ وہ ان چند بالیوں کو بھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہتا تھا۔ چناں چہ اس نے چارپائی کی رسی میں سے ایک باریک سا ریشہ نکالا اور اسے ایک سرے سے پکڑ کر اس کا دوسرا سرا عورت کے کان میں گھمایا۔ پہلی مرتبہ تو کچھ اثر نہ ہوا جب اس نے دوسری مرتبہ گھمایا تو عورت نے کروٹ بدل کر منہ اس کی طرف کر دیا۔ وہ یک لخت جھک کر چارپائی کے نیچے ہوگیا۔ پھر اس نے دھیرے دھیرے سر اوپر اٹھایا۔ اب عورت کے رخسار اور اس کے ہونٹوں میں بالشت بھر کا فرق تھا۔ لیکن اس نے کوئی ایسی حرکت کرنے سے اپنے آپ کو باز رکھا۔ اس نے شعلے سے چہرے کو ایک مرتبہ پھر اچھی طرح ڈھانپ لیا اور ہاتھ بڑھا کر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

دو بالیاں اتار چکا تو تیسری جو آخری بالی تھی کچھ پھنس گئی۔ بہت کوشش کی لیکن

سوراخ اس قدر تنگ تھا کہ بالی اُترنے میں ہی نہ آتی تھی۔

معاً عورت کے ہاتھ کو حرکت ہوئی پل بھر میں بالی اُتری اور اس کی طرف بڑھی۔

پھلیل سنگھ بھونچکا سا رہ گیا۔ عورت نے اپنی مدبھری آنکھیں کھولیں اور مسکرانے لگی۔

پھلیل سنگھ عورت کی اس حرکت پر اس قدر حیران ہوا کہ بت بنا بیٹھا رہا، اسے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔

عورت نے اطمینان سے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے آہستہ سے پچکار کر کہا۔ ''اچھا تمہارے لیے بہتر تو یہی ہے کہ جس طرح اور جن ہاتھوں سے تم نے سب زیور اتارے ہیں اسی طرح اور انہیں ہاتھوں سے انہیں پہنا دو۔ ورنہ اگر تم بھاگ گئے تو بھی میرا خاوند تم تینوں کو جا پکڑے گا اور مار مار کر تمہارا بھرکس نکال دے گا۔''

پھلیل سنگھ چپ رہا۔

عورت دل کش انداز میں ہنسی— ''ہاں سوچ لو...... یہ کہہ کر اس نے اطمینان سے آنکھیں موند لیں۔

پھلیل سنگھ کا اجڈ پن عود کر آیا۔ بولا یہ میں مانتا ہوں کہ تمہارا خاوند بہت مضبوط شخص ہے لیکن ہم لوگوں کو دوڑ کر پکڑنا یا ہم سے لڑنا اس کے بس کی بات نہیں۔''

یہ سن کر عورت نے زیورات کا جھاڑن اٹھایا اور پوٹلی باندھ کر اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ اور کہا۔ لو جب تم سامنے والے اس چھوٹے سے درخت کے قریب پہنچ جاؤ گے تو میں اسے جگا دوں گی۔

پھلیل سنگھ کو تاؤ بھی آیا اور اس نے اپنی انتہائی بے عزتی بھی محسوس کی مگر خیر وہ اٹھا اور ڈھیٹوں کی طرح پوٹلی ہاتھوں میں لیے چھت پر چڑھ گیا۔ اس نے مختصر طور پر ساتھیوں کو سارا قصہ سنایا اور پھر وہ تینوں وہاں سے چل دیئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ شخص اُنہیں دوڑ کر نہیں پکڑ سکے گا۔ اور کھلے میدان میں پہنچ کر وہ یوں بھی اس سے نبٹ

لیں گے۔

جب وہ ببول کے اس درخت کے قریب پہنچے تو انہوں نے گھوم کر دیکھا انہیں مکان کی چھت پر وہی شخص دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی اور وہ اب پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ دیو ہیکل دکھائی دے رہا تھا۔ ان کے دیکھتے دیکھتے اس نے چھت سے چھلانگ لگائی۔ چھبیل سنگھ تو بس وہیں پاؤں جما کر کھڑا ہوگیا لیکن اس کے ساتھیوں نے اصرار کیا کہ ایسی حماقت مت کرو گاؤں کے قریب لڑنا مناسب نہیں۔ اگر گاؤں والوں کو معلوم ہوگیا تو وہ سب کے سب ہم پر پل پڑیں گے۔ مفت کی مصیبت کا سامنا ہوگا۔ اگر لڑنا ہی ہے تو گاؤں سے ذرا پرے ہٹ کر لڑیں گے۔

چھبیل سنگھ کو ان کی رائے مناسب معلوم ہوئی۔ اور تینوں آگے پیچھے ایک ہی قطار میں دوڑنے لگے۔ وہ خاصی رفتار سے لپکے ہوئے جارہے تھے لیکن ان کا تعاقب کرنے والا بہت تیز نکلا۔ چنانچہ انہیں رفتار اور بھی تیز کرنی پڑی۔ لیکن انہیں محسوس ہوا کہ اس طرح بھی کام نہیں چلے گا۔ کیوں کہ ان کا حریف ریل کے انجن کی سی تیزی کے ساتھ آگے بڑھا آرہا تھا اور اب ان کے درمیان دو بڑے کھیتوں کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ پھر وہ پوری رفتار سے دوڑ پڑے چند منٹ تک اسی طرح دوڑتے چلے گئے۔ وہ تینوں انتہائی تیز اور لمبی دوڑوں کے لیے خاص شہرت کے مالک تھے۔ لیکن اس وقت وہ حیران رہ گئے۔ وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر تھے۔ اس قدر گرانڈیل شخص اس قدر تیز کیوں کر دوڑ رہا ہے۔ ان کا یہ خیال بھی غلط نکلا کہ وہ تھوڑی دور تک دوڑنے پر ہانپ جائے گا— بلکہ حقیقت یہ تھی کہ اس قدر تیز رفتار کے ساتھ زیادہ لمبی دوڑ لگانے سے وہ خود کچھ ہانپ رہے تھے۔ ادھر ان کا حریف کچھ اور بھی قریب آگیا تھا۔

اسی طرح دوڑتے دوڑتے انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ سامنے جھڑ بیریوں کے جو دو جھنڈ نظر آرہے ہیں ان کے بیچ میں ہو کر گزرا جائے۔ جھنڈوں کے درمیان تنگ راستے سے گزرتے وقت اگلے دونوں ساتھی اچک کر دائیں طرف کی جھاڑیوں کی

اوٹ میں کھڑے ہو جائیں اور چھیل سنگھ سیدھا دوڑتا ہوا چلا جائے گا۔ یہ سب کام اس صفائی سے کیا جائے کہ ان کے حریف کو بس یہی معلوم ہو کہ وہ تینوں سیدھی قطار میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگے چلے جارہے ہیں— اور جب وہ اس راستے میں سے ہو کر گزرے تو اس پر پیچھے سے حملہ کیا جائے اور اس وقت اگلا ساتھی بھی واپس لوٹ آئے۔ اس طرح وہ تینوں مل کر اسے ٹھکانے لگا دیں۔

چناں چہ اسی طرح کیا گیا۔ جگیر سنگھ اور امر سنگھ جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو گئے چھیل سنگھ چوں کہ سب کے پیچھے تھا۔ وہ سیدھا بھاگتا چلا گیا۔ اور جب ان کا حریف جھاڑیوں میں سے ہو کر گزرا تو جگیر سنگھ نے لاٹھی تول کر ایسا بھر پور ہاتھ دیا کہ اگر اس کے سر پر بالوں کا بہت بڑا جوڑا نہ ہوتا تو لاٹھی اس کے جبڑوں تک اتر جاتی۔ چھیل سنگھ فوراً واپس پلٹا۔ اس کے پہنچتے پہنچتے تک انہوں نے اس کی پیٹھ اور ٹانگوں پر دو چار لاٹھیاں اور برسادیں۔ لیکن ان کا حریف پہلے بھرپور وار ہی سے گر پڑا اور بے ہوش ہوگیا۔

چھیل سنگھ نے ان کا ہاتھ روک دیا۔ اب مت مارو بے چارے کو— آؤ اب ہم لوگ چل دیں۔"

وہاں سے دو کوس پرے وہ لوگ ایک رہٹ کے قریب کھیت میں چھپ کر لیٹ رہے سوچا کہ کچھ دیر آرام کریں گے اور دن چڑھے میلے میں واپس چلے جائیں گے۔

کچھ دیر تک وہ سوئے رہے۔ صبح ہوئی تو انہوں نے اٹھ کر رہٹ سے منہ ہاتھ دھویا چھیل سنگھ نے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر یار جو کچھ بھی کہو رات والا جوان خوب تھا...... آہا ہا...... کیا خیال ہے تمہارا وہ مر تو نہ گیا ہوگا...... بھئی مجھے تو کچھ فکر سی لگی ہوئی ہے......"

چھیل سنگھ نے گویا سب کے دل کی بات کہہ دی۔ وہ بولے" چلو ہم اس کا پتہ لگائیں۔ ہمیں گاؤں میں کوئی پہچانتا تو ہے نہیں۔"

وہ واپس چل دیئے۔ پہلے اس جگہ پہنچے جہاں انہوں نے اس پر وار کیا تھا۔ وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ شاید گاؤں والوں میں سے کسی نے دیکھ پایا ہو اور اُسے اٹھا کر لے گئے ہوں۔ لیکن زمین خون سے سرخ ہوگئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ خون بہت زیادہ بہہ گیا ہے۔ اس قدر خون بہہ جانے کے بعد وہ شاید ہی زندہ بچا ہو۔

وہ تینوں مغموم سے ہوگئے۔ درحقیقت وہ ایسے غیر معمولی جوان کو جان سے نہیں مارنا چاہتے تھے— اب انہوں نے مشورہ کیا کہ تینوں علاحدہ علاحدہ گاؤں میں داخل ہوں اور اس کی حالت کا پتہ لگائیں۔

وہ بکھر کر علاحدہ علاحدہ گاؤں کی طرف چل دیئے چھوٹے سے گاؤں میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل چکی تھی انہیں معلوم ہوگیا کہ اس کا نام درہارا سنگھ ہے اور وہ اس وقت گاؤں کے دائرے میں پڑا ہے۔

دائرے میں پہنچے تو وہاں اور بھی کئی لوگ جمع تھے۔ انہیں یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ وہ مرا نہیں۔ بھیڑ میں گھس کر دیکھا تو درہارا سنگھ ایک بڑی چار پائی پر کہنی کے سہارے بیٹھا تھا۔ سر پر پٹی بندھی تھی اور وہ ہنس ہنس کر لوگوں سے باتیں کر رہا تھا۔

دن کی روشنی میں اس کا غیر معمولی طور پر پلا ہوا جسم دیکھنے کے قابل تھا۔ اُف کس قدر تنومند تھا وہ شخص۔

وہ علاقے بھر میں مشہور جوان تھا۔ اور اکیلا کئی کئی جوانوں پر بھاری تھا اور آج تک اس کے ہاتھ سے بچ کر کوئی شخص نہیں جاسکا تھا۔

چھیل سنگھ نے براہ راست درہارا سنگھ سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ آخر ماجرا کیا ہے درہارا سنگھ نے اسے پردیسی راہ گیر سمجھ کر سارا قصہ کہہ سنایا۔ اور پھر بڑے مزے میں ہنس کر بولا ''وہ تعداد میں تین تھے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ وہ کوئی معمولی چور نہیں تھے کیوں آج تک دوڑ میں بھی میں کسی شخص کو بہت زیادہ دور تک نہیں جانے دیتا۔ رات والے جوان دوڑنے میں یقیناً مجھ سے کم نہ تھے۔ مجھے ملیں تو اُن کے ہاتھ چوم لوں۔

جب میں ان کے پیچھے بھاگ رہا تھا تو دل ہی دل میں ان پر آفرین کہہ رہا تھا۔ لیکن مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ آمنے سامنے مقابلہ نہ ہوسکا......"

وہ تینوں چپ چاپ تعریفی نظروں سے اس کو دیکھتے رہے۔ اور پھر انہوں نے آپس میں انکھیوں سے اشارے کیے اور وہاں سے چل دیئے۔

وہ تینوں چپ چاپ چلے جا رہے تھے اور جب وہ رات والے مکان کے قریب سے گزرنے لگے تو دفعتاً چھیل سنگھ رک گیا۔ اس نے چندے سکوت کیا اور پھر کمر سے زیورات کی پوٹلی نکالی اور دوسرے لمحہ میں اُسے گھما کر ایسے نشانے پر پھینکا کہ پوٹلی عین صحن کے بیچ میں جا گری۔

پھر وہ تینوں جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ گئے اور جب گاؤں سے دور پہنچ گئے تو ایک مرتبہ پھر انہوں نے رہٹ کا ٹھنڈا پانی پیا۔

چھیل سنگھ نے واڑھی سے پانی کی بوندیں پونچھتے ہوئے شکرے کی سی دہکتی ہوئی آنکھوں سے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور بولا۔ "کہو یارا آج رات کس کے ہاں ہاتھ صاف کیا جائے؟"

یہ افسانہ 'ادبی دنیا' لاہور، دسمبر 1948 میں پہلی بار شائع ہوا۔ افسانوی مجموعہ 'پہلا پتھر' میں شامل ہے۔

آشیانہ

کھلتے ہوئے گلابی رنگ کی دوزی فوزی اُون کا سویٹر بدن سے کچھ اس طرح چپکا ہوا تھا کہ مجھے بار بار اوڑھنی کو سینے پر ڈالنا پڑ رہا تھا۔

اس دوران میں ممکن ہے کہ میرا چہرہ بھی گلابی ہو گیا ہو۔ میں نے دبی دبی نظروں سے دوسری لڑکیوں کے کپڑوں کا جائزہ لیا کہ کہیں میرا لباس اس موقعے کے لیے ضرورت سے زیادہ شوخ تو نہیں ہے۔ لیکن سب لڑکیاں خوب سج دھج کر آئی تھیں۔ ان میں سے ایک نوخیز حسین کرسچین لڑکی چھوٹے موزے پہنے جو اس کی سڈول پنڈلیوں تک بھی نہیں پہنچتے تھے۔ ایسے کھلنڈرے پن کا اظہار کر رہی تھی جیسے وہ انٹرویو کے لیے نہیں کلب میں پنگ پانگ کے لیے آئی ہو۔

موسم سرما کی نہایت خوش گوار صبح تھی۔

بڑے بڑے ستونوں والی عمارت کے برآمدے میں بچھی ہوئی طویل بنچوں پر ہم سب لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ بعض آپس میں چہل کر رہی تھیں۔ لیکن میں سب سے الگ تھلگ گویا دھونی رمائے بیٹھی تھے۔ میری آنکھیں کبھی برآمدے کے آگے پھیلے ہوئے مخملیں گھاس کے لان پر پھیلنے لگتیں اور کبھی اونچی اور گھنی باڑ میں اڑنگا لگائے آہنی پھاٹک کو تاکنے لگتیں۔

"وہ بیسائی لڑکی سلیکٹ ہو جائے گی۔" آواز آئی۔
"کیوں؟"
"کیسی طرح دار ہے وہ"
دوسری نے تامل کیا اور پھر کہا۔ "یہ بھی اچھی ہے۔"
"کون؟"
"گلابی سویٹر والی"
میں شرما، سمٹ اور لرز کر رہ گئی۔ توبہ! بے شرم!!
ذہنی کوفت سے بچنے کے لیے میں نے کلائی پر بندھی ہوئی رسٹ واچ کی طرف دیکھا۔ دس بجنے کو تھے۔
لڑکیاں آپس میں کہہ رہی تھیں، نہ جانے کون انٹرویو لے گا۔ کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ سرکاری دفتر تو ہے نہیں کہ وقت کی پابندی کی جائے۔
"ہائے تیرا جی تو چاہتا ہوگا کہ فوراً پی، اے بنالی جاؤں۔"
اس قسم کی باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ بغل والا دروازہ کھلا اور تنگ فراک اور الجھے بالوں والی ایک لڑکی نے آواز دی۔ "مس پربھا مصرا"
مس پربھا مصرا پہلے تو بدک کر یوں چونکیں جیسے وہاں سے سرپٹ بھاگ کر سیدھے گھر پر دم لیں گی۔ لیکن پھر صحیح حالات کا احساس ہونے پر دروازے کی جانب بڑھیں اور چق کی اوٹ میں غائب ہو گئیں۔ جب لوٹیں تو بغیر رُکے پھاٹک کا رخ کیا۔ ایک طرار لڑکی نے آواز دی۔ "حضور!" انٹرویو ختم ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تماشہ ختم اور چیمہ اعظم ابھی تشریف رکھیے۔"
جب وہ جھینپ کر بنچ پر بیٹھ گئیں تو لڑکیوں نے سوالات کی بوچھار کر دی۔
لڑکیاں باری باری بلائی جانے لگیں۔ تعداد میں کل گیارہ لڑکیاں تھیں، میرا نمبر آٹھواں تھا۔
اپنا نام پکارے جانے پر میں سنبھل کر اٹھی اور ایک چھوٹی سی فائل بغل میں دابے چق اٹھا کر اندر داخل ہو گئی۔

بھاری بھرکم آفس ٹیبل کے پیچھے اُبھرے بدن اور گورے رنگ کا تقریباً چھبیس سالہ شخص سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کی پتلی پتلی اُجلی انگلیاں اس کے گھنے بالوں میں دھنسی ہوئی تھیں۔ اس نے میری جانب دیکھے بغیر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بھی اس کے ہاتھ کے پیچھے چھپا ہوا چہرہ دیکھ نہ سکی۔

کمرہ طویل تھا، دو بڑی کھڑکیوں پر رنگین پردے، جواب نیالے ہو گئے تھے لٹک رہے تھے۔ ایک گوشے میں چھوٹا سا پیانو دھرا تھا— اس کے اسٹینڈ پر میوزک کی کتاب کھلی پڑی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ روکھے سوکھے بالوں والی لڑکی پیانو بجانا سیکھ رہی تھی، کیوں کہ اس نے بلا تامل "گاڈ سیودی کنگ (God Save the King) گنگنانا شروع کردیا۔

"نام؟"

بتا دیا گیا۔

"عمر؟"

"بیس برس"

"تعلیم؟"

"ایف، اے، پتا جی کی وفات کے باعث آگے نہ پڑھ سکی۔"

"شادی شدہ؟"

"جی نہیں"

اب اس نے اُچٹتی ہوئی ایک نگاہ مجھ پر ڈالی۔ پھر منہ پھیر لیا۔

"والدہ کے ساتھ رہتی ہیں"

"جی نہیں میں یہاں مسز اسمتھ لاج میں تنہا رہتی ہوں۔ نوکری کر کے ماں اور ایک چھوٹے بھائی کے گزارے کے لیے روپے بھیجتی ہوں ہر ماہ۔"

"تعلیم معمولی ہے۔" اس نے بے حس آواز میں کہا۔

"جی مجھے پڑھنے لکھنے کا بڑا شوق ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے بتایا نا کہ...... ٹائپ اور شارٹ ہینڈ جانتی ہوں۔ دو تین جگہ کام بھی کر چکی ہوں۔ چند نظمیں اور افسانے......" یہ کہہ کر میں نے بغل سے فائل نکالی۔

"آپ جاسکتی ہیں۔"

میں ہکا بکا رہ گئی۔ یہ انٹرویو تھا کہ مذاق؟"

برہم ہو کر میں واپس دروازے کی جانب بڑھی۔۔۔ گاڈ سیو دی کنگ ، اب بھی دھیمے سروں میں بج رہا تھا۔

ہر چند مجھے ملازمت کی سخت ضرورت تھی۔ لیکن اس نا خوش گوار انٹرویو کی یاد کو میں نے پہلے ہی دن بھلا دیا اور ایک مرتبہ پھر اخبار کے کالموں میں نوکری کے اشتہارات تلاش کرنے لگی۔ دوپہر کے وقت لاج کے برآمدے میں کپڑے کی آرام کرسی پر نیم دراز، میں اپنے خیالات میں محو تھی۔ دزلان پر لڑکیوں کے بیڈمنٹن کھیلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

اسی اثناء میں ڈاکیہ چٹھی لایا۔ پڑھنے پر معلوم ہوا کہ مجھے وہیں نوکری مل گئی ہے اور دوسرے روز دفتر حاضر ہونے کی ہدایت کی گئی ہے۔

بوکھلاہٹ میں مجھ سے نہ جانے کیا حرکت ہوگئی کہ جینی نے دور ہی سے ریکٹ گھما کر پوچھا: "کہو خیریت تو ہے نا"

"او ہاں ہاں ...... بالکل بالکل......"

یہ کہہ کر میں نے کمرے میں گھس کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

اول تو مجھے ملازمت ملنے کی امید تک نہیں تھی۔ دوسرے میں یہ ملازمت کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ لیکن اس موقع پر میرے لیے ایک سو پچیس روپے ماہوار کوئی معمولی رقم نہیں تھی۔ سوچا کوئی پابندی تو ہے نہیں۔ بہتر کام ملنے پر فوراً چھوڑ دوں گی...... چناں چہ

دوسرے روز ڈیوٹی پر پہنچ گئی۔

وہی انٹرویو والا کمرہ تھا اور ایک چھوٹے کتے اور گاڈ سیوی دی کنگ'' بجانے والی لڑکی کے سوا وہاں اور کوئی موجود نہیں تھا۔

میں دستانے اُتارے بغیر کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی— لڑکی کی عمر بہ مشکل تیرہ برس ہوگی۔ قد ضرور لانبا تھا۔ لبوترہ چہرہ۔ خدو خال گورا۔ پتلی پتلی ٹانگیں۔ ـ‌ان سپاٹ۔

ہماری آنکھیں ملیں تو پہلے تو میں خوب باچھیں پھیلا کر مسکرائی پھر سنبھل کر بزرگانہ انداز میں پوچھا۔ یہیں رہتی ہو۔"

''ہاں— جی''

''پڑھتی ہو؟''

''ہاں— جی''

''یہ'' میں نے خالی کرسی کی جانب اشارہ کر کے پوچھا آپ کے ...... رشتہ دار ہوتے ہیں۔

''نہیں— جی''

لڑکی کی چھوٹی بحر میں بامیں سن کر کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ جی نہیں چاہتا تھا کہ آگے کچھ سوال کروں۔ لیکن اس نے خود ہی بتا دیا'' کرایہ دار ہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے پیانو کے ایک سر پر انگلی زور سے ماری جس کی آواز دیر تک فضا میں لرزاں رہی......

''آپ آگئیں؟'' مالک نے بڑی تیزی سے کمرے میں داخل ہو کر پھرتی سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر فرمایا'' ہر روز تھوڑا سا تحریری اور ٹائپ کا کام ہوا کرے گا۔ اس کے بعد آپ چاہیں تو جاسکیں گی۔"

تھوڑا سا کام، پھر چھٹی اور پھر ہر ماہ ایک سو پچیس روپے!! معاً مجھے یوں محسوس

ہوا جیسے میں شہزادی ثریا جبیں ہوں اور حضرت الف لیلیٰ والے ہارون الرشید......

''میری جان و دل کی ملکہ'' اس نے کہا۔

میرا دل اچھل کر حلق میں آن رہا۔ میں نے سر اٹھا کر اُس کی جانب دیکھا۔ اُس کا دھیان میری طرف نہیں تھا۔ اُس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی نہا کر چلا آرہا تھا۔ چہرہ تر و تازہ تھا اور کالے اور گھنے نم دار بال خاصے دلکش دکھائی دے رہے تھے۔ میرے کانوں میں اس کے الفاظ زہر گھول رہے تھے۔ دوسرے لمحے میں اس نے سر اٹھایا اور خشک و بے کیف آواز میں پوچھا۔

''لکھ چکیں آپ؟''

''جی لکھتی ہوں'' میں نے اپنی اس غلطی کا احساس کرتے ہوئے کہا۔

''میری جان و دل کی ملکہ''

اس طرح مخاطب کیے جانے پر آپ کو حیرت تو ضرور ہوگی اور شاید آپ خفا بھی ہوں..... لیکن میں ...... میں بزدل ہوں۔ دل کی کیفیت مردانہ وار زبانی عرض نہ کرسکا اس لیے خط لکھ رہا ہوں۔ آپ کو انکار کرنا تھا اور انکار ہی کرنا ہوگا۔ اس لیے جہاں تک آپ کی ذات کا تعلق ہے آپ کو میرا طریق کار متاثر نہیں کرسکتا...... بھلا میں ہی اظہار عقیدت کرنے سے کیوں رہ جاؤں۔''

یہ ایک طویل محبت نامہ تھا جسے لکھتے لکھتے میرے پسینے چھوٹ چھوٹ گئے۔ خدا خدا کر کے یہ ختم ہوا اور میں چھٹی پا کر جو بھاگی تو اپنے کمرے میں پہنچ کر دم لیا۔

عجیب بات تھی۔ شاید مجھ سے اظہار عشق کیا جارہا تھا۔ لیکن نہیں...... بڑا پڑھا لکھا اور بھلے خاندان کا فرد معلوم ہوتا تھا۔ ممکن ہے اس کی سچ مچ کوئی محبوبہ ہو۔

سارا دن سوچتی رہی کہ پھر جاؤں یا نہ جاؤں۔ بالآخر طے کیا کہ میری بلا سے مجھے تنخواہ سے غرض ہے۔

تین دن تک ان کی شکل دکھائی نہیں دی۔ معلوم ہوا بہت مصروف ہیں۔ البتہ ان

کے چند انگریزی کے سرٹیفکٹ ٹائپ کرنے پڑے ۔ چوتھے روز صورت نظر آئی ۔ کرسی پر بیٹھتے ہی بولے'' جانِ بہار!''

میں نے پھر ٹھٹک کر ان کی جانب دیکھا۔

'' لکھ چکیں؟'' انہوں نے خشمگیں نظروں سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

''جی— بس'' میں نے جلدی سے قلم گھسیٹا۔

'' جانِ بہار!— تمہارا پیغام مجھ تک پہنچ گیا ہے۔ میرے جسم کا رواں رواں تمہارا شکر گزار ہے۔ تپتے ہوئے ریگستانوں سے بچا کر تم نے مجھے اپنی سرمئی آنکھوں کی گھنی پلکوں کے سائے تلے پناہ دی ہے......؟

اس محبت نامے کا مضمون بھی طویل تھا۔

چٹھی ختم ہونے پر انہوں نے کرخت لہجے میں پوچھا۔'' لکھ چکیں؟''

'' جی'' میں نے مرعوب ہو کر جواب دیا۔

اس رات بستر پر لیٹے لیٹے میں دیر تک اس موضوع پر غور کرتی رہی۔ آخر اس میں راز کیا تھا۔ یہ محبت نامے مجھ سے کیوں لکھوائے جا رہے تھے۔ میں اس کی ملازمہ تھی۔ اس لیے میرے لیے شکایت کی جگہ تو نہیں تھی۔ لیکن اپنی عشق بازی کے خطوط لکھواتے وقت انہیں اس بات کو محسوس تو کرنا چاہیے کہ ایک کنواری لڑکی اس قسم کی گہری راز و نیاز کی باتیں لکھنے سے قدرتاً جھجک اور شرم محسوس کرتی ہے۔

اس ادھیڑ بن میں مجھے چیخوف کی ایک کہانی یاد آ گئی جس میں ایک عورت فرضی عشاق کو خطوط لکھا کر اپنے دل کی رومانی کیفیت کی تسکین کر لیا کرتی تھی...... وہاں ایک عورت کا معاملہ تھا۔ یہاں ایک مرد تھا...... مجھے اپنے مالک سے ہمدردی سی ہوگئی۔

دو تین خط میں نے ہمدردی کے جذبے کے تحت لکھ ڈالے۔

ایک روز خط کے دوران میں انہوں نے لکھوایا۔

'' ......تمہاری سانس میں مولسری کی خوشبو آوارہ پھرتی ہے تمہارے بال کشمیر

کے کھیتوں میں اُگنے والے زعفران کے مانند ہیں۔ تمہارے رخساروں پر گلاب کھلتے ہیں۔ تمہارے ہونٹ......'' غرض اس طرح محبوبہ کا سراپا بیان کر دیا۔ لیکن یہ الفاظ اس قدر دردمندانہ انداز اور رازدارانہ مدھم آواز میں کہے گئے کہ مجھے خواہ مخواہ محسوس ہونے لگا کہ یہ سب کچھ مجھے مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے...... پہلے کبھی یہ خیال اس شدت کے ساتھ میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔

میرے دل پر بوجھ سا رہنے لگا۔ چلتے پھرتے کھاتے پیتے ہنستے بولتے دل میں دبی دبی سی آواز سنائی دے جاتی۔ ''وہ تجھے پیار کرتا ہے'' اور متضاد جذبات کے تحت کبھی ان خیالات پر میں جھنجھلا اٹھتی اور کبھی ڈھیلی پڑ جاتی۔

یہ سب باتیں میرے ذہن کی گہرائیوں میں پوشیدہ تھیں۔ میں علانیہ اُن کا اعتراف کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔

انہیں خطوط کے ذریعے سے مجھے ان کے بارے میں بہت سی باتوں کا علم ہوگیا اور بعض اوقات محسوس ہونے لگتا جیسے مجھے ان سے نامعلوم سا لگاؤ بھی ہے۔ لیکن ان باتوں سے کیا حاصل؟ ممکن ہے وہ مجھ سے چھیڑخانی کر رہے ہوں۔ یا ممکن ہے ان کی کوئی اور محبوبہ سچ مچ موجود ہو— اس خیال سے میں کچھ افسردہ ہوگئی۔

ایک روز اُنہوں نے لکھوایا...... مجھے ملازمت ملنے کی خاصی امید ہے۔ اگر میری اُمید برآئی تو پھر مجھے یقین ہے کہ تم اِدھر اُدھر ملازمت کرنے کے عوض ایک معزز مرد کی بیوی بننا پسند کرو گی......''

یہاں پہنچ کر میرا ہاتھ رک گیا۔ گال تمتما اٹھے۔ جی میں آئی کہ رائٹنگ پیڈ حضرت کے منہ پر دے ماروں...... مگر اس کا چہرہ پتھر کے مانند بے حس اور جامد تھا۔

میں نے تہیہ کرلیا کہ فوراً ملازمت ترک کردوں گی۔

گھر پہنچی تو گئی رات تک سوچتی رہی...... ماں کی باتیں یاد آئیں کہ بیٹی! اگر تیرا ایک بھائی ہوتا تو باپ کے بعد تیری زندگی بھی سدھر جاتی اور میری مٹی بھی ٹھکانے لگ

جاتی۔ میں نے کہا، ماں! میں آپ کے لیے کماؤں گی۔ ماں بولی۔ نوجوان بیٹی کی کمائی بڑی خطرناک چیز ہے ہمارے سماج میں......

صبح ہونے تک میں نے ہتھیار ڈال دیئے اور بلا چوں چراں کیے بر وقت دفتر پہنچ گئی...... لیکن مسلسل چار دن تک جناب کی صورت دکھائی نہیں دی۔ البتہ چند فضول کاغذ ٹائپ کرنے کو مل جاتے تھے۔

پانچویں دن صورت دکھائی دی۔ حسبِ عادت کچھ بولنے کی بجائے چپ ہو کر بیٹھ گئے۔ میں بھی حسبِ معمول سر جھکائے بیٹھی تھی۔ مسلسل سکوت سے گھبرا کر میں نے کن انکھیوں سے میز پر دھرے ہوئے گورے مردانہ ہاتھ کی جانب دیکھا۔ میں اس ہاتھ سے کافی مانوس ہوچکی تھی۔

بالآخر انہوں نے مہرِ سکوت کو توڑا۔

" آپ کا مہینہ پورا ہوچکا ہے۔ میں نے خود ملازمت اختیار کرلی ہے۔ میں یہاں سے آج ہی چلا جاؤں گا۔ آپ اپنی تنخواہ لیتی جایئے گا۔"

میں چپ رہی۔

" میری گڑیا!" انہوں نے کہا۔

میں نے چپ چاپ لکھنا شروع کردیا۔

" میری گڑیا! " انہوں نے پھر کہنا شروع کیا۔ "اُداس مت ہو۔ اب ہم ایک دوسرے کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں۔ تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے......"

اس طرح وہ گہری ہمدردی اور پیار کے الفاظ لکھواتے چلے گئے۔ آخر یہ خط ختم ہوگیا۔

اُنہوں نے نوٹوں کا ایک پلندہ بڑھا دیا۔ جسے میں نے چھوا تک نہیں۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور قدرے تامل کے بعد بولے۔ "اچھا گڈ بائی۔"

وہ اندر چلے گئے— اور میرا کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا— سچ سچ ان خطوط کی

ہیروئن کوئی اور لڑکی تھی۔

میں ڈھیٹ بنی بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ روکھے بالوں والی لڑکی نے آکر کہا۔" وہ کہتے ہیں کہ اب آپ جا سکتی ہیں۔"

میں نے لرزتے ہوئے ہاتھ سے نوٹوں کی گڈی اٹھائی اور لڑکھڑاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی...... تو یہ خواب تھا محض خواب!!

میں نے ہزار دل کڑا کیا، لیکن دوپہر کا کھانا نہ کھا سکی اور پھر میرے قدم خواہ مخواہ اپنے دفتر کی جانب بڑھنے لگے۔ بہانہ معقول تھا۔ مہینہ بھر کام کرنے کے بعد سرٹیفکٹ لینے کا حق تو پہنچتا تھا مجھے۔

ڈگمگاتے قدموں سے دروازے کے نزدیک جاکر دستک دی۔ کوئی سننے والا نہیں تھا۔ دوبارہ سہ بارہ دستک دینے پر دروازہ کھلا اور روکھے بالوں اور سپاٹ جسم والی لڑکی کی صورت ایک بار پھر دکھائی دی۔ ناک چڑھا کر بولی۔" آپ؟"

"ہاں— ان سے کام ہے ذرا......"

"وہ تو چلے گئے۔"

میرا دل بیٹھ گیا۔" سامان بھی لے گئے۔"

"ہاں۔"

میں لوٹی تو مجھے خشک ہونٹوں پر پھیلتی ہوئی تلخ اور دردناک مسکراہٹ کا احساس ہوا۔ ساری شام اِدھر اُدھر سرگشت کرنے میں گزار دی۔ تھک گئی تو پارک میں بچھی ہوئی بینچ پر جا بیٹھی۔

نہ جانے کب تک بیٹھی رہی۔ لیکن جب مجھے احساس ہوا کہ ہر چہار جانب تاریکی چھا گئی ہے اور چند کالجیٹ بالوں کو کھینچ کر پیشانی پر ڈالے بزعم خود دلیپ کمار بنے میرے اردگرد چیترے بدل رہے ہیں تو میں نے گھر کا رخ کیا۔

مسز اسحٰق لاج، کوٹھی کی شکل کی عمارت تھی۔ میرا کمرہ پچھواڑے کی جانب تھا۔

سب لڑکیاں اپنے اپنے کمروں میں دبکی پڑی تھیں۔ سردی کے مارے۔

جب میں نے تالا کھولنے کو چابی بڑھائی تو دیکھا کہ تالا ٹوٹا پڑا ہے۔ میں سر سے پاؤں تک لرز گئی۔

قریب تھا کہ میری چیخ نکل جائے کہ کمرے میں برقی روشنی دکھائی دی۔

جرأت سے کام لے کر میں آگے بڑھی۔ جھانک کر دیکھا تو اُنھیں حضرت کو سوٹ کیس اور بستر سمیت کرسی پر براجمان پایا۔ میں نے ایک دھچکے سے دروازہ پورا کھول دیا اور تعجب سے پوچھا۔ ''آپ گئے نہیں؟''

اُس نے سگرٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے جواب دیا۔

''جاتا کیسے، میرے پاس کرائے تک کو دام نہیں بچے۔''

میں نڈھال ہو کر دروازے کے قریب ہی کھڑی رہ گئی۔

اُس نے پہلی بار مسکراتے ہوئے پوچھا۔ کرایہ دے دو گی نا؟''

میری آنکھیں پر آب ہوگئیں اور میں نے جلدی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بھرّائی ہوئی آواز میں ہکلا کر جواب دیا۔

''ہاں—''

یہ افسانہ 'آج کل دہلی' افسانہ نمبر مارچ 1952 میں پہلی بار شائع ہوا۔ افسانوی مجموعہ پہلا پتھر میں شامل ہے۔

کلی کی فریاد

برات آنے کو تھی—
جب کہ سکھیوں کے نقرئی قہقہے فضا میں جل ترنگ کے مانند گونج رہے تھے۔
سلیمہ اپنے دونوں گھٹنوں کو سڈول بازوؤں میں جکڑے اور ان میں چہرہ چھپائے بیٹھی تھی۔

نازک شاخ پر کھلے ہوئے مہکتے لہکتے ہوئے خوش رنگ پھولوں کے مانند سہیلیاں لٹک مٹک کر آپس میں چہل کر رہی تھیں۔ ان کی محفل میں سلیمہ سب سے الگ تھلگ، گم سم اور غافل دکھائی دیتی تھی لیکن درحقیقتِ وہ ہر بات سن رہی تھی...... اس کا دل سطحِ آب پر لرزاں کنول کی طرح ہچکولے لے رہا تھا۔ اور اس کے جسم کا انگ انگ ساجن ملن کے گیت گا رہا تھا۔

بڑی بڑی سیپیوں کے سے پپوٹوں تلے اس کی سیاہ پتلیاں گویا انگوری شراب کی چادر تانے ہر شے کو خواب ناک کیفیت میں ڈوب کر دیکھ رہی تھیں...... خرگوش کے بچوں کے مانند اُجلے اُجلے اس کے پاؤں آمدِ شباب کے باعث گدرائے ہوئے ٹخنے اور ٹخنوں میں سے گلابی بادلوں کی طرح جھوم کر اٹھی ہوئی اُس کی پنڈلیاں...... اور وہ جھینپ گئی...... اس کا دل سینے میں زور زور سے دھڑکنے لگا...... اس نے اور زیادہ جھینپ کر آنکھیں موند لیں۔

خوش گوار لمحہ قریب سے قریب تر آ رہا تھا۔ اس لمحے کا اس کے مجبور دل کو مدت سے انتظار تھا۔

اس نے آنکھیں بند کیں۔ اُس نے دیکھا کہ عرشِ بریں کا ایک ایسا گوشہ ہے جہاں ایک پروقار پہاڑ کی طویل و عریض ڈھلان پر لہلہاتی گھاس کی سبز چادر بچھی ہے۔ نور کے درختوں کی شاخیں فضا کی رفعتوں میں گم ہو رہی ہیں۔ رنگ رنگ کے پھول جھلملا رہے ہیں اور وہ تن تنہا ان رنگین پیڑوں کی چھاؤں تلے کھڑی ہے۔ اس کے بدن کے گرد ایک مہین چادر لپٹی ہوئی ہے جس میں سے اس کا بدن جگمگا رہا ہے۔ اور جسم کے روئیں روئیں سے فضا میں پرواز کرجانے کی امنگ پیدا ہوئی لیکن بارِ حسن سے بوجھل اس کا نازک بدن اڑان کے قابل کہاں تھا۔ البتہ جب وہ قدم قدم چلنے لگی تو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا ہر قدم ایک انوکھا رقص پیش کر رہا ہے۔

اس طرح سے سبک رفتاری سے نہ جانے وہ کہاں سے کہاں نکل گئی۔ دفعتاً آہٹ پاکر اس کے پاؤں بوجھل ہو کر رک گئے...... اس کی بڑی بڑی آنکھوں کی پتلیاں حیرت و خوف کے ملے جلے جذبات کے تحت دائیں بائیں اوپر تلے گھومنے لگیں۔ معاً اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے داب لیا اور لمحہ بھر کو بت بن کر کھڑی ہوگئی۔

مرد!— ضرور کوئی مرد اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ یہ خیال آتے ہی وہ سر سے پاؤں تک لرز گئی اور پھر دفعتاً وحشی ہرنی کے مانند قلانچ مار کر بھاگ نکلی۔ اس کا بدن اس قدر سبک تھا کہ وہ ڈھلان سے آگے ہرے بھرے کھیتوں میں فراٹے بھرنے لگی۔

وہ خوف زدہ ضرور تھی لیکن بے حد خوش— وہ اتنی آسانی کے ساتھ اس قدر تیزی سے بھاگ سکتی تھی۔ اس رفتار سے تو وہ بڑے مزے میں عرش کے دوسرے سرے تک بھاگی چلی جائے گی اور وہ نگوڑا مرد اس کی گرد کو بھی نہ پاسکے گا...... لیکن وہ نگوڑا تو گویا قدم سے قدم ملائے اس کے عین پیچھے پیچھے بھاگا چلا آرہا تھا...... دھما دھم، دھما دھم...... اس کے قدم آگے بڑھ رہے تھے، اور کبھی تو وہ یوں محسوس کرنے لگتی ہے جیسے وہ ہاتھ بڑھا کر بڑی آسانی سے اسے دبوچ سکتا ہے لیکن شاید وہ جان بوجھ کر ایسا کرنے سے گریز کر رہا تھا جیسے وہ مسکرا کر کہہ رہا ہو۔ ”بھاگ لے جتنا بھاگنا چاہے۔ آخر کار

تھک کر تو خود بخود میری آغوشِ محبت میں آن گرے گی۔''...... سچ مچ وہ تکان محسوس کرنے لگی تھی۔ کھیتوں کے سلسلے پار کر کے اب وہ ایک گھنے جنگل میں گھس آئے تھے۔ وہاں کے پیڑ کچھ اس قسم کی مہک پھیلا رہے تھے کہ انسان پر خواہ مخواہ غنودگی طاری ہونے لگتی تھی...... وہ تھک کر نڈھال سی ہوگئی۔ آخر وہ بہت بھاگ چکی تھی۔ زخمی مرغابی کی طرح کبھی اس درخت کے پیچھے چھپ جاتی اور کبھی اس جھاڑی کی اوٹ میں جا چھپتی لیکن اجنبی نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

اس طرح بھاگتے بھاگتے اس نے سوچا کہ وہ ذرا ہمت سے کام لے کر تیزی سے بھاگ نکلے۔ اور اس کی نظروں سے اوجھل ہو کر کسی درخت کی اوٹ میں چھپ جائے تو ایسے گھنے جنگل میں وہ مرد اسے کیوں کر پا سکے گا۔

یہ سوچ کر اس نے ایک بار پھر کمر ہمت باندھی اور پھرتی سے بھاگ نکلی۔ اس کا خیال درست ثابت ہوا۔ سچ مچ اب اُس کے پیچھے قدموں کی چاپ ختم ہو چکی تھی۔ وہ ایک بہت بڑے درخت کے نیلگوں تنے سے بغل گیر ہو کر ہانپنے لگی۔ وہ چھپنے میں کامیاب ہوگئی تھی لیکن وہ یہ فیصلہ نہ کرسکی کہ اس بات پر وہ خوش ہو کہ رنجیدہ۔

دم بھر کر وہ بالکل ساکت کھڑی رہی۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کا ذہن ہر خیال سے خالی ہے۔ پھر معاً پیڑ کے تنے سے لپٹے ہوئے اس کے بازو میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی...... اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کی انگلی سے اُنگلی چھو دی ہو۔ اس کے ہاتھ پاؤں کی طاقت سلب ہو کر رہ گئی۔ جب اُس نے بڑی آہستگی کے ساتھ ہاتھ کھینچنا شروع کیا تو دیکھا کہ دوسرا مردانہ ہاتھ اس کے تعاقب میں آگے بڑھ رہا ہے۔ اس نے آنکھیں جھکالیں۔ دیکھا کہ باریک کپڑا اس کے بدن سے الگ ہو کر نیچے گر پڑا ہے اور اس کا آنچل اس کے بازو سے الجھا ہوا ہے۔ اپنے آپ کو اس حالت میں پا کر وہ بڑی شرمسار تھی لیکن اس کے بدن میں حرکت کرنے کی سکت تک باقی نہیں تھی۔

کن انکھیوں سے اُس نے تعاقب کرنے والے مرد کی جانب دیکھا......

یہی وہ چہرہ تھا جسے ایک بار مردوں کے ہجوم میں دیکھ کر اُس نے اپنا لیا تھا۔

اسے پہلی نظر ہی میں محبت نہیں ہوگئی تھی۔ بلکہ اسکول آتے جاتے وہ اس چہرے کو منتظر پاتی تھی۔ پہلے تو اسے خیال تک نہیں آیا کہ وہ اسی کا انتظار کیا کرتا ہے۔ لیکن جب اُسے یہ احساس ہوا تو وہ بہت پریشان ہوئی۔ لیکن رفتہ رفتہ کچھ ایسی مانوس ہوئی کہ اگر کسی روز وہ دکھائی نہ دیتا تو اسے الجھن ہونے لگتی۔ بعد ازاں وہ سوچنے لگی کہ وہ اس سے کچھ کہتا کیوں نہیں۔ اس پر وہ اداس سی رہنے لگی۔ اس نے دل ہی دل میں اس سے بہ منت تمام کہا کہ اگر تم مجھ سے دو باتیں کر لوگے تو میں ہمیشہ کے لیے تمہاری ہوجاؤں گی...... لیکن جس روز وسیم نے بات کرنی چاہی اس روز اس کی زبان گنگ ہوگئی اور وہ ہانپتی کانپتی گھر جا پہنچی اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا کر رہ گئیں۔

جب اس کی شادی کی بات چیت شروع ہوئی تو اس نے اپنی پھوپھی کو راز داں بنایا۔

پھوپھی ان پڑھ ضرور تھی لیکن زمانے کی ہوا کو خوب سمجھتی تھی۔ اس نے خود لڑکے کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور ایک روز اپنے بھائی یعنی سلیمہ کے بابا سے ٹکر لے لی۔

سلیمہ کے بابا جی کسی تھیڑیکل کمپنی کے پارسی مالک کے مانند دکھائی دیتے تھے۔ حالاں کہ ان کا ناٹک ڈرامے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن ان کی باتیں حرکات و سکنات تھیٹر کے ایکٹروں سے ملتی جلتی تھیں۔ آواز گرج دار اور لہجے سے مبالغہ آمیز وقار ٹپکتا تھا۔ بہن کی بات سن کر گرجے۔

”وہ کل کی چھوکری کیا جانے ان باتوں کو؟ کیا اب وہ ہم سے زیادہ سمجھ دار ہوگئی ہے؟ کیا وہ بھول گئی ہے کہ ان کو سوچے سمجھے اور اس بارے میں فیصلہ کرنے والے اس کے والدین ابھی زندہ و سلامت ہیں...... کیا......؟“

ہوا میں ہاتھ اُچھال اُچھال کر تھیٹریکل انداز میں نہ جانے وہ اور کیا کیا کہتا کہ بڑی بہن روک کر بولی۔

''اے بس رہنے دو۔ تم تو یوں چلانے لگتے ہو جیسے کہیں لام لگ گئی ہو۔ باتیں دنیا بھر کی سن لو لیکن زمانے کی ہوا کو نہیں سمجھتے۔''

اس پر سلیمہ کے بیا نے بہن کی جانب انگلی کا اشارہ کچھ اس انداز سے کیا جیسے بھالا تان کر مارنے کو ہو۔

''تو بڑھیا...... سٹھیا گئی ہے۔ میں ؟ ...... میں جس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے زمانے کی ہوا کو نہیں سمجھتا...... اور تو؟ ......تو گھر بیٹھے زمانے کی ہوا کو سمجھنے لگی ہے؟

سبحان تیری قدرت ، سبحان تیرے کھیل
چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل

باوجود یہ کہ بہن کو دنیا کھلے بندوں ''پدی'' کے نام سے پکارتی تھی لیکن بھائی کے منہ سے چھچھوندر والی بات سن کر وہ آپے سے باہر ہوگئی۔ اور ہاتھ پر ہاتھ مار کر اور ٹھینگا دکھا کر بولی:

'' بھاڑ میں جائے تمہاری بیت بازی۔ صورت تو دیکھو گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والے کی۔ آج تو مجھے چھچھوندر بنا کر پیچھا چھڑا رہے ہو لیکن یاد رکھو وہ دن دور نہیں جب خود بھی نکو ہو جاؤ گے۔''

اس پر بھائی ایک دم پلٹ کر تیزی سے چلتا ہوا کمرے کی دیوار کے قریب پہنچ کر اس انداز سے رکا جیسے اگر آگے دیوار نہ ہوتی تو وہ ابد تک آگے بڑھتا چلا جاتا۔ وہاں اس نے کندھوں کو حرکت دے کر ہلکے ہلکے دو تین گھونسے دیوار پر مارے اور بہن سے آنکھ ملائے بغیر بولا۔

''اچھا وہ ہے کون؟''

'' آدمی ہے اور کون۔'' بہن نے چہک کر جواب دیا۔

بھائی نے بے صبری سے چٹکیاں گھما کر آسمان کی جانب دیکھا اور بولا:
"شکر ہے، شکر ہے انسان ہے گھوڑا یا گدھا نہیں۔"
کمرے میں قدرے سکوت طاری رہا۔
"اس کا نام؟"
"پریم"
"آہا— پریم کا ساگر پریم کی نیا
پریم کے چپو، پریم کھویا
ہاں تو کام؟"
"نوکری"
"کیسی نوکری؟"
"سرکاری۔"
"کلرک ہوگا؟"
"ہاں"
"میں پہلے ہی جانتا تھا۔"
"کیا کہنے۔"
باپ کیا کرتا ہے"
"باپ نہیں ہے۔"
"ماں؟"
"ماں بھی نہیں ہے۔"
"گویا پریم ہی پریم ہے۔"
"لڑکا ہیرا ہے ہیرا۔"
"اجی چھوڑو"

''وہ مقابلے کے امتحان میں پاس ہوگیا ہے۔ اب بڑی ترقی پائے گا۔''

''امتحان کیسا؟''

''اب میں یہ کیا جانوں''

''بڑھیا دیکھ کر بے وقوف بنایا ہے کسی نے۔''

یہ سن کر بہن ہاتھ کا پنجہ دکھاتے ہوئے بولی۔

''دیکھو بھیا! مانا تم سیانے اور سمجھ دار ہو لیکن میں تمہیں ایک نصیحت کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ وہ یہ ہے کہ چاہے دنیا میں انسان کے لیے ہوشیار اور چالاک بننا کتنا بھی ضروری کیوں نہ ہو لیکن پھر بھی زیادہ چالاک بننے سے اُلٹا نقصان ہوتا ہے......''

اس پر جس انداز سے سینہہ کا بچا سینہ پھلا کر غرایا اور ڈکرایا۔ اس کی نقل اُتارنے میں سینہہ کی چہیتی سہیلی شیاما کو کمال حاصل تھا چناں چہ وہ بڑے مزے مزے میں ان باتوں کو دوہرا رہی تھی اور سکھیوں کی محفل میں اس کی نقرئی آواز گونج رہی تھی۔

شیاما کا رنگ سانولا تھا اور خد و خال گوارا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی شخصیت میں بلا کی دل کشی تھی۔ وہ پھلجھڑی کی طرح ناچتی کودتی مندرجہ بالا گفتگو دہرا رہی تھی۔ اور باقی لڑکیاں مارے ہنسی کے لوٹن کبوتر بنی جا رہی تھیں۔

''اچھی شیاما! بتاؤ پھر کیا ہوا؟'' ایک سہیلی نے اس سے دریافت کیا۔

''شیاما اپنی دو لمبی چٹیا لہرا کر دو قدم پیچھے ہٹی اور اس نے آنکھیں مٹکا کر تامل کیا تو ساری سہیلیاں اشتیاق سے پوچھنے لگیں۔'' ہاں ہاں اچھی شیاما! کہونا— پھر کیا ہوا؟''

اس پر شیاما ہنسی اور اس کے کلّے سے گال تمتما اٹھے۔'' پھر؟''

''پھر پدی نے پدے کو کردیا چت۔''

شریر شیاما نے ہاتھ سے بھاؤ بتا کر اس انداز سے یہ بات کہی کہ محفل میں

قیامت کا شور مچ گیا۔ اور پھر قہقہوں کا شور مسلسل نغمہ بن گیا۔

صرف سلیمہ سکھیوں کی ان خوش گپیوں سے بہت دور تھی۔ وہ اب بھی پیڑ کے نیلگوں تنے سے لگی کھڑی تھی۔ ساجن کے چہرے کو ایک بار دیکھ کر اسے پھر نظر ملانے کی جرأت نہیں ہوسکی۔ اُس کے پاؤں زمین میں گڑ گئے تھے۔ اس کا ذہن لمحہ بھر کو مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ لیکن جب ذہن سوچنے کے قابل ہوا تو وہ عجب تذبذب میں پڑ گئی۔ آخر وہ ایسی حالت میں پریتم کے قابو میں کیسے آ گئی۔ کتنی بری بات ہے۔ ایک نظر پھر اپنے بدن پر ڈال اس نے آنکھیں موند لیں۔

"سلیمہ" بالکل نئی آواز میں اپنا نام سن کر اس کا بدن تھرا گیا۔

"سلیمہ" پھر آواز آئی۔" تم مجھ سے پرے بھاگ رہی ہو۔ تم مجھ سے دور ہٹ رہی ہو۔ میں بہت دکھی ہوں...... میں بے حد پریشان ہوں۔"

نہیں نہیں...... سلیمہ نے دل ہی دل میں کہا اور پلٹ کر پریتم کے گلے سے لپٹ گئی۔

معاً برات آگئی، برات آگئی ، کا شور بلند ہوا۔ وہ چونکی اور دیکھا کہ اس کی سہیلیاں دولھا دیکھنے کے اشتیاق میں ایک دوسرے کے اوپر گرتی پڑتی بھاگی جارہی ہیں۔ ہائے! اُس کی کتنی خواہش تھی کہ وہ بھی اپنے پیارے کو گھوڑی پر سوار دیکھ سکتی......

باجوں کا شور اور بھی قریب سنائی دینے لگا۔ برات دم بدم بڑھتی آرہی تھی۔

سلیمہ بالکل تنہا بیٹھی تھی۔

معاً چند آوازیں سنائی دیں۔

"دولہا تو کوئی اور آدمی ہے۔"

جب پڑ ی نے بھائی سے کہا۔

" تم نے بڑا دھوکا دیا ہمیں۔ ہائے اب نہ جانے معصوم لڑکی کیا کرے گی۔" تو

چڑے نے شرارت سے گھنی مونچھوں کو جنبش دے کر جواب دیا۔

"کرے گی کیا—؟ رانی بن کر راج کرے گی۔"

سفیہ نے نازک کلیوں کے مانند اپنے نیم وا ہونٹوں کو جن میں سے موتی جھلک رہے تھے آنسو پی جانے کی ناکام کوشش میں زور سے بھینچ کر بند کر لیا۔

یہ افسانہ 'آج کل دہلی' جون 1952 میں پہلی بار شائع ہوا۔ افسانوی مجموعہ پہلا پتھر میں شامل ہے۔

حدِ فاصل

میں

میں یوں تو یوپی کا رہنے والا ہوں یا یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ میرے آباء و اجداد یوپی کے رہنے والے تھے میں بچہ ہی تھا جب میرے والدین امرتسر میں آ کر آباد ہو گئے۔ زمانہ گزر گیا۔ میرے والدین اللہ کو پیارے ہو چکے اور میں اللہ کو پیارا ہونے کو ہوں۔ کیونکہ میری عمر اسی کے لگ بھگ ہے۔ دھیان کیجئے پچھلی صدی کی پیداوار ہوں، 1947 آن پہنچا ہے۔

میری والدہ تو کابل والوں سے ناطہ جوڑا کرتی تھیں۔ شاید اسی رعایت سے میرے والد خشک میوہ جات کا کاروبار کرتے تھے۔ انہوں نے خوب روپیہ کمایا، جائیداد پیدا کی۔ مجھے تعلیم دلائی۔ اتفاق سے مجھے پڑھنے لکھنے سے دلی لگاؤ تھا۔ والدین نے کبھی دخل نہیں دیا چنانچہ میں نے اعلیٰ تعلیم پائی۔ گورنمنٹ کی ملازمت اختیار کی اور اپنی دو بیٹیوں کی شادیاں کر کے انہیں اپنے اپنے گھر بسایا۔ ایک لڑکا ہے وہ سرکاری ملازمت کرتا ہے..... اور میں اپنے آبائی مکان میں اپنی چھوٹی بیوہ بہن کے ساتھ رہتا ہوں۔ وہ

بھی کافی ضعیف ہے۔ مجھ سے آٹھ ہی برس چھوٹی ہوگی۔

یہ سب تفصیلات بے کیف ہیں، اور کسی حد تک غیر ضروری بھی۔ اسی لیے میں نے اس قدر اختصار سے کام لیا ہے نیز دیگر رشتے داروں کے نام گنوانے سے احتراز کیا ہے۔

ہمارے مکان میں ایک ہی خوبی ہے جو مجھے پسند ہے یعنی اس کی کشادگی! محلّہ ایسا کہ مکان ایک دوسرے میں بری طرح سٹے ہوئے ہیں۔ ہمارا وسیع مکان بھی متعدد گھروں سے سٹا ہوا ہے لیکن ان کا زور تو باہر ہی ختم ہوجاتا ہے۔ اندر بس ہم ہیں اور ہمارا مکان۔ میرے والد صاحب نے اسے چالیس برس پہلے بنوایا تھا اکثر کہا کرتے تھے کہ جب مکان بنواؤں گا تو ایسا کہ نوابوں کے محل رشک کریں۔ ہمارے مکان تک پہنچ کر گلی ختم ہوجاتی ہے۔ اسی لیے ہمارے مکان کے ایک جانب تو گلی ہے اور دوسری جانب کھلا میدان۔ جہاں جا بجا کوڑے کرکٹ کے ڈھیر تو ضرور نظر آتے ہیں لیکن پھر بھی میدان تو ہے۔ شہر کے کچھ لڑکے وہاں کرکٹ، فٹ بال یا ہاکی وغیرہ کھیلنے کو جمع ہوجاتے ہیں۔ اور آگے پانی کا جوہڑ ہے اور بھی پرے سکھ بھائیوں کا چھوٹا سا گوردوارہ ہے۔

ہمارے صحن میں گائے بندھی رہتی ہے، جس کی ساری خدمت میں خود کرتا ہوں۔ جانور کی نگہداشت ایک انسان سے بھی زیادہ کرنی پڑتی ہے۔ مجھے اس کام سے دلچسپی بھی ہے ایک تو میری ورزش ہوجاتی ہے۔ آخر اس بڑھاپے میں ڈنڈ پیلنے سے تو رہا۔ البتہ دودھ دینے والی بے زبان گائے کی نگہداشت کرنے میں جسمانی فائدے کے علاوہ دل کو بھی اطمینان سا ہوتا ہے۔ ہمارے صحن میں خاصی رونق رہتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں گوشوں پر دو کنویں بنے ہوئے ہیں۔ ایک ہندو کا اور ایک مسلمان کا۔ یہ تقسیم ایک پڑھے لکھے انسان کو بے ہودہ سی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے یہاں بظاہر ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس اس کی حیثیت ایک رواج کی سی ہے۔ بے ضرر رواج۔ لطف یہ ہے کہ دونوں کنویں ایک مسلمان کے بنوائے ہوئے ہیں۔ یعنی میرے والد صاحب کے۔ سب انہیں سائیں دے کھوہ، کے نام سے پکارتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو

مسلمانوں کو پانی کے معاملے میں پرہیز نہیں ہے۔ جب مسلمان کنویں پر بھیڑ ہوتی ہے تو مسلمان ہندو کنویں کا پانی بخوشی قبول کر لیتے ہیں۔ گو وہ کنویں پر نہیں چڑھتے کوئی ہندو ہی پانی ڈال دیتا ہے۔ مسلمان ہندو کی الگ پانی والی ضد پر پیار سے صاد کر دیتے ہیں۔ سکھ بھی ہندو کنویں کا پانی پیتے ہیں۔ تو کیا ہوا یہ بھی داڑھی دار ہندو ہی تو ہیں۔ آپ ان کنوؤں کی رونق کا اندازہ نہیں لگا سکتے ہیں۔ ان چاروں طرف سے ڈھکے ہوئے کنوؤں کا پانی بہت صاف ستھرا اور میٹھا ہوتا ہے۔ عورتیں، بچے جوان سب یہاں پر جمع ہوتے ہیں۔ کنوؤں کے آہنی چرکھڑوں کی آواز ہوتی تو بے ہنگم ہے لیکن پھر بھی فضا مترنم سی ہوجاتی ہے۔ وہاں پر جو شور وغوغا اٹھتا ہے وہ بھی بے تکا سہی لیکن انسان ان بے ضرر آوازوں سے دور رہ کر بھی تو پریشان ہوجاتا ہے۔

یہاں سب لوگ مجھے سائیں جی کہتے ہیں حالانکہ میں گنڈے تعویذ نہیں بانٹتا۔ لیکن وہ مجھے احترام کے مارے اس نام سے پکارتے ہیں۔ میرا لباس بھی کچھ اسی قسم کا ہوتا ہے ململ کا کرتا، سبز یا نیلے رنگ کا تہمند، پاؤں میں چپل، ہاتھ میں لمبا موٹا ڈنڈا۔

شاید آپ سوچیں کہ شامِ زندگی کے دھندلکے میں ایک انسان کے لیے اس دنیا میں کیا رہ جاتا ہے...... لیکن ذاتی طور پر زندگی کے اس دور کے ایک ایک لمحہ سے لطف اندوز ہوتا ہوں ایک ایک ذرّے کو زندگی کا جز سمجھ کر اس کے مزے لوٹتا ہوں۔ درست ہے کہ اب وہ شباب کی سی تیزی نہیں۔ حسین صورتوں کو دیکھ دل اچھل اچھل نہیں پڑتا۔ مزاج میں وہ تندی نہیں جو فلک بوس پہاڑوں سے ٹکر لینے پر اکسائے لیکن وہ نرمی ضرور ہے جو قدرت کے ہر آن بدلتے ہوئے ہر رنگ کو چوم لیتی ہے۔ بڑھاپے میں اگر انسان مریض بن کر نہ رہ جائے تو دماغ جوانی کے جوش وجنون اور جسم شباب کی تیزی وطراری سے محروم ہو کر عجیب ہلکے پن کا احساس کرتے ہیں۔ میرا تجربہ یہی ہے کہ ایک سنبھلا ہوا بڑھاپا بعض لحاظ سے جوانی پر فوقیت رکھتا ہے۔

میں اپنی عمر کے اعتبار سے خاصہ تندرست ہوں۔ میری بازوؤں میں وہ طاقت اور

دماغ میں وہ جودت نہیں ہے لیکن زندگی کسی لحاظ سے بھی ناقابل برداشت نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ میں اب اداکار سے زیادہ تماشائی ہوں۔ لیکن فی الحقیقت تماشائی ہونا بھی اتنا برا تو نہیں ہے۔

میں چھوٹے موٹے کام کاج میں لگا رہتا ہوں۔ کبھی تصنیف و تالیف کا شوق تھا اب صرف پڑھتا ہوں۔ لکھتا ہوں تو محض خطوط۔ رشتہ داروں کو ہی نہیں بلکہ اپنے دوستوں کو بھی۔ رشتہ داروں کو تو رسمی خطوط لکھنے ہوتے ہیں لیکن دوستوں کو خطوط لکھنے میں مجھے خاص طور سے بہت مزہ ملتا ہے۔

اوپر کی منزل کا ایک کمرہ میں نے اپنے لیے مخصوص کر لیا ہے۔ اس کی دو کھڑکیاں گلی کی جانب کھلتی ہیں اور دو مکان کے پچھواڑے والے میدان کی طرف۔ اگر مجھے میدان کے مناظر سے لطف اندوز ہونا ہوتا ہے تو میں بازو والی اونچی کرسی پر تکیوں کے سہارے نیم دراز ہو کر ٹانگیں کڑا کر پاؤں کھڑکی میں ٹکا دیتا ہوں۔ اور اگر مجھے گلی کی ہنگامہ آرائیوں کا مزہ لینا ہو تو میں ایک نیچی سی کھڑکی کے قریب ایک دبی دبی سے طویل آرام کرسی پر دراز ہوجاتا ہوں۔ اکثر آنکھیں موندے رہتا ہوں کیونکہ گلی کے ہر مکان، ہر موڑ، ہر اینٹ غرض ہر منظر سے بخوبی واقف ہوں۔ سب مرد، عورتوں، بچوں بوڑھوں کو جانتا ہوں۔ ہندو سکھ مسلمان۔ ان میں سے شاید میرا ہم عمر ایک بھی نہیں۔ محلے کے اکثر بوڑھے بھی مجھ سے بیس بائیس برس چھوٹے ہیں۔ میں ان سب کی صورتیں اور آوازیں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ سارا سارا دن گلی محلے میں جو جو کچھ ہوتا ہے میں اس سے سالہا سال سے واقف ہوں۔ نیچے گلی میں زیادہ تاک جھانک کرنا مناسب نہیں سمجھتا اور ضرورت بھی کیا ہے۔ میں آواز سن کر بتا سکتا ہوں کہ کون بول رہا یا بول رہی ہے۔ ان کی کارآمد اور بے کار باتیں، ان کے پیار اور لڑائیاں، ان کے دکھ اور سکھ سبھی سے میں واقف ہوں۔ نہ جانے کیسے اور کیوں؟ کبھی کبھی تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ سب میرا ہی خاندان ہے۔ ہندو، سکھ اور مسلمان۔ عورتیں مرد، بچے بچیاں۔ ان کے دکھوں اور

سکھوں سبھی میں میرا ساجھا ہے۔ چنانچہ گلی وانی ٹھڑکی کے قریب جب میں آنکھیں موندے گلی، محلے والوں کی باتیں سنتا ہوں تو کبھی آپ ہی آپ مسکرانے لگتا اور کبھی آنکھیں بھر آتی ہیں۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں سن 1947 کا آغاز ہے۔ ماہ فروری کی چار تاریخ کو میں اسی برس پورے کرلوں گا۔ موت کو، ایک ساتھی، ایک مونس، ایک غمخوار کی طرح بہت قریب پاتا ہوں۔ ہوسکتا ہے وہ مجھے آج یا کل گلے لپٹا لے۔ ہوسکتا ہے وہ مجھے اور دس بارہ برس آزاد چھوڑ دے۔ خواہ کچھ بھی ہو، میں چاہتا ہوں کہ میں اس محلے کو اپنے اس خاندان کو اپنے اس قبیلے کو اسی طرح ہنستے بولتے، چہکتے، گاتے دیکھتا رہوں...... آخری دم تک۔ اس وقت تک کہ جب ایک صبح ہندو کنویں اور مسلمان کنویں پر جمع ہونے والی عورتیں ناک پر انگلیاں رکھ کر ایک دوسرے سے کہیں "اری سنا! اپنے سائیں جی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ دنی جسنے کی بے بے......" یا کوئی اکھڑ سکھ دوسرے سکھ سے کہے۔ "اوہ جی اپنے سائیں جی، ساریاں دے سانجھے سائیں جی، اکال چلانا کر گئے نے جی......" لیکن کیا اس بوڑھے کی یہ چھوٹی سی تمنا پوری ہوجائے گی۔ ہر تمنا کتنی چھوٹی سی ہوتی ہے، نرم و نازک، رنگین، لاچار...... ایک تیتری کی طرح، لیکن کچلے جانے پر یہی ننھی سی تمنا کتنا بڑا المیہ بن جاتی ہے۔

ڈرتا ہوں کہیں ایسا نہ ہوا تو پھر؟ ملک کی فضا مکدر ہو رہی ہے۔ ہندوستان بھر میں ایسے ایسے واقعات پیش آرہے ہیں جو پہلے کبھی سنے نہ دیکھے۔ مدت سے میں نے اخباری ہنگاموں سے دل کو ہٹا رکھا ہے لیکن آج کل اس قدر شور وغل مچا ہوا ہے کہ پھر اخبارات کا بالتفصیل مطالعہ شروع کر دیا ہے۔ فسادات کی خبریں ملک کے کونے کونے سے آرہی ہیں...... تاہم ہمت ہارنے کی کیا ضرورت ہے اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔

امرت سر میں بھی کشیدگی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اندر ہی اندر کھچڑی پک رہی

ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہنگامہ ہو۔ لیکن پھر بھی زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا۔ جذبات کا یہ وقتی ابال دب جائے گا۔ ملک تقسیم ہوگیا ہے اس بات پر طرفین قریب قریب متفق ہو چکے ہیں۔ اب اختلاف کس بات پر۔ جب راضی نامہ ہوگیا تو جھنجٹ کس بات کا۔ رہی عوام کی ہنگامہ آرائی تو وہ کب تک۔

شام کا وقت ہے۔ سورج لب افق کو چوم رہا ہے۔ ہمارے گھر کے پچھواڑے کوئی ایسی چیز نہیں جو منظر کو حسین بنا سکے لیکن مجموعی طور پر اس وقت یہ منظر دلچسپ اور دلکش معلوم ہو رہا ہے۔

وسیع میدان میں ہندو سکھ مسلمان لڑکوں کے ٹولے مل جل کر مختلف کھیل کھیل رہے ہیں۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر ننھی ننھی پہاڑیوں کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ ارد گرد بیری کے اکا دکا پیڑ، دور کھیت، گدلے پانی کا جوہڑ اور وہ چھوٹا سا گوردوارہ۔ اس کی برجی پر لہراتا ہوا بوسیدہ جھنڈا۔ آسمان پر تیتر کے پروں کی سی بدلیاں یا جیسے سمندر کے سارے کنارے پھیلی ہوئی ریت۔ اس پر کئی رنگ آپس میں گلے مل رہے ہیں......

اتنے میں سامنے والے مکان کی ایک کھڑکی قدرے کھلتی ہے...... اور بس کھلی کی کھلی رہ جاتی ہے۔ کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ حالانکہ عام حالات میں کوئی چہرہ نظر آنا چاہئے۔ اب یا تو کھڑکی ہوا کے زور سے کھلی ہے یا...... یا...... نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوتا ہے کہ ضرور کوئی کھڑا ہے جو سامنے نہیں آ رہا ہے۔ اس سے میری دلچسپی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ میں اپنی کھڑکی سے دور کھڑا ہوں سوچتا ہوں کہ آگے بڑھوں کہ اتنے میں ایک نوخیز زنانہ چہرہ دکھائی دیتا ہے۔

یہ چہرہ رضیہ کا ہے۔ وہ حاجی صاحب کی لڑکی ہے۔ حاجی صاحب اپنے آبائی مکان میں رہتے ہیں کاروبار میں خاصہ روپیہ پیدا کیا ہے۔ خوش خلق و ملنسار واقع ہوئے ہیں۔ ان کے دو بیٹے ہیں جو انہیں کے ساتھ مل کر کاروبار میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ تین لڑکیاں ہیں جن میں ایک کی شادی ہو چکی ہے اور دوسری کی منگنی۔ رضیہ سب سے چھوٹی

ہے اس کی ابھی منگنی بھی نہیں ہوئی۔

رضیہ!— ایک عام نام ہے۔ اس کی شکل وصورت رنگ و روپ میں بھی کوئی خاص بات نہیں۔ یعنی معرکے کی بات نہیں ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ خوب صورت دکھائی نہیں دیتی۔ اس کی صورت بہت پیاری ہے۔ میرے سامنے ہی کی بات ہے جب وہ ننھی بچی تھی میں نے اسے بارہا گود میں کھلایا تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ بڑی ہوگئی۔ یہاں تک کہ پردے میں رہنے لگی...... اس کے بال اور آنکھیں خاص طور سے دل کش ہیں۔

............مگر اس وقت ہماری ننھی رضیہ کس خیال میں یہاں کھڑی ہے۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا لیکن میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی دانست میں سنگھار کر رکھا ہے آنکھوں کی گوشوں میں سے سرمے کی دھاریاں نوک سناں کی طرح آگے بڑھ آئی ہیں۔ منہ دھلا دھلایا— شاید پوڈر کی ہلکی سی تہہ گھنے بوجھل بال ڈھیلے ڈھالے جن میں سرخ رنگ کا پھول اڑسا ہوا اسے رضیہ نے ایک ہاتھ سے تھام رکھا ہے شاید اس خیال سے کہ اگر گھر کا کوئی فرد ادھر آ نکلے تو وہ جلدی سے پھول کو کہیں چھپا سکے۔ مجھے اس کی اس طفلانہ حرکت سے عجب لطف کا احساس ہوا۔ سولہ برس کی اس عمر میں ہر الھڑ پن بلکہ بے تکاپن بھی اس کے حسن میں چار چاند لگا رہا ہے۔

اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ میں بھی شرارتی بچے کی طرح ہٹ کر ایک جانب کھڑا ہوں۔ جہاں سے میں اسے بہ آسانی دیکھ سکتا ہوں۔ لیکن وہ چاہے بھی تو مجھے نہیں دیکھ سکتی۔ لیکن اس کا دھیان میری طرف تو تھا ہی نہیں۔ اس کی نیم وا آنکھیں تجسس سے میدان کی طرف دیکھ رہی ہیں رفتہ رفتہ آنکھیں پورے طور سے کھل جاتی ہیں۔ ان میں مسرت کی چمک پیدا ہوجاتی ہے ہونٹوں پر کلیاں چٹکنے لگتی ہیں۔ اس نے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا ہے، پھر حیا کی سرخی کا غازہ رخساروں پر پھیل جاتا ہے دانتوں کی دمک کے باعث یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس کا منہ نایاب موتیوں سے لبریز ہو۔ بال اور نیچے کو

دھنک آئے ہیں سرخ پھول ترچھا ہوگیا ہے اس کے پپوٹوں نے آنکھوں کو اپنے دامن میں چھپا لیا ہے جیسے وہ اس کی سرکش چھاتیوں کی طرف دیکھ رہی ہوں۔ گریبان کے بٹن بے پروائی سے ادھ کھلے چھوڑ دیئے گئے ہیں لیکن اس کے سینے میں طلاطم سا پیدا ہوتا ہے تو چھاتیوں میں سمندر کی تیز و تند لہروں کا سا مد و جزر نظر آنے لگا تو اس نے چندری کا پلو ڈال کر اس طوفانی کیفیت کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتی ہے اس کے سبک نتھنے پھڑک اٹھتے ہیں۔

مجھے خیال آتا ہے کہ آخر دیکھوں تو اس طوفان کو اٹھانے والا ماہتاب — یا اس ماہتاب کو عالم تاب بنانے والا آفتاب کون ہے...... یہ سوچ کر میں دبے پاؤں میدان کی سمت کھلنے والی کھڑکی کی جانب بڑھتا ہوں چپکے سے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑاتا ہوں تو ایک نوجوان دکھائی دیتا ہے جو کمال بے فکری اور انہماک سے اپنی نظر عالم بالا پر جمائے ہے۔ کئی سکنڈ گزر جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ ذرا رخ پھیرتا تو مجھے دیکھ لیتا لیکن عشق کتنا الھڑ کتنا معصوم ہوتا ہے۔ عشق کو کبھی اس امر کا احساس نہیں ہوتا کہ غیروں کی نگاہیں اس کو تاڑ رہی ہیں۔

میں دلچسپی سے اس نوجوان کو دیکھتا رہا۔ معا وہ ایک قدم پیچھے ہٹتا ہے اور پھر دیوار کی اوٹ میں ہوجاتا ہے۔ وہ مجھے نہیں دیکھ پاتا۔ لیکن غالباً معشوقہ کی کھڑکی میں ہی کوئی چیز ایسی نظر آتی ہے جس کی وجہ سے وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اب میں چند قدم ہٹ کر رضیہ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن وہ وہاں موجود نہیں ہے اور کھڑکی بدستور سابق بند ہے۔

اس کے بعد میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کئی منٹ تک ٹہلتا رہتا ہوں یہاں تک شب زلفیں بکھیر دیتی ہے اور اس کی اداس دھندلاہٹ میں ستارے ٹمٹمانے لگتے ہیں۔

آخر کار تھک کر میں میدان کی جانب کھلنے والی کھڑکی کے قریب ایک اونچی بازو دار کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں ٹانگیں کھڑکی کی چوکھٹ پر ٹکی ہیں۔

کھیت سیاہ دھبوں کی طرح دکھائی دے رہے ہیں اور ملگجی روشنی میں ہر شے پراسرار سائے میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ خود میرے ذہن میں خیالات سایوں کی طرح متحرک ہیں۔

محبت کا یہ ننھا سا ڈرامہ دفعتاً میرے سامنے کھیلا گیا ہے۔ رضیہ کی صورت کبھی چار چھ ماہ بعد دکھائی دے جاتی تھی۔ لیکن مجھے اس محبت کا علم نہیں تھا...... اور پھر یہ محبت کیا شے تھی جو ایک خودرو پودے کی طرح ہر نوخیز دل میں ازخود اگ آتی تھی۔

محبت — ذوق نمو کے سوا اور کیا ہے؟ لیکن انسان نے کتنی آلائشیں اس کے ساتھ لپیٹ ڈالی ہیں۔ کیسے کیسے نازک اور امنگوں بھرے دل کھلا کر رہ جاتے ہیں۔ زندگی سے بھرپور ہر ترنگ کی راکھ سی بن کر ہوا میں اڑ جاتی ہے۔

کہتے ہیں شیر، سانپ، ہاتھی اور گینڈے وغیرہ بہت سخت جان جانور ہوتے ہیں لیکن انسان سے زیادہ سخت جان کون جاندار ہوسکتا ہے اس کی ذہنی اور روحانی کلفتوں کا شمار بھی نہیں کیا جاسکتا جسمانی معذوریاں اور لاچاریاں تو رہیں ایک طرف۔ قدم قدم پر نوخیز دلوں کو بھی وہ وہ مصائب سہنے پڑتے ہیں کہ ان کے بھدے نقوش ان کی معصوم روحوں پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نقش ہو کر رہ جاتے ہیں...... یہی ذوق نمو، کیسے ایک دلکش راگنی کی طرح معصوم دل میں جنم لیتا ہے۔ قدرت کے اونچے آدرشوں میں رنگ بھرنے کے لیے......

یہ جذبہ تو تصویر معصومیت ہے سراسر نغمہ ہے۔ روح پاکیزگی ہے...... لیکن ہمارا سماج اسے بھی اس کا مقام دینے پر آمادہ نظر نہیں آتا......

یکا یک مجھے خیال آیا کہ نہ جانے آج کے ڈرامے کا ڈراپ سین کیسے ہو؟ دل میں شبہ پیدا ہوا کہ کہیں رضیہ رنگے ہاتھوں پکڑی تو نہیں گئی۔ ایسا تو نہیں ہوا کہ بھائی یا باپ اوپر سے پہنچ گیا ہو۔ یہ بات اور زیادہ خطرناک تھی...... بیچاری بری طرح سے ماری پیٹی گئی ہوگی۔ اب شاید کسی کال کوٹھری میں بند کردی گئی ہو......

میرے دل کی بے چینی بڑھنے لگتی ہے۔ مانا رضیہ سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے اور نہ اس اجنبی نوجوان سے...... لیکن یہ دونوں ہم مذہب تو رہے۔ ایک طرف اگر رضیہ ہندو یا سکھ لڑکی ہوتی تو بھی مجھے اس سے وہی ہمدردی ہوتی۔ آخر سارا محلّہ مجھے اپنا ہی کنبہ تو معلوم ہوتا تھا۔

اس خیال کے آتے ہی میں پھر اٹھ کھڑا ہوتا ہوں اور بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگتا ہوں آخر اس بات کا پتہ کیسے چلے میں اسی کھڑکی طرف گیا تو دیکھا کہ وہ جوں کی توں بند ہے۔ جیسے وہ صدیوں سے اسی طرح سے بند ہو۔ جیسے اس کی چوکھٹ پر کوئی حسین جمیل شبیہ کبھی مسکرائی نہ ہو ہنسی نہ ہو، لجائی نہ ہو۔

رات بھر بے چینی سی رہی۔ رہ رہ کر لڑکی کی معصوم صورت آنکھوں کے آگے گھومتی رہی۔ خدشہ یہ تھا کہ نہ جانے یہ معاملہ بالآخر کیا صورت اختیار کرے۔ نہ معلوم کیوں مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اگر دونوں کا رشتہ ہوجائے تو اچھا ہی ہے۔ میرے پاس اس کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ رضیہ اپنے محلے کی لڑکی تھی لیکن اس کے بارے میں اور اس کے خیالات اور افتادِ طبع کے بارے میں میرا علم محدود تھا اور لڑکے کے بارے میں تو مجھے سرے ہی سے کچھ پتہ نہ تھا۔ وہ کون تھا کیا کرتا تھا تعلیم کہاں تک ہے خاندان وغیرہ۔ مجھے ان باتوں کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ پھر بھی دل کہتا تھا کہ ان کے دل کی دنیا برباد نہ ہونے پائے۔ شاید میں جذباتی ہو رہا تھا۔

میں یہ جاننے کے لیے بے قرار تھا کہ رضیہ کو کیوں دفعتاً کھڑکی کے آگے سے ہٹنا پڑا۔ رات ہی میں نے اپنا ملازم ان کے گھر حاجی صاحب یا ان کے لڑکوں میں سے کسی کو بلانے کو بھیجا۔

نوکر نے آکر جواب دیا کہ گھر پر کوئی مرد موجود نہیں ہے۔ مجھے اطمینان ہوا۔ اب یہی امکان باقی تھا کہ شاید اس کی امّی نے اسے دیکھ لیا ہو یا محض کسی کی آہٹ پاکر وہ پیچھے ہٹ گئی ہو۔ پہلی صورت بھی خطرناک تھی اور دوسری تو خیر بالکل بے ضرر تھی۔

اگلی صبح کے وقت گلی اور کنوؤں کے گرد وہی مانوس سا شور تھا۔ میں نے بہت چاہا کہ کسی طرح رضیہ کی صورت دکھائی دے جائے تا کہ میں اندازہ لگا سکوں کہ حالات کس حد تک خراب ہیں۔ لیکن رضیہ دکھائی نہ دی۔ شام کو حاجی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کی حرکات و سکنات اور گفتگو سے ہرگز پتہ نہیں چلتا تھا کہ گھر میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے۔

میرے دل میں آئی کہ حاجی صاحب سے میں ہی اس بات کو چھیڑ دوں۔ لیکن پھر سوچا کہ کہیں جلد بازی غلط فہمی نہ پیدا کردے اور پھر مجھے لڑکے کے بارے میں بھی کچھ علم نہیں تھا اگر بعد میں کوئی غیر موافق بات ہوئی تو سب کچھ میرے متھے آئے گی یوں حاجی جی جہاندیدہ اور کسی حد تک ضدی انسان تھے اگر الٹ گئے تو بات سنبھالنی مشکل ہو جائے گی۔

ایک طریقہ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ رضیہ مجھے اپنا رازداں سمجھ لے تو شاید میں اس کی مدد کرسکوں۔ لیکن کیا میں ایک غیر معمولی بوڑھا نہیں ہوں آخر کوئی سنے تو کیا کہے۔ اور پھر رضیہ مجھے اپنا رازداں کیسے بنا سکتی ہے۔ ایک بزرگ صورت سائیں جی کو جس سے وہ کبھی ڈرتی تھی اور بعد میں جس کا وہ احترام کرنے لگتی تھی۔ ناممکن ناممکن...... البتہ لڑکے سے راہ و رسم پیدا کرنے میں کسی خاص مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ حالانکہ لڑکا بھی رازداں بنانے پر جلدی سے آمادہ نہیں ہوگا لیکن پھر بھی میں اسے بلوا سکتا ہوں کسی بہانے سے، باتوں باتوں میں اس کے بارے میں بہت کچھ معلومات حاصل کرسکتا ہوں۔ اگر ہر طرح معاملہ تسلی بخش معلوم ہو تو کسی نہ کسی طرح حاجی جی کو بھی ڈھب پر لایا جاسکتا ہے۔

اس عمر میں جب کہ میں قبر میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا۔ دو دلوں کو ملانے کا یہ عمل میرے من کو بہت بھلا سا لگ رہا تھا۔ ہم عبادت و ریاضت کی دھن میں لگے رہتے ہیں۔ لیکن ہمارے ارد گرد کتنے معصوم دل اور نیک روحیں موجود ہیں جنہیں سہارا

دے کر ہم نئی دنیا کو جنم دے سکتے ہیں۔ لیکن ہم ایسا نہیں کرتے۔۔۔ نہیں کرسکتے۔ سالہا سال کی عبادت ہمارے ذہن میں اتنا سا نور پیدا کرنے سے قاصر ہے مگر میں یہ ننھی سی دنیا برباد ہونے سے ضرور بچاؤں گا۔

سوال یہ ہے کہ میرے الجھے ہوئے خیالات کو عملی جامہ کیسے پہنایا جاسکتا ہے۔ دن گزرتے جارہے ہیں۔ رضیہ کا دکھائی دینا تو درکنار اس کی جھلک تک ایک فسانہ بن کر رہ گئی۔ ایک خواب...... جو شاید میں نے دیکھا بھی تھا یا نہیں اور تو اور وہ لڑکا تک نظر نہ آتا تھا۔ میں نے اسے ایک ہی بار دور سے دیکھا تھا پھر بھی اگر وہ میرے سامنے آئے تو میں اسے ضرور پہچان لوں۔ نہ جانے وہ بھی کیوں نہیں آتا۔ شاید وہ لڑکوں کی ان متعدد ٹولیوں میں وہ بھی شامل ہو۔ مگر اتنے فاصلے سے میں اسے کیوں کر پہچانوں؟

ایک شام میں پھر میدان کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ اب میں مایوس ہوتا جارہا تھا۔ کیونکہ اتنے دن بیت جانے کے بعد بھی نہ تو رضیہ کی صورت دکھائی دی نہ لڑکے کی۔ آخر اس پراسرار پردے کے پیچھے کیا گل کھلا تھا۔ میں اس سے ناواقف تھا۔

میں بے معنی نظروں سے میدان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ایک نوجوان میری سمت کو بڑھا۔ میں سمجھا دیوار کے پاس پیشاب کرنے کو آرہا ہے۔ جب وہ قریب آگیا تو یوں لگا جیسے وہ وہی لڑکا ہے۔ لیکن وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ اتنے دنوں میں میرے ذہن میں اس کے غیر واضح نقوش اور بھی زیادہ دھندلا گئے تھے۔

قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔ اس کی نظر رضیہ کی کھڑکی پر جمی ہوئی تھی۔ یہ دونوں کا رازداں تو ہو نہیں سکتا اس لیے غالباً وہ وہی لڑکا تھا۔ کچھ دیر تامل کے بعد اس نے جیب میں سے کاغذ کا پرزہ نکالا اور اسے ایک پتھر باندھ دیا۔ میں نے دیکھا کہ رضیہ کی کھڑکی کھلی ہے لیکن وہاں کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ لڑکے نے ہاتھ تول کر پتھر کھڑکی کی جانب پھینکا۔ اوپر پہنچ کر کاغذ پتھر سے جدا ہوگیا اور ہوا کے جھونکے سے اڑ کر۔۔۔ اڑ کر میری کھڑکی کی ایک درواز میں پھنس کر زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑانے لگا اور پھر زور کی

آواز ہوئی۔ دیکھا کھڑکی بند ہو چکی ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ رضیہ کھڑکی کے پیچھے چھپی کھڑی تھی۔ ادھر لڑکا بھی بھاگ نکلا...... میں اس کاغذ کی طرف چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا تھا...... لمحہ بھر کو میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ عقل نے بھی کام نہیں کیا۔ مجھے چاہئے تھا کہ بڑھ کر کاغذ کو پکڑ لیتا۔ کیونکہ اگر وہ گلی میں جا گرتا تو نہ جانے کس کے ہاتھ لگ جاتا۔

خوش قسمتی سے میرے آگے بڑھنے سے پہلے ہوا کے زور دار جھونکے سے کاغذ دراز میں سے نکل کر پھڑ پھڑاتا ہوا میرے قدموں پر آن گرا، اور میں نے جھک کر کانپتی ہوئی انگلیوں سے اسے پکڑ کر اوپر اٹھا لیا اور دھیرے دھیرے اس کی تہیں کھولنے لگا۔

اٹھا کر دیکھا تو ایک نہیں دو پرزے تھے۔ ایک رضیہ کا رقعہ تھا اور اس کے جواب میں حیدر کا۔ دونوں رقعے ہیں تو پریم پتر لیکن اس قدر سادہ کہ ہنسی آئے اور پر اثر اتنے کہ آنسو بھر آئے۔

رضیہ نے لکھا تھا:

''آپ سے جدا ہو کر ہم مرجائیں گے۔ ضرور مرجائیں گے جی۔ تاکید ہے بار بار تاکید ہے۔''

بس یہ رضیہ کا پریم پتر تھا۔ اردو کے حروف ٹیڑھے میڑھے۔ لیکن ایک دل سے دوسرے دل تک پیام پہنچانے کے لیے یہ الفاظ ضرورت سے کہیں زیادہ تھے۔

حیدر نے جواب میں پنسل سے لکھا تھا:

''ہم بھی۔۔۔ ہم خوب روئے آپ کا رقعہ پڑھ کر۔۔۔''

معلوم ہوتا ہے دونوں کو ایک دوسرے کی سننے کی بہت جلدی ہوتی ہے۔ محبت کے خطوط لکھنا نہیں جانتے یا قلم جذبات کا ساتھ نہیں دیتا۔

خطوط پڑھ کر معاملہ صاف ہونے کے بجائے اور الجھ گیا ہے۔ یا الٰہی! یہ تو اس باب میں بالکل الھڑ ہیں یہ تو بس مرجائیں گے۔

اب تو میرے ہاتھ پاؤں پھول رہے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ ان کی محبت نقطۂ عروج پر ہے۔ اس میں حسب معمول عقل کو قطعاً کچھ دخل نہیں ہے۔ کیا کیا جائے۔

اتنا تو پتہ چل گیا کہ لڑکے کا نام حیدر ہے۔ حیدر!— بالکل عامیانہ نام ہے۔ ہر قصبے، گاؤں اور شہر میں اکثر حیدر نام کے لڑکے ہوتے ہیں۔ اب اتنا تو ہوسکتا ہے کہ اگر اب وہ ہماری کھڑکی کے قریب آئے تو میں اسے حیدر کہہ کر بلا سکتا ہوں— اپنی طرف متوجہ کرسکتا ہوں۔

لیکن اس سے بھی ضروری بات یہ ہے کہ رضیہ کو اس کے خطوط پہنچا دیئے جائیں۔ اس کی جان خشک ہو رہی ہوگی۔ رقعوں کا حشر اس کے خیال میں یہی ہوسکتا ہے کہ یا وہ گلی میں گر کر کسی کے بھی ہاتھ لگ جائیں اور سارے محلے میں بدنامی ہوجائے یا وہ میری نظر پڑ جائیں اور میں ان کے والد کو بلا کر رقعے ان کے حوالے کردوں اور کچھ اپنی طرف سے بھی نمک مرچ لگادوں— وہ نہیں جانتی کہ ان میں کوئی بات نہیں ہوئی— پھر بھی اس کے ڈر اور وحشت کی کوئی حد نہیں ہوگی۔ اس وقت نہ جانے خوف و ہراس کی اس کیفیت میں وہ نہ جانے کیا کرلے— کسی نہ کسی طرح سے اسے بات کی خبر پہنچانی چاہئے— لیکن کیسے؟

وہ کھڑکی اکثر بند رہتی تھی۔ میں نے تجویز سوچ کر ہر دوپہر ڈھلے اس پر پتھر مارنے شروع کردیئے ہیں— وقفے سے دو تین پتھر۔ خود چھپ کر دیکھتا رہتا۔ اول تو کوئی شخص بند کھڑکی کو کھولتا نہیں۔ ایک بار ان کی ملازمہ کی دس سالہ لڑکی نے کھولی تو میں چھپا رہا— لیکن دل میں مناتا تھا کہ کاش رضیہ ادھر آ نکلے۔ حیدر کا اشارہ سمجھ کر دروازہ کھول دے۔

تیسرے ہی دن میری مراد پوری ہوگئی۔ رضیہ کھڑکی کھول کر میدان کی جانب دیکھنے لگتی ہے۔ میں رقعے پتھر سے باندھ کر تیار کھڑا ہوں۔ کھڑکی کے پٹ کھلتے ہی نشانہ باندھ کر رقعوں والا پتھر پھینکتا ہوں جو سیدھا اندر جا گرتا ہے۔ اس پر رضیہ گھبرا کر

میری طرف دیکھتی ہے۔ مجھ سے آنکھیں ملتے ہی اس کا چہرہ زرد پڑ جاتا ہے۔ میں دبی زبان میں کہ آواز صرف اسی تک پہنچے کہتا ہوں۔

"رجی بیٹا گھبراؤ نہیں......تم......"

تم

تم سائیں جی کو اپنے سامنے پاکر گھبرا گئیں۔ تمہارا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ تمہارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ پھر چونک کر تم نے کھڑکی کے پٹ زور سے بند کر دیئے...... اور بند کھڑکی سے پیٹھ لگا کر تم نے اپنے دونوں ہاتھ سینہ پر رکھ لیے۔ تمہاری ٹانگیں تک لرز رہی تھیں تمہیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے چکرا کر فرش پر گر پڑو گی۔

ڈرو نہیں۔ اب گھبراؤ نہیں عشق میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ سائیں جی محلے کے بزرگ ہیں۔ تمہارا شرمانا بھی درست ہے کیوں کہ تم جب پیدا ہوئیں اس وقت بھی وہ بوڑھے انسان تھے۔ تم ان کی گود میں کھیلی ہو۔ واقعی شرم تو آ ہی جاتی ہے انسان کو۔ پھر تمہارے جیسی لڑکی کو جو پنجرے کے پنچھی کے مانند ہے۔ ہائے اللہ! اب کیا ہوگا؟ درست۔ لیکن جو ہونا تھا سو ہو چکا اور جو ہونا باقی ہے وہ ہو کر رہے گا۔ اب خواہ مخواہ جی چھوڑنے سے کیا فائدہ؟— کب تک سینہ پر ہاتھ رکھے یوں کھڑی رہو گی۔ دل تو چھاتی کے اندر ہوتا ہے۔ باہر سے تھامنے سے یہ قابو میں تھوڑے ہی آئے گا...... مگر دیکھو۔ وہ کاغذ کا گولہ سا کیا ہے۔ یہ اسی کے رقعے تو نہیں۔ جلدی سے اٹھا کر دیکھو۔ ایسا نہ ہو اوپر سے کوئی آ جائے۔ کسی اور نے رقعے دیکھ لیے تو آفت ہی آ جائے گی۔ مرنے تک کے لیے جگہ نہیں ملے گی اٹھاؤ۔ یہ لو، تمہارا رقعہ بھی ہے اور اس کا رقعہ بھی— اوئی اللہ! اب کیا ہوگا۔ سائیں جی نے دونوں رقعے پڑھ لیے ہوں گے۔ ان کو سب کچھ پتہ

چل گیا۔ وہ ضرور ابّا سے شکایت کر دیں گے۔ ہائے ہائے۔

رضیہ...... رضیہ...... تم ایک معمولی لڑکی ہو۔ غیر معمولی نہیں— تم شیلا ہو سکتی تھیں تم امر جیت کور ہو سکتی تھیں— تم جو کچھ بھی ہوتیں رضیہ کی رضیہ ہی رہتیں۔ دیکھو رضیہ تم نے کوئی ان ہونی بات نہیں کی۔ کوئی گناہ، کوئی پاپ نہیں کیا۔ یہ بالکل قدرتی امر ہے۔ آخر تم نے کسی مرد کو اپنانا چاہا۔ تم ماں بنوگی۔ تمہارے صحن میں معصوم بچوں کے قہقہے گونجیں گے۔ تم گھر بساؤ گی۔ تم نئے جیون کو جنم دوگی۔ تم زندگی دینے اور اسے جاری رکھنے والی ہو۔ تم پر ہزار ہزار سلام۔ تمہیں سدا نمسکار۔ تم نہیں جانتیں یہاں...... اس دنیا میں...... تمہارے اردگرد لوگ دھرم، انصاف اور نیکی کے نام پر کیا کیا حرکتیں کرتے ہیں۔ یہ چٹھیاں!...... یہ چٹھیاں جلادو...... ہاں جلا ہی دو۔ انہیں چھپانے سے کیا حاصل؟...... شاید کسی کے ہاتھ لگ جائیں اور مصیبت نازل ہو۔ اب تو انہیں جلا ڈالنا ہی بہتر ہوگا...... چلو جلدی چلو...... ار...... اوہ......آواز، کوئی آواز...... کس کی آواز...... چلو...... گھر میں کام ہوگا...... یہ چٹھیاں چھپا لو قمیص کے اندر انگیا میں ٹھونس لو...... ہاں بس ٹھیک...... کوئی بات نہیں۔ چولھے کے قریب بیٹھنے کا موقعہ تو ہر وقت ملتا ہی رہتا ہے۔ رقعے جلا دینے میں کیا وقت لگتا ہے۔

''پراٹھے پکاؤ...... رضیہ...... تم کہاں رہ جاتی ہو......''

یہ اماں کی آواز ہے۔ اس بات کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ چپکے سے چولھے کے پاس بیٹھ رہو۔ آٹے کے پیڑے بناؤ...... پراٹھے تیار کرو۔ کام میں مگن ہو جاؤ موقع ملتے ہی رقعے جلا دینا۔

یہ لوشن بھی آ گئی۔ اس کی عمر تیرہ برس کی ہو چکی ہے چودھواں لگا۔ مگر وہ ان کی مہری کی بیٹی ہے۔ غریب لوگ ہیں اس لیے وہ ماں کا ہاتھ بٹانے کے لیے گھر گھر جاتی ہے۔ بھلے گھر کی لڑکی ہوتی تو کبھی کی پردے میں بیٹھ گئی ہوتی۔ کالی کلوٹی ناک میں تھلی لٹکائے سارا سارا دن دوڑ ننگے لگاتی پھرتی ہے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پئے ہے اور تو اور

بولتا بائیسکوپ بھی تو کئی بار دیکھ چکی ہے۔ موقع ملنے پر فلمی کہانیاں سناتی ہے تم بڑے انہماک سے سنتی ہو۔ تم بھی تو بائیسکوپ دیکھنا چاہتی ہو۔ لیکن ابھی نہیں دیکھ سکو گی۔ جب تمہاری شادی ہوجائے گی تو اپنے شوہر کے ساتھ جایا کرو گی۔

ثمن اس کی سہیلی ہے۔ حالانکہ گھر کے لوگ اس بات کو پسند نہیں کرتے اور دونوں اپنی دوستی ان پر ظاہر بھی نہیں ہونے دیتیں۔ خصوصاً تم کو اس امر کا پورا پورا خیال رہتا ہے۔ تم اوروں کے سامنے اس سے بات کرتے وقت مسکراتی تک نہیں لیکن تم اسے دل سے چاہتی ہو۔ سیدھی سی وجہ یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی اور تمہیں باہر کی دنیا کی باتیں نہیں سنا سکتا۔ باہر کی دنیا کی ہر بات تمہارے لیے الف لیلیٰ کی کہانی سے کم نہیں ہوتی کتنے چاؤ، کتنے اشتیاق سے تم اس کی باتوں کو سنتی ہو۔ تم نے تو سوائے اپنے گھر کے پچھواڑے کے میدان کے سوا کیا دیکھا ہے۔ بچپن اپنے محلے کی گلی میں گزرا......

ثمن پاس بیٹھی ہے لیکن گھر کے اور لوگ اِدھر اُدھر گھوم رہے ہیں۔ ثمن کو آٹھ دس آلو دے دو۔ وہ خود بھی ان باتوں کو سمجھتی ہے دیکھو کیسے چپ چاپ آلو چھیلے جارہی ہے، دبی نظروں سے تمہیں دیکھ بھی لیتی ہے۔ مسکرا بھی دیتی ہے۔ لیکن تم مسکراتیں بھی نہیں اچھا ہے...... معاً تمہارے ذہن میں پھر وہی خیال...... سائیں جی والا خیال ابھرتا ہے۔ سارا واقعہ بار بار ایک فلم کی طرح تمہارے ذہن کے پردے پر اپنا عکس ڈالتا ہے۔

تم اب سوچ رہی ہو...... سوچ رہی ہو کہ انہوں نے وہ دونوں چٹھیاں تمہیں واپس کردی ہیں۔ یہ خیال آتے ہی سنسنی کی ایک لرزش تمہارے سر سے پاؤں تک پھیل جاتی ہے۔ مگر رضیہ یہ بھی تو سوچو کہ اگر وہ چاہتے تو یہ چٹھیاں تمہارے ابا کو دکھا دیتے۔ لیکن انہوں نے وہ تمہیں واپس کردی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس کے بارے میں کسی سے کچھ نہ کہیں۔ اگر ابا سے کہنا ہوتا تو رقعے واپس کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ رقعے تو ایک پکا ثبوت مہیا کرسکتے تھے...... تم بار بار اس منظر کو اپنی آنکھوں کے سامنے لاتی ہو...... سنو رضیہ! سائیں جی کچھ کہنا بھی تو چاہتے تھے۔ ہاں ہاں وہ کچھ کہنا چاہ رہے تھے لیکن تم

نے ہی گھبرا کر کھڑکی بند کردی۔ تم نے کچھ نہیں سنا۔ لیکن تمہیں ان کی بات سن لینی چاہئے تھی...... ہائے اللہ! گھبراہٹ میں کچھ نہیں سوجھا...... ٹھیک ہے نا؟

مگر...... مگر...... سائیں جی کیا کہنے کو تھے شاید ڈانٹتے۔ کہتے رضیہ بیٹی! تمہیں شرم محسوس ہونی چاہئے۔ تم یہ کیا کر رہی ہو۔ تم خاندان کی آبرو خاک میں ملا دو گی۔ تمہارے ماں باپ بھائی بہن کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے...... تو کیا ہوتا...... ایسی باتیں سن کر کتنی شرم محسوس ہوتی...... لیکن یہ بھی تو سوچو رقعے واپس کر کے انہوں نے تم پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ اولاً یہ رقعے اگر ان کے مکان میں گرنے کے بجائے کہیں گلی یا کسی اور مکان میں جاگرتے تو اب تک سارے محلے میں بدنامی ہوگئی ہوتی...... مگر یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ سائیں جی نے رحم کھا کر رقعے تو واپس کر دیئے ہوں لیکن شام تک ابا سے مل کر انہیں اشارتاً کچھ ہدایت کریں۔ اس کا نام نہ بھی لیں تو ابا ان کا مطلب تو پا ہی جائیں گے اور پھر گھر میں اس پر اور زیادہ پابندیاں لگ جائیں گی۔ آگے ہی دم مارنے کی فرصت نہیں ملتی......

...... خیر جو ہو سو ہو— اب تو سوا انتظار کرنے کے کوئی چارۂ کار نہیں— اور ہاں، وہ رقعے!! اب موقعہ ہے ڈال دو آگ میں...... آگ قدرے بھڑک اٹھتی ہے۔

"کیوں جی! یہ کیا جلایا جارہا ہے۔"

یہ شمن کی آواز ہے۔ شیطان کہیں کی۔ کیسے کن انکھیوں سے دیکھ رہی ہے۔ نتھنی لرز رہی ہے۔ روکھے سوکھے بالوں کی لٹوں نے اس کی ایک آنکھ ڈھانپ رکھی ہے۔ سپید سپید دانت جھلملا رہے ہیں۔

"کچھ نہیں، کچھ نہیں۔"

"ہم سے چالاکیاں...... ہماری بلی ہمیں سے......"

"خدا کے واسطے شمن! چپ رہو۔"

"تو بتاؤ نا؟"

"کیا بھئی۔"

"یہ کیا جلا رہی تھیں۔"

"بھئی یوں ہی کاغذ سے تھے۔"

"خوب جانتی ہوں کاغذ نہیں چٹھیاں تھیں چٹھیاں۔ تمہارا کلیجہ حلق میں آن اٹکا ہے۔"

"چٹھیوں کی بچی..... چپ رہ نا۔"

"بتا دو نا۔" ثمن تمہیں تنگ کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ بڑی چنٹ لڑکی ہے۔ اس سے پیچھا تو چھڑانا ہی ہوگا کسی نہ کسی طرح سے.....

"تو بتا دو نا۔"

"ابھی کیسے بتا دوں۔"

"تو پھر بتا دو گی نا۔"

"ہاں۔"

"وائی دا۔"

"ہاں وعدہ۔"

"پکا وائی دا۔"

"ہاں پکا وعدہ—— الو کہیں کی۔"

اب الو کہو یا ثمن—— وہ تمہارا پیچھا نہیں چھوڑنے کی۔ تم نے ایک طرح سے اعتراف کر لیا ہے کہ دال میں کالا ضرور ہے۔ اب راز بتانا ہوگا..... کیسے چھپاؤ گی..... تو پھر بتا ہی دینا..... عاشقوں کے ہمراز اکثر ہمدرد ہوتے ہیں۔ یوں بھی تمہیں ثمن پر پورا پورا بھروسہ ہے۔ وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ سیانی اور ہوشیار ہے۔ بڑے بڑوں کے کان کترتی ہے اپنی ہمراز بنانے سے ممکن ہے تمہیں اس سے کافی مدد ملے۔

دوپہر ہو چکی ہے۔ گھر کے لوگ کھا پی چکے ہیں۔ بکھری چیزیں سمٹنی باقی ہیں جو

تم کرو گی۔ برتن مانجھنے دھونے کا کام ثمن کرے گی۔ اس کی ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اس لیے وہ پہلے ہی سے گھر چلی گئی ہے۔ کام ختم ہونے کے بعد تم دونوں کو اتنی سی فرصت مل جائے گی کہ وسیع حویلی کے کسی گوشے میں بیٹھ کر بات چیت اور ہنسی ٹھٹھول میں وقت بتا سکو۔

ثمن کی طرف کیا دیکھ رہی ہو۔ سوچتی ہو کہ اسے بتاؤں یا نہ بتاؤں لیکن یہ اب ناممکن ہے کیوں کہ وہ دل ہی دل میں بے چین ہو رہی ہے۔ اس کے ہاتھ آج کس قدر تیزی سے چل رہے ہیں۔ کیسے بار بار وہ پر معنی نظروں سے تمہاری جانب دیکھنے لگتی ہے۔ مردود! کہیں یہ ساری داستان اِدھر اُدھر پھیلا نہ دے...... لیکن کیا کیا جائے اُدھر سائیں جی کو بھی تو پتہ چل چکا ہے۔ شام کو اگر مردانے میں آ کر ابا جان سے کچھ کہہ کر چل دیئے تو تمہیں کیسے پتہ چلے گا۔

لو کام دھام ختم ہوا۔ ثمن سائے کی طرح تمہارے ساتھ ساتھ ہے وہ ڈرتی ہے کہ کہیں تم دغا نہ دے جاؤ۔ چلو اوپر کی چھت پر۔۔۔ میانی میں بیٹھ کر بات چیت کرو۔ پیچھے گھوم کر کیا دیکھ رہی ہو۔ ثمن آ رہی ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ وہ آج تمہیں آنکھوں سے اوجھل ہونے دے گی...... بس میں میانی ٹھیک ہے۔ اچھی جگہ ہے۔ چٹائی بچھالو۔ اے لو ثمن بھی آن پہنچی۔

"رجی! تم مجھ سے چھپانا چاہتی ہو۔"

"نہیں ثمن! بلکہ میں تو پیچھے پیچھے دیکھتی چلی آرہی تھی کہ......"

"کہ کہیں ثمن تو خدانخواستہ پیچھا نہیں کر رہی ہے۔"

"دھت! الٹی بات کہتی ہو...... بیٹھو نا چٹائی پر بیٹھ جاؤ۔"

"اے لو یہ بیٹھ گئے۔ اب بتاؤ وہ گل پھام کون ہے جس کی چٹھیاں سینہ سے لگائے پھرتی ہو......؟

"سچ تم تو بڑی ہی منہ پھٹ واقع ہوئی ہو کیسی کیسی بے شرمی کی باتیں بے روک

ٹوک منہ سے نکال دیتی ہو......''

''اری منہ پھٹ نہیں— ہم تو کھری کھری سنانے والے آدمی ہیں...... سمجھیں......''

''ہائے اللہ، چھوٹا سا منہ اور یہ بڑی بات۔''

''بات بڑی ہوئی تو کیا...... حرکت بڑی تو نہیں ہماری— خیر! رجو! سچ تم نے اندر ہی اندر بڑا ہاتھ مارا ہے۔''

''بغیر کچھ جانے بوجھے یہ ہاتھ مارنے کی بھی خوب کہی...... سچ تم میں اور پوری عورت میں کیا فرق ہے۔ سب باتیں جانتی ہو، سب سنتی ہو اور سب کچھ دیکھتی ہو......''

''ہاں وہ تو ہے...... اچھا اب سنا ڈالو اپنا کچا چٹھا۔''

''اونہوں''

''یہ اونہوں کیا۔ اب شرمانے سے کیا ہوگا اور پھر اس وقت......تو شرمائی نہیں۔ اب شرمانا کیا معنی؟''

''اس وقت کب؟''

''جب آنکھ سے آنکھ لڑی تھی۔''

''ہٹ بے شرم کہیں کی......''

''کیا کھری بات کہنا بے شرمی کی بات ہے؟ بھلا آنکھ مٹکائے بغیر یہ عشق چلا کیسے ہوگا۔''

''نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں ہوئی...... یہ ٹھیک ہے کہ...... کہ......''

''وہ تو ٹھیک ہے کہ...... کہ...... لیکن سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ شروع کب ہوا...... ذرا سوچ کر جواب دینا...... سوچ رہی ہونا؟''

''شاید چار مہینے سے ۔''

''ٹھیک ٹھیک بولو۔''

''ہاں شمن! چار دن آگے یا پیچھے کی شرط نہیں ہے۔''

''کہاں تک پہنچی ہو؟''

اس پر تمہارا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے۔ محبت ایسے نازک مسئلے پر ایسی کھلم کھلا گفتگو کرنے میں تمہیں جھجک محسوس ہوتی ہے۔ لیکن شمن ٹھہری شیطان کی خالہ۔

''بولو نا! کہاں تک پہنچی ہو۔''

''منزل سے تمہارا مطلب ہے۔''

''بتاؤں؟ پھر کہو گی بے شرمی کرتی ہو۔''

''منزل ونزل کوئی نہیں...... بات تک ہوئی نہیں......''

''بات بھی نہیں ہوئی؟...... پھر گھلے لگنے اور چوما چاٹی کا تو چکر ہی بے کار ہے۔''

اس پر تمہاری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں تم دیر تک چہرہ اوڑھنی میں چھپائے رکھتی ہو۔

اچھا ہٹاؤ پردہ چہرے سے......اب ایسی بات نہیں ہوگی...... یہ تو بتاؤ رقعے لانے لے جانے کا کام کس کے سپرد ہے۔''

''کوئی بھی تو نہیں......''

اے ہے— ہمیں چراتی ہو؟''

''سچ کہتی ہوں۔''

''لو— کا صد گیر بھلا رقعے کیسے آ جا سکتے ہیں؟''

''ہم نے اور ہی ترکیب نکال رکھی ہے۔''

''کیا۔''

اب تم ٹال کرتی ہو شمن کے اصرار پر تم بولنے پر مجبور ہو جاتی ہو۔

''ایک پتھر سے بندھ کر رقعہ مجھ تک آ جاتا ہے اور اسی پتھر سے بندھ کر میرا رقعہ

اُدھر چلا جاتا ہے......''

''آہا۔ سبحان اللہ! تم تو اس معاملے میں بس کھان دانی معلوم ہوتی ہو۔''

اس پر تمہارے ماتھے پر بل آجاتا ہے۔

''منہ سنبھال کر بولو۔''

شمن تمہارے احتجاج کو ایک قہقہے میں اڑا دیتی ہے اور پھر سوال کرتی ہے۔

''اچھا تو آج رکھے کو جلانے کا مطلب؟''

تم سوچتی ہو کہ یہ بتانا تو ذرا ٹیڑھی کھیر ہے لیکن معاملہ اس قدر نازک ہے کہ شمن کو رازداں بنالینا ہی بہتر معلوم ہوتا ہے۔

''دیکھو شمن! تم میرا بھید لے رہی ہو لیکن کسی اور سے ذکر نہ کرنا۔''

''نہیں بھئی! تم بھی کس الجھن میں پھنسی ہو۔''

''قسم کھاؤ۔''

''کران کسم۔ اللہ کسم۔''

''قرآن پاک کہا کرو گھن چکر کہیں کی۔''

''کران پاک قسم۔''

اب پھر تم تامل کرتی ہو لیکن کچھ کہے بغیر چارۂ کار بھی کیا ہے۔

''شمن بھئی! یہ سلسلہ بہت دنوں سے چل رہا تھا......''

''چھپی رستم کہیں کی۔'' شمن ٹوکتی ہے۔

''کل غضب ہوگیا۔ اس راز کا سائیں جی کو بھی پتہ چل گیا ہے۔''

''اوئی اللہ۔ وہ کیسے؟''

''کچھ دن پہلے ادھر سے رقعہ آیا...... لیکن پتھر الگ ہوگیا اور رقعہ اڑ کر سائیں جی کے اوپر والے کمرے میں جاگرا......''

''اوئی میا۔''

"میں تو بوکھلا گئی...... یعنی اس وقت تو اتنا بھی پتہ نہیں چلا کہ رقعہ سائیں جی کے وہاں گرا ہے۔ میں مجھی بیٹھی تھی کہ گلی میں گرا ہے اور کسی کے ہاتھ لگتے ہی محلے بھر میں بدنامی ہوجائے گی...... یقیناً ایسا ہی ہوتا اگر...... اور پھر اس رقعے کے ساتھ میرا رقعہ بھی تو تھا۔ کیسی خطرناک بات تھی۔ معلوم ہوتا ہے سائیں جی نے کسی سے اس کے بارے میں اب تک کچھ نہیں کہا ورنہ بات تو پھیل جاتی......"

"ہاں یہ تو ہے...... اور سائیں جی سے یہ رقعے تمہیں کیسے ملے؟"

"میں کھڑکی کے آگے کھڑی تھی انہوں نے خود ہی پھینک دیئے......"

"کچھ کہا بھی انہوں نے۔"

"نہیں۔"

"بالکل کچھ بھی نہیں......"

"ہاں...... نہیں...... اوہ...... وہ کچھ کہنا چاہتے تھے۔ لیکن تم جانو میرے تو حواس ہی گم ہوگئے تھے۔ اس بوکھلاہٹ میں میں نے کچھ نہیں سنا...... بلکہ کھڑکی بھی بند کردی......"

"دشمن تو سہی کہتے کیا ہیں......؟"

"کہانا...... میرے حواس......"

"اب کیا ہوگا......"

"نہ جانے۔"

"شاید وہ تمہارے ابا سے شکایت کریں۔"

"ہوسکتا ہے— لیکن شکایت کرنی تھی تو اب تک کرچکے ہوتے۔"

"پھر کیا تمہیں کچھ انعام دیں گے؟"

"وصت تری کی۔"

"یہ کیا؟"

''— ٹھنڈے دل سے سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ ممکن ہے کہ وہ ابا سے شکایت تو نہ کریں لیکن کسی طریقے سے ماہیا اشارہ کریں جس سے ابا ذرا خبردار ہوجائیں.....''

''اچھا رتی بھئی! ہمیں تو تمہیں سے ہمدردی ہے۔ اگر ہماری مدد کی جرورت ہو تو بتاؤ۔''

''میں کیا بتاؤں...... پر سنو ہوسکتا ہے سائیں جی ابا سے ملنے آئیں کبھی۔ آئیں گے تو رات ہی کو آئیں گے جب ابا دوکان سے لوٹتے ہیں..... اگر—''

''بو بو۔ بولو اگر کیا؟''

''— دیکھو نا؟ میری وہاں تک پہنچ ہو نہیں سکتی۔ اگر تم قریب چھپ کر سنتی رہو تو ان کے ارادوں کا پتہ چل سکتا ہے ہمیں' کہو منظور ہے؟''

شمن سینہ پر ہاتھ مار کر کہتی ہے۔''میری جان من جور ہے۔''

شام کے وقت سائیں جی آتے ہیں تمہارے ابا کے پاس بیٹھے ہیں۔ تم گھبرائی گھبرائی پھر رہی ہو، کام کر رہی ہو لیکن دھیان کہیں اور ہے۔ آخر گھبرانے کی کیا بات ہے۔ سائیں جی اکثر آتے ہیں۔ گھنٹوں تمہارے ابا سے گپ ہانکتے ہیں۔ کوئی نئی بات ہے نہیں...... پر دل کے چور کو کون سمجھائے۔ اور شمن...... نہ جانے کہاں مر کے رہ گئی۔ کیسے کیسے دعوے کرتی تھی۔ یوں کروں گی یاں کروں گی موقع پڑا تو غائب۔ آج ہی اس کم بخت کو کام سوجھنے تھے دنیا بھر کے۔ مردود کہیں کی۔

نہ جانے سائیں جی کی ابا سے ملاقات اس قدر طول کیوں پکڑ گئی ہے۔ سچ مچ؟ ہوسکتا ہے گھبراہٹ میں تم ایسا سمجھ رہی ہو۔ اُدھر وہ اپنی دنیا بسائے موج سے باتیں کر رہے ہیں بلکہ بے پر کی اڑا رہے ہیں۔ حقے کے دھوئیں کے ساتھ ساتھ قہقہے اڑا رہے ہیں۔ ادھر تم اپنی چھوٹی سی دنیا میں بے چین و بے قرار ہو۔ ابھی تمہاری زندگی کی صبح ہو رہی ہے۔ ہر شے نئی نئی ہے۔ دنیا کی ہر ادا حسین نظر آتی ہے۔ تمہارے دل میں خلوص

اور پیار کے سوا کیا دھرا ہے سچ پوچھو تو یہ دنیا تمہارے ایسی لڑکیوں کے رہنے کے قابل نہیں ہے۔ اگر تم پر گھر والوں کا سایہ نہ ہو تو نہ جانے کون بھیڑیا تمہیں ہڑپ کر جائے۔ مگر تمہیں یہ بات کون سمجھائے اور سمجھائے بھی تو تمہارا حسن پھیکا نہیں پڑ جائے گا۔ تمہاری آنکھوں میں چمکنے والے ستارے بجھ نہیں جائیں گے؟.......... تمہارے رخساروں کے گلاب مرجھا نہیں جائیں گے؟...... اس لیے جیو، رضیہ! جیو! اس وقت تک جیو جب تک اس دنیا کی حقیقت تم پر ظاہر نہیں ہوجاتی۔ یہ حادثہ نہ جانے کب ہوجائے— اس کے بعد تم زندہ نہیں رہ سکو گی...... یاد رہے آنکھوں کا جھپکنا اور ہاتھ پاؤں کا چلنا زندگی نہیں ہے...... اس طرح کے زندہ مردے تمہیں ہر طرف دکھائی دیں گے۔ وہ زندہ نہیں زندہ لاشیں ہیں۔ یہ جینا' دو طرح سے ہوتا ہے۔ ایک وہ لوگ جو اپنی دانست میں بڑے معرکے مارتے ہیں۔ آس پاس کے انسانوں کا، الو بنا کر اپنا الو سیدھا کرتے ہیں۔ اور دوسرے وہ جو اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیتے ہیں۔ جدھر کوئی لہر بہا کے لے گئی بہہ گئے...... لیکن ان دونوں صورتوں میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی— زندگی سے وہ آنکھ مچولی کی سی کیفیت— جناب تمہاری زندگی میں موجود ہے...... جب تک خدا کو منظور ہے...... سچ پوچھو تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ دنیا خدا کی رچائی ہوئی نہیں ہے۔ خدا کی اس قدر مکمل ذات اس دنیا کا سا ادھورا اور بے معنی کھیل رچائے؟— مجھے یقین نہیں آتا— یہ تو دیوتاؤں کی رچائی ہوئی دنیا معلوم ہوتی ہے۔ دیوتا— بیک وقت ارفع بھی ہیں اور اپنے احساسات کے غلام بھی— لیکن بھئی یہ تو اپنے اپنے ایمان کی بات ہے اس لیے میں اس سلسلے میں اور کچھ نہیں کہوں گا۔ میں تو دیوتاؤں...... یا خدا سے دعا کر سکتا ہوں کہ رضیہ کو جب تک خوش رکھ سکتے ہو رکھو...... اس کی دنیا چھوٹی سی ہی رہنے دو...... ایک ننھی سی پھلواری کی طرح......

تم— تم کیا جانو کہ تمہارے گھر کی چار دیواری کے باہر کیا ہو رہا ہے۔ کتنا بڑا دیش ہے تمہارا...... کتنی تعداد میں لوگ رہتے ہیں یہاں...... کیسی کیسی بولیاں بولتے ہیں

وہ۔ کیسی کیسی چوٹیاں، کیسی کیسی داڑھیاں اور کیسے کیسے کیش رکھتے ہیں یہ لوگ۔ کیسے کیسے نبی، کیسے کیسے گورو، کیسے کیسے اوتار پیدا ہوئے ان لوگوں کو گناہوں سے بچانے کے لیے...... اب ان سچائیوں کو بچانے کے لیے کیا کیا جتن کر رہے ہیں۔ یہ لوگ کیسے کیسے سیاست داں ہیں ان کے سرپرست — ان کے ناخدا بنے ہوئے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے دفعتاً انہیں ایک دوسرے سے عظیم خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ اور ایک دوسرے کی بوٹیاں اڑانے کے لیے کیا کیا منصوبے باندھے جا رہے ہیں......

...... لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں ہے...... نئی بات تو تمہارے ایسی لڑکیوں کا وجود ہے۔ پھر مشکل یہ ہے کہ بالکل تمہاری ایسی لڑکیاں ہندو بھی ہوتی ہیں سکھ بھی۔ پارسی بھی، عیسائی بھی امریکن بھی۔ جاپانی بھی، روسی، افریقی بھی — غرض کہاں تک گنوایا جائے...... کوئی حد ہی نہیں۔

یوں پوچھو تو کسی کو تمہاری اس محدود دنیا پر اعتراض نہیں ہے۔ آخر کسی کا کیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود...... اس کے باوجود ایسی ننھی منھی دنیائیں ضرور برباد کی جائیں گی۔ ان پر ایٹم بموں سے بھی زیادہ خطرناک بم گرائیں گے۔ خوب خوب خون بہایا جائے گا۔ خوب خوب دلوں کی دنیائیں برباد کی جائیں گی۔ مقصد؟ منزل؟ ان چیزوں کا کچھ پتہ نہ ہوگا کسی کو۔ کیوں کہ اصل چیز ہوگی خون، بربادی، تباہی اور بس۔

''اے رجو بیٹا! توے پر روٹی ڈالو۔ تمہارے ابا آ رہے ہیں مردانے سے......''

یہ لو تمہاری امّی کی آواز — آواز جا رہی ہے۔ ''اور موئی شمن کہاں گئی — کلمونہی۔''

اے لو — موئی یا کلمونہی شمن بھی آ گئی۔ جیسے پیڑ سے بیر ٹپک پڑے۔

دیکھو تو، کیسی بھیگی بلّی بنی تمہارے ساتھ سٹ کر بیٹھی ہے۔ کہتی ہے۔

''اجی رجو بہن سلام کہتی ہوں۔''

تم دبی آواز میں ڈانٹتی ہو۔ ''ذرا دھیرے سے — طوطا چشم کہیں کی۔''

''کیوں جی! کیا طوطا چشمی کی ہے ہم نے۔''

"واہ وا بڑی بھولی بنتی ہو۔
"بھولے تو ہیں ہی ہم۔"
"کیوں نہیں، بس دو چار تمہارے ایسے بھولے سارے شہر کو لے ڈوبیں۔"
"ٹھیک ہے تمہارے منہ سے نہ پھبے گی تو کس کے منہ سے پھبے گی یہ بات۔"
"ہاں ہاں میرے لیے بڑی جان جوکھوں میں ڈالی ہے تو نے...... ذرا آج کام پڑا..... تو غائب۔"
"غائب؟ ..... غائب کہاں؟"
"میری جانے جوتی۔"
"بس جی ٹھیک ہے تمہاری جوتی ہی تو جانے کدھر کو کچھ معلوم جو نہیں۔"
"معلوم کیا نہیں؟"
اس پر شمن کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ کر گرنے لگتے ہیں۔
"یہ آنسو بہانے کا مطلب۔"
"تمہیں عقل؟"
"آخر پتہ تو لگنا چاہئے۔"
"تمہاری جوتی سے۔"
"خیر جو بھی ہو رونا بند کرو امی نے دیکھ لیا تو بس......"
"ٹھیک ہے چت بھی میری پٹ بھی میری...... جبر جست مارے رونے بھی نہ دے۔"
"بھئی تم تو سر کے بالوں کو آتی ہے آخر بتاؤ بھی کیا بھید ہے۔ یہ کیا پہیلیاں بجھا رہی ہو؟"
"یار دو گھنٹے تک چھپے باتیں سنتے رہے سائیں جی کی اور امام دیا، بے گم جی نے یہ۔"

''اری سچ؟...... سچ باتیں سن تو نے۔''

''اور نہیں تو کیا؟''

''ہائے قربان جاؤں، صدقے جاؤں تجھ پر سے۔ لے اب رونا دھونا بند کر......
بتا میری بات بھی ہوئی کوئی؟''

''ہوئی۔''

''میرا تو کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا ہے...... بتا دے کیا کہا انہوں نے۔''

''ڈرو مت کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہوئی۔''

''جیسی بھی ہوئی ہو بولو کہہ ڈالو۔''

''سائیں جی نے تمہاری بات چھیڑ کر کہا۔ حاجی صاحب بٹیا کی شادی کر ڈالو۔''

''ابا کیا بولے۔''

''بولے ہاں کر دیں گے پر کوئی لڑکا بھی تو ملے۔''

پھر سائیں جی نے کیا کہا؟''

''بولے...... بٹیا کے لیے لڑکوں کی کیا کمی؟''

''اچھا تو ابا کیا بولے۔''

''کہا سائیں جی آپ ہی مدد کیجئے۔''

''ارے رے رے...... تو سائیں جی......''

''سائیں جی کچھ نہیں بولے چپ چاپ حقہ گڑگڑاتے رہے......''

اس گفتگو کو دو ہفتے گزر چکے ہیں لیکن تمہاری حالت میں انقلاب سا آ گیا ہے۔ تم سخت مایوس ہو چکی ہو۔ اب تم کھڑکی کھول کر میدان کی طرف کبھی نہیں جھانکتیں۔ حالانکہ شمن تمہیں اکثر بتاتی ہے کہ وہ میدان میں کھڑا ہے لیکن تم سمجھ چکی ہو کہ یہ عشق وشق بے کار ہے۔ نہ تمہارے اندر اتنا دم ہے کہ تم اسے محبت کے سلسلے کو جاری رکھ سکو کیونکہ تم جانتی ہو...... کہ...... تمہارا وہ، تمہارا نہیں ہوسکتا۔

تم اکثر فرصت کے وقت اسی کمرے میں گزارتی ہو جہاں محبت کی نشانی وہ کھڑکی ہے جس میں سے جھانک کر تم اپنے پیارے کے درشن کیا کرتی تھیں۔ ایسی ہی یہ ایک دوپہر ہے ثمن اور تم دونوں چٹائی پر بیٹھی ہو۔ تم چپ ہو، گال زرد، آنکھوں کے تلے گڑھے، ہونٹ خشک۔

کھڑکی پر کنکر لگنے کی آواز آتی ہے، شریر ثمن فوراً اٹھ کر کھڑکی کے پٹ کھول دیتی ہے...... اوہ...... اوہ...... سامنے سائیں جی کے مکان کی کھڑکی میں...... تم اداس آنکھیں اٹھا کر دیکھتی ہو...... تمہاری کمزور سی آواز نکلتی ہے۔ ''کون؟''

ثمن شوخی سے کہتی ہے۔ ''اری وہی...... تمہارے وہ!''

وہ

وہ!...... وہ حیدر تھا۔

اس نے کھلی کھڑکی میں سے رضیہ کو دیکھا اور ابھی جی بھر کر دیکھ بھی نہ پایا تھا کہ وہ آگے بڑھی...... ایسے جیسے وہ نیند کی حالت میں چل رہی ہو...... پہلے وہ سمجھا کہ رضیہ آگے بڑھ کر اس سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ لیکن اس نے بغیر کچھ کہے کھڑکی کے پٹ بڑے زور سے بند کر دیے...... خدا خدا کر کے اس کھڑکی کے پٹ کھلے تھے...... مگر......

آخر یہ کیا معمہ ہے۔ وہ سوچنے لگا۔

کیا رضیہ بدل گئی ہے...... کیا اس کی شادی کہیں اور طے ہوگئی ہے۔ لیکن رضیہ! بے وفا رضیہ!! اتنی جلدی بھول جانے والی رضیہ!!!...... تم حیدر کو بھلا بھی دو تو کیا حیدر بھی تمہیں بھلا سکے گا؟

مگر نہیں — حیدر نے سوچا، اس قدر جلد بازی سے کام لینا مناسب نہیں ہے۔

سائیں جی، نرسوں ہی تو کہہ رہے تھے کہ رضیہ کی شادی کہیں طے نہیں ہوئی—— رضیہ بے وفا نہیں...... وہ مجھے ہرگز نہیں بھلا سکے گی......

کون جانے، رضیہ ایک نو عمر، معصوم پردہ دار لڑکی کن مصائب میں گرفتار ہے۔ اور پھر مجھے یہاں سائیں جی کے مکان میں دیکھ کر بھی تو وہ بوکھلا گئی ہوگی۔

حیدر کمرے میں ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ اس کے ذہن میں خیالات ہجوم در ہجوم چلے آ رہے تھے۔ وہ خود پریشان تھا کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔

اتنے دنوں بعد رضیہ کی صورت نظر آئی تھی لیکن اب اس کی شکل کس قدر بدل گئی تھی...... وہ کس قدر کمزور، اداس، اور مضمحل سی نظر آتی تھی...... اور وہ ایک لڑکی،...... وہ لڑکی کون تھی لباس اور صورت سے تو نوکرانی ہی دکھائی دیتی تھی......

بہتر ہو کہ میں اسے ایک چٹھی لکھ ڈالوں اور یہ چٹھی کسی نہ کسی طرح وہاں تک پہنچ ہی جائے گی...... سارے حالات جاننے کے بعد وہ بھی جواب دے سکے گی۔

یہ سوچ کر حیدر اسی وقت تپائی کے قریب بچھی ہوئی کرسی پہ بیٹھ گیا۔ کاغذ سامنے رکھا اور قلم کے سرے سے پیشانی بجانے لگا۔ اور پھر لکھنا شروع کیا۔

میری رضیہ

پیار

دفعتاً سائیں جی کے کمرے میں دیکھ کر تم یقیناً گھبرا گئی ہوگی تمہاری گھبراہٹ ایک قدرتی امر تھا۔ مگر پہلے میں تمہیں جلدی سے بتادوں کہ میں یہاں کیسے پہنچا۔

میں یہاں خود بخود نہیں آیا بلکہ لایا گیا ہوں۔ کیسے؟ تم حیران رہ جاؤ گی۔

پچھلے دنوں جب تمہاری کھڑکی سدا بند رہنے لگی تو بھی میری آمد ورفت بدستور جاری رہی۔ اگرچہ میں حیران تھا کہ آخر اس کا سبب کیا ہوسکتا ہے۔

ہاں ان چٹھیوں کے بارے میں بھی میں بہت پریشان ہوں...... آخر تمہیں بتانا تو چاہئے تھا کہ تم پر کیا گزری۔ اس طرح خاموش ہوجانا تو سچ مچ بڑی حماقت کی بات

تھی۔

خیر جیسا کہ میں نے کہا کہ میں ہر روز آتا اور گھنٹوں کھڑکی کے آگے ٹہلا کرتا۔ مگر تم نے تو گویا قسم ہی کھالی کھڑکی نہ کھولنے کی۔

پانچ روز پہلے کی بات ہے کہ میں حسب معمول ٹہل رہا تھا کہ سائیں جی نہ جانے کہاں سے وہاں آ پہنچے انہیں دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے میں نے یوں ہی ادھر اُدھر نگاہ دوڑانی شروع کردی۔ قریب پہنچ کر سائیں جی نے پوچھا بیٹا! کچھ گم ہو گیا ہے؟ جی ہاں — میری میز کا ایک پیپر ویٹ گر گیا ہے۔ وہ بولے۔ یہ سامنے کا مکان میرا ہی ہے۔ ذکر نے لسے کھڑکی میں رکھ دیا نہ جانے کب گر گیا۔ ہے تو پیپر ویٹ پر کسی نے طور تحفہ دیا تھا۔ اس لیے اسے تلاش کرنے کے لیے ادھر چلا آیا ہوں۔"

میں نے بھی اپنی خدمات پیش کردیں۔ ان کے ساتھ مل کر پیپر ویٹ تلاش کرنے لگا۔ جو ہمیں ملا نہیں خوش قسمتی سے انہوں نے یہ نہیں پوچھا کہ میری کیا شے گم ہوگئی تھی۔ باتوں باتوں میں تکلف دور ہوگیا۔ کچھ سیاسی باتیں چھڑ گئیں۔ تم جانتی ہی ہو میں مسلم لیگ کا سرگرم کارکن ہوں۔ انہیں میری ذات سے دلچسپی سی پیدا ہوگئی۔ مجھے گھر لے آئے۔ میں نے بھی موقع غنیمت جانا اور جلد ہی ہماری گاڑھی چھننے لگی۔ سائیں جی بڑے بھولے بادشاہ ہیں۔ کچھ نہیں سمجھتے۔ میں نے بڑی تکرّم سے تمہارے بارے بھی ان سے معلومات حاصل کیں۔

قیاس کہتا ہے کہ تمہارے گھر والوں کو ان چٹھیوں کی کچھ خبر نہیں ہے۔ اور نہ تمہاری شادی وادی ہی کہیں ہو رہی ہے۔

اچھا اب تم سارا حال لکھو۔ تم پر کیا گزری۔ اور مجھ سے ایسی بے رخی کی وجہ کیا ہے۔

دیکھو کتنی لمبی چٹھی لکھی ہے۔ تم بھی ذرا تفصیل سے لکھنا۔

ہمیشہ تمہارا

حیدر

اس نے چٹھی کورے لفافے میں بند کر کے رکھ دی۔ اب اسے رضیہ تک پہنچانے کا مسئلہ درپیش تھا۔ اس کے لیے حیدر کو دو دن انتظار کرنا پڑا۔ کیوں کہ کھڑکی کھلی نہیں۔ ایک ذریعہ وہ لڑکی ہوسکتی تھی جو رضیہ کے ساتھ کمرے میں کھڑی تھی۔ وہ دن میں بار بار اس محلے میں جاتا۔ سائیں جی سے ملاقات کا سہارا تو مل ہی چکا تھا۔ لیکن وہ لڑکی (شمن) کہیں نظر نہ آئی۔

تیسرے دن وہ کنویں پر کھڑی دکھائی دی۔ پہلے تو حیدر اِدھر اُدھر ٹہل کر یہ جاننے کی کوشش کرتا رہا کہ آیا وہ وہی لڑکی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ غلطی سے کسی غیر کے ہاتھ چٹھی پڑ جائے۔

خاصی دیر تک جانچنے کے بعد بھی اسے پورا اطمینان نہیں ہوا۔ پھر دفعتاً لڑکی نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔ اس سے اسے یقین آ گیا کہ ضرور لڑکی نے مجھے پہچان لیا ہے اور یہ وہی لڑکی ہے۔ کنویں پر ایک آدھ بار لڑکی کا نام بھی پکارا گیا۔ تو اب وہ اس کے نام سے بھی واقف ہوگیا۔۔۔ کچھ دیر بعد شمن پانی کی بالٹی لیے گلی کے نکڑ پر پہنچی تو حیدر نے آواز دی۔

''شمن۔''

اپنا نام سن شمن بہت گھبرائی لیکن رک گئی حیدر نے چپکے سے لفافہ اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے جلدی سے سرگوشی میں کہا۔

''رضیہ کے لیے ہے۔ کوئی اور کھولنے نہ پائے۔'' یہ کہہ کر وہ تو آگے بڑھ گیا...... اور شمن گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ مگر خیریت گزری۔ کسی کی توجہ ادھر تھی ہی نہیں۔

وہ چٹھی چھپائے رضیہ کے پاس پہنچی وہ اس وقت انگیٹھی میں ڈالنے کے لیے پتھر کے کوئلے توڑ رہی تھی۔

شمن نے قریب بیٹھ کر کہا۔

"اے جی۔"

وہ چپ رہی۔

"او جی۔"

وہ پھر چپ۔

"چپ شاہ کا روزہ رکھا ہے کیا۔"

وہ پھر بھی نہ بولی۔ اس پر شمن نے اس کی ایک بھرپور چٹکی لی۔

"اوئی۔"

"جی"

"کیا ہے...... کیوں جلی کو جلاتی ہو۔"

"ہم اس پر ڈالنے کے لیے کنوئیں سے تازا اور ٹھنڈا پانی لائے ہیں۔"

"اپنے سر پر ڈال لو نا یہ پانی"

"میرے سر پر ڈالنے سے تمہاری آگ کیسے بجھے گی۔"

"بیکار بیکار تنگ مت کیا کرو۔"

"ہم جب تنگ کرتے ہیں تو اس کا کچھ مطلب ہوتا ہے۔"

"کیا مطلب ہے ہم بھی تو جانیں......"

"پوچھو تو بتائیں۔"

"پھر آئی اپنی اوقات پر۔"

"نہیں پوچھو تو بتائیں گے بھی۔"

"اچھا پوچھتے ہیں۔"

اس پر شمن نے تامل کیا اور پھر معاً آنکھیں نچا کر بولی۔

"آپ کے وہ ملے تھے۔"

''میرے وہ...... ہٹ پاجن''

''سچ۔''

''در''

''نہیں مانتیں؟''

''بھئی ہمیں ستایا نہ کرو۔''

''اس میں ستانے کی بات ہے؟''

''اب بکواس جو کر رہی ہو۔''

''بکواس نہیں ٹھیک بات کہہ رہے ہیں۔''

''ہٹ۔''

''پھر ہٹ؟ اگر ثبوت پیش کر دیں تو؟''

''ثبوت؟''

''ہاں پکا ثبوت۔''

اب رضیہ کے ہاتھ رک گئے۔

''دیکھ اب پٹے گی میرے ہاتھ سے۔''

''کون جانے— ہوسکتا ہے پٹنے کی بجائے مٹھائی کھلانی پڑے تم کو—''

''اچھا تو کھلاؤں مٹھائی؟''

''کھلاؤ۔''

رضیہ نے کوئلے توڑنے والا ڈنڈا اوپر اٹھایا تو شمن نے لفافہ اس کے آنکھوں کے آگے نچا دیا۔''

''یہ لفافہ کیسا ہے۔''

''مٹھائی کھلاؤ''

''بتاؤ نا بھئی۔''

"اچھا پہلے یہ ڈنڈا نیچے کرو۔"

"یہ لو نیچا کردیا۔"

"تو یہ لو ثبوت تمہارے ہاتھ میں پہنچ گیا۔"

رضیہ نے لمحہ بھر تک لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو اوپر والے سنسان کمرے کی طرف دوڑ پڑی۔

مارچ 1957 میں لاہور فرقہ وارانہ فسادات کا شکار ہوگیا۔ اب یہ آگ امرت سر کے بہت قریب آن پہنچی تھی۔

حیدر مسلم لیگ کا ایک سرگرم کارکن تھا۔ حالاں کہ وہ عمر کے لحاظ سے نوجوان ہی تھا۔ لیکن اس کے سیاسی خیالات خاصے سلجھے ہوئے تھے۔ وہ اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ مسلمانوں کے لیے الگ پاکستان بننا ہی چاہئے۔ اس کے حق میں وہ کئی دلائل پیش کرسکتا تھا۔ اس کا خیال یہ تھا کہ اگر ہندو مسلمان الگ الگ حصوں میں رہیں تو ان کے تعلقات بہتر ہوسکیں گے۔ اس طرح سے وہ اپنے اپنے کلچر کو ابھار سکیں گے، اور ہمیشہ کے لیے دو اچھے ہمسایوں کی طرح ایک دوسرے سے ہمدردی اور پیار کریں گے۔ اس کے سینہ میں ایک پر خلوص، سادہ، اور معصوم دل دھڑکتا تھا۔ وہ ان فسادات اور جھگڑوں کے حق میں نہیں تھا۔ لیکن اس کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر پاکستان کے حصول کی راہ میں ہندو یا سکھ اس حد تک مزاحمت کریں کہ لڑائی ناگزیر ہوجائے تو مسلمانوں کو اس کے لیے بھی تیار رہنا چاہئے۔

لاہور سے بری بری خبریں آرہی تھیں۔ امرتسر میں بھی باہمی کشیدگی دن بدن بڑھ رہی تھی۔ اور نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کس وقت کیا ہوجائے۔

رضیہ کا محلّہ ہندو، سکھ اور مسلمانوں کا ملا جلا محلّہ تھا لیکن حیدر خالص اسلامی محلے میں رہتا تھا۔ ہر چہار جانب افواہیں پھیل رہی تھیں کہ فلاں قوم فلاں پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہی ہے۔ ہندو، سکھ اور مسلمان اپنے اپنے محلوں میں خفیہ جلسے منعقد کر رہے

تھے۔ ایک دوسرے کی طاقت کے جائزے لیے جا رہے تھے۔ حالاں کہ پبلک کے ذرائع محدود تھے۔ لوگ بندوقیں یا اور خطرناک قسم کے ہتھیار حاصل نہیں کر سکتے تھے پھر بھی جو کچھ بن پڑا۔ انہوں نے اکٹھا کیا۔ مثلاً لاٹھیاں، چاقو، بھالے، تیزاب، گھروں کی چھتوں پر اینٹیں وغیرہ۔

حیدر کے لیے یہ بڑی مصروفیت کے دن تھے۔ اسے بار بار رضیہ کا خیال آتا تھا۔ اس کی معصومیت کا خیال آتا تھا۔ بھلا وہ غریب ان سب باتوں کو کیا سمجھے؟ لیکن یہ سب پیچیدہ مسائل یہ فسادات یہ نفرت، یہ کش مکش— ان میں سچ مچ سمجھے جانے کی کوئی بات بھی ہے۔ کبھی وہ اپنی محبت پر غور کرنے لگتا۔ دو دل دنیا میں کتنی کم جگہ چاہتے۔ کس قدر کم مانگیں ہیں ان کی—دو دلوں کی دنیا کس قدر سادہ' مختصر— اور پھر کس قدر وسیع ہے.......... اونہہ یہ سب جذاتی باتیں ہیں۔ خیالی اڑانیں...... لیکن یہ سیاسی کشمکش، یہ تہذیب اور تمدن کے نام پر باہمی لڑائیاں...... کیا یہ بہت اونچی چیزیں ہیں۔ کیا یہ جذباتی چیزیں نہیں ہیں؟......

فرض کیا دو گروہوں میں شدید اختلافات ہیں ہی تو اس سے زیادہ سادھارن اور مبنی بہ انصاف فیصلہ کیا ہوسکتا ہے کہ وہ دو گروہ الگ الگ رہنے پر رضا مند ہو جائیں...... مگر ہندو اور سکھوں کے دماغ میں یہ بات گھس ہی نہیں پاتی تھی۔ یہی لوگ نئے پر ٹنٹا کھڑا کیے جا رہے ہیں۔

اس طرح گھنٹوں اس کا دماغ ان مسائل کی پیچیدگیوں میں گم رہتا، وہ اپنی عقل اور سوجھ بوجھ کے مطابق انہیں سمجھنے کی کوشش میں لگا رہتا...... حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ اب اس کا شہر کے ہر محلے میں بے دھڑک آنا جانا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اگر اسے رضیہ کی چٹھی کا انتظار نہ ہوتا تو وہ جان خطرے میں ڈال کر ان کے محلے کے چکر نہ لگاتا۔

ایک روز جب کہ وہ سائیں جی کے گھر میں اکیلا بیٹھا تھا۔ سائیں جی ذرا بھینس

کو تیچھا رہے تھے۔۔۔ شمن آئی اور بڑی ہوشیاری سے ایک رقعہ اس کے قریب پھینک کر چلتی بنی۔

وہ بہانہ کر کے سائیں جی سے رخصت لے کر اپنے گھر پہنچا اور تنہائی میں رقعہ پڑھنے لگا۔ لکھا تھا۔

آپ ادھر محلے میں نہ آیا کریں، شہر میں گڑبڑ ہے اس رقعے میں سب کچھ لکھے دیتی ہوں لیکن وعدہ کیجئے کہ جب تک ہنگامہ ہے تب تک آپ ادھر کا رخ نہ کریں گے۔

آپ کہتے ہیں کہ سائیں جی بڑے بھولے بادشاہ ہیں لیکن میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ وہ سب کچھ جانتے ہیں۔ کیونکہ وہ دو رقعے جو آپ نے ہماری کھڑکی میں پھینکے تھے وہ انہیں کے گھر میں جا گرے تھے۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ انہوں نے وہ رقعے ضرور پڑھے ہوں گے۔ اور پھر خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے دونوں رقعے ہماری کھڑکی میں پھینک دیئے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا یہ ارادہ نہیں تھا کہ میرے والدین کو اس امر کا پتہ چلے۔ اتنے دن گزر گئے انہوں نے اگر والد صاحب سے اشارہ کیا ہوتا تو مجھ پر قیامت آجاتی۔ لیکن ابھی تک کچھ نہیں ہوا۔ اس لیے میں نے تو یہی نتیجہ نکالا ہے کہ انہیں ہم سے ہمدردی ہے۔

مجھے تو یہاں تک شک گزرتا ہے کہ آپ کی بھی ان کی راہ و رسم محض اتفاقیہ نہیں ہے انہوں نے ایسا جان بوجھ کر کیا ہے۔ اس لیے میری تو رائے یہی ہے کہ آپ ان سے راز کی بات کہہ دیں۔ وہ ہمدرد بھی ہیں اور بزرگ بھی۔ ممکن ہے کہ ان کی مدد اور دعا سے ہمارا بیڑا پار لگ جائے۔

یہ جھگڑے رگڑے جو پنجاب میں چل رہے ہیں مجھے ان سے کچھ دلچسپی نہیں ہے۔ میں کم عقل ہوں غالباً ان معاملات کی تہہ کو نہیں پہنچ سکتی۔ لیکن مجھے ہندو سکھوں سے قطعاً کوئی نفرت نہیں ہے۔ وہ بھی تو اللہ کے بندے ہیں۔ انہیں بھی اللہ نے پیدا کیا

ہے۔ وہ بھی ہماری طرح کے انسان ہیں۔ ہوسکتا ہے میں بڑی ناسمجھی کی بات کہہ رہی ہو لیکن میری عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ آخر سب لوگ چاہتے کیا ہیں مجھ سے کوئی پوچھے تو میں کہوں گی کہ میں آپ کو چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں ہم دونوں کا ایک گھر ہو۔ ہمارے اڑدس پڑوس بے شک ہندو بھی ہیں سکھ بھی رہیں یا کوئی اور بھی رہے۔ ہم اپنے طریقے سے رہیں وہ اپنے طریقے سے رہیں۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کریں۔ ایک دوسرے سے ہمدردی رکھیں ...... لیکن اور لوگوں کو اس طرح رہنے کا شوق نہیں ہے؟— اور اگر ہندو مسلمان ایسا محسوس کرتے ہیں وہ لوگ الگ الگ وطن بنانا چاہتے ہیں۔ تو سب اسی پر رضا مند کیوں نہیں ہوجاتے۔ آخر اس لڑائی بڑائی اور خون خرابے سے حاصل کیا ہوگا......؟ آپ بڑے سیاست داں بنے پھرتے ہیں۔ جھگڑے نمٹنے نپٹانا آپ کا کام ہے۔ نہ جانے آپ لوگوں کی سیاست کیا کہتی ہے اس باب میں—

آج تو میں بہک سی گئی ہوں۔ اب اور زیادہ نہیں بہکوں گی۔ اس لیے چٹھی ختم کرتی ہوں اور آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ آپ یوں ہی بلا وجہ بے دھڑک نہ گھوما کریں۔ مجھے ہر وقت اس کی فکر لگی رہتی ہے۔ بہتر ہے اگر آپ اس وقت تک کہ جب تک شہر میں دھاندلی مچی ہے ادھر اُدھر آنا جانا ترک کر دیں۔

ہمیشہ آپ کی

رضیہ

بھلا حیدر کوچۂ جاناں میں جائے بغیر کیوں کر رہ سکتا تھا۔ اسی شام وہ سائیں جی کے ہاں پہنچا۔ اسے رضیہ کی تجویز پسند آئی تھی کہ وہ سائیں جی سے اس معاملے پر گفتگو کرے حالاں کہ اسے بڑی شرم محسوس ہو رہی تھی کہ گفتگو کا آغاز کیوں کر کرپائے گا۔ سارے حالات معلوم ہوجانے کے بعد اسے یقین سا آگیا کہ ضرور سائیں جی کی نیت بخیر ہے، اور وہ ان دونوں کے ہمدرد ہیں۔

سائیں جی کے پاس پہنچ کر اسے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔

اس وقت سائیں جی چلم تازہ کیے ایک پیچوان حقے سے شغل فرما رہے تھے۔ اُدھر دھواں فضا میں پیچ و تاب کھاتا اڑ رہا تھا اور ادھر دل میں کچھ کہنے کہہ ڈالنے کی امنگ پیدا ہوتی اور کلبلا کر رہ جاتی۔ اتنے میں سائیں جی بول اٹھے۔

"کہو برخوردار رقعہ پڑھ چکے؟"

حیدر چونکا۔ دیکھا کہ سائیں جی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی ہے۔ اسے حیرت اس امر پر تھی کہ جس وقت شمن نے اسے رقعہ دیا تھا۔ اس وقت سائیں جی ان کی طرف پشت کیے گائے کو تھپتھپا رہے تھے۔ تاہم حیدر نے انجان بن کر سوال کے جواب میں سوال کر دیا۔

"کیسا رقعہ؟"

"وہی جو تمھیں ملا تھا۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"جو شمن نے لا کر دیا تھا۔"

"شمن نے؟"

اس پر سائیں جی نے اسے اپنے پاس بٹھلاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو صاحب زادے! اب تم اس منزل پر پہنچ چکے ہو جہاں پر تمھیں ایک خضر راہ کی ضرورت ہے..... اس لیے ہو مت۔"

یوں تو حیدر بھی ٹھانے ہوئے تھا کہ سائیں جی کو دل کا حال کہہ سنائے گا۔ لیکن اس اچانک حملے نے اسے بوکھلا دیا تھا۔ جو بات وہ ہیر پھیر سے کہنا چاہتا تھا اس کا اس قدر کھلم کھلا اعتراف کرنے میں اسے تامل ہو رہا تھا لیکن سائیں جی کے دستِ شفقت کے زیرِ اثر وہ کچھ اور کرتا بھی کیا چنانچہ اس نے سر جھکا کر کہا:

"سائیں جی آپ اصل ماجرا بھانپ چکے ہیں..... آپ کے سامنے اس امر کا اعتراف کرنے میں جھجک محسوس ہوتی تھی۔"

''ہاں بیٹا! حیدر بھانپ تو گیا ہوں۔ بلکہ بہت مدت سے اس راز سے واقف ہوں۔ لیکن میں نے دخل نہیں دیا...... البتہ اب میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا دخل دینا ضروری ہوگیا ہے...... مجھ سے کچھ پردۂ راز میں رکھنے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ میں تم دونوں کی بہتری و بہبود چاہتا ہوں......''

''میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ کیوں کہ اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ بزرگ لوگ ان باتوں کو بہت برا سمجھتے ہیں............

''درست ہے یہ راستہ ایسا نہیں جس پر چلنے کی سب کو کھلی اجازت دی جاسکے۔ لیکن تم دونوں کے معاملے میں میں نے محسوس کیا ہے کہ تمہاری محبت تو ذوق نمو کی علامت ہے۔ رضیہ میرے ہاتھوں میں پلی آنکھوں کے سامنے بڑھی...... تمہارے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا تھا...... اسی لیے میں نے تم سے تعلقات پیدا کیے اور تمہاری شخصیت اور تمہارے حالات کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں تمہارے دل میں بھی ایک حقیقی جذبہ کارفرما ہے۔تم دونوں کے دل میں جیون ساتھی بننے کی خواہش کوئی گناہ نہیں ہے اور نہ اس میں شرمانے کی بات ہے۔ یوں آج کل کے عشق باز لونڈے اس جذبے کی پاکیزگی اور طہارت سے واقف نہیں ہوتے...... حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ یہی ایک جذبہ انسان کو تہذیب تمدن کی راہ پر ڈالنے والا ثابت ہوتا ہے۔ یہ جذبہ ایک چھوٹا سا گھر بساتا ہے۔ وہ گھر جس میں مثبت اقدار جنم لیتی ہیں۔ وہ گھر جسے بنانے اور سنوارنے کے لیے اوتار اور نبی پیدا ہوئے...... برخوردار انسان کی خوشیاں نہایت چھوٹی چھوٹی باتوں پر پنہاں ہوتی ہیں۔ ہم ان چھوٹی چھوٹی باتوں کومحسوس کرنے سے انکار کردیتے ہیں۔ ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو حاصل کرنے اور پھیلانے کے اصول بھی ننھے ننھے ہیں۔ جنہیں اپنانے سے ہم سدا انکار کرتے ہیں...... ہم بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں۔ پر شور نعرے گھڑتے ہیں۔ اونچے اونچے نصب العین اپنے سامنے رکھتے ہیں جنہیں پورا کرنے کے لیے ہم بزعم خود بڑی بڑی قربانیاں دیتے ہیں۔

شہید اور غازی کہلاتے ہیں..... اور شیر خوار بچے کی سی معصوم انسانیت کا ان جنگوں میں دم گھٹ کر رہ جاتا ہے ہمیں دوست اور دشمن کا پتہ نہیں چلتا۔ زندگی اور موت کا راز ہم سے منہ چھپا کر دور بھاگ جاتا ہے— یہ انسان کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔"

حیدر کچھ دیر تک چپ رہا پھر بولا۔"سائیں جی آپ تو عمر تجربے اور علم کے اعتبار سے مجھ پر فوقیت حاصل ہے۔ اس لیے میرا اس سلسلے میں کچھ کہنا چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی۔ میں آپ کے خیالات سے زیادہ تر متفق ہی ہوں لیکن آپ ذرا دور چلے گئے۔ آپ جو کہتے ہیں کہ ہم بڑے بڑے نعرے گھڑتے ہیں اور اونچے نصب العین مقرر کر کے غلطی کرتے ہیں تو اس سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی وہ موقعے ہوتے ہیں جب انسان کے جوہر کھلتے ہیں۔ جب قومیں کروٹیں بدلتی ہیں۔ جب تہذیب و تمدن پرانی منزل چھوڑ کر نئی منزل کی راہ پر گامزن ہوجاتے ہیں۔"

سائیں جی مسکرادیے اور پھر بڑی مدھم آواز میں بولے:"مجھے اس بات کا قطعاً رنج نہیں ہے کہ تم مجھ سے ہر بات میں اتفاق نہیں رکھتے۔ ایسے موقعوں پر میں ایک شخص کو براہ راست زندگی کے تجربے سے نتائج اخذ کرنے کی پوری پوری آزادی دے دیتا ہوں۔ اگرچہ میں اپنے دل میں قائل ہو چکا ہوں کہ قوموں میں کروٹوں کے دن تمام ہو چکے اور ہر نئی منزل کی جانب گامزن ہونے کے یہ فرسودہ طریقے ہر لحاظ سے بے کار ہو چکے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حضرت انسان کب تک اپنی ضد پر اڑے رہتے ہیں۔ کب تک وہ ان طریقوں کو خیر باد نہیں کہتے— ہمارا زمانہ بیت چکا اب یہ تمہارا زمانہ ہے۔ کبھی گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر محبت کے اس جذبے پر غور کرو سوچو اور سمجھو..... اس بوڑھے نے تو بس یہ چاہا تھا کہ اس کی ارتھی کو کندھا دینے والوں میں ہندو سکھ عیسائی، مسلم سبھی شامل ہوں۔ میری یہ چھوٹی سی خواہش شاید بہت بچگانہ ہے۔ شاید خود غرضانہ ہے— جو کچھ بھی ہو تمہاری دنیا نے اس ضعیف و نزار انسان کو شکست دے دی۔ لیکن میرا ایمان ہے کہ یہ شکست عارضی ہے..... یہ بوڑھا جوانوں کے دلوں میں ایک بار پھر

زندہ ہوگا...... اور اس کے بعد یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ رہے گا۔

اس پر دونوں طرف خاموشی طاری ہوگئی جو بہت دیر تک مسلط رہی۔ بالآخر سائیں جی نے مہر سکوت کو توڑا۔

''خیر چھوڑو ان باتوں کو— میں نے سوچا یہ ہے کہ ادھر رضیہ کے والد صاحب سے مل کر اور ادھر تمہارے والد صاحب سے مل کر یہ معاملہ طے کروا دوں۔ کہو منظور ہے۔''

حیدر نے جھینپ کر جواب دیا۔ منظور ہے۔

شہر کے حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے تھے۔ یہاں تک دن دھاڑے چھرے بازی لڑائی دنگے کی وارداتیں ہونے لگیں۔ حیدر کے والدین نے اسے اپنے محلے سے باہر جانے سے منع کردیا......

ان کے محلے سے ملا ہوا ہندو سکھوں کا محلہ تھا۔ ان کی گلی ختم ہوتی تھی اور ان کی شروع ہوجاتی تھی۔ دونوں طرف سے خوب زور شور سے نعرے لگائے جاتے۔ ملک تقسیم ہوچکا تھا۔ پولس اور فوج کا غیر جانبدارانہ رویہ بھی اب بدل رہا تھا۔

اس افراتفری میں سائیں جی حیدر کے باپ سے ملے۔ سب حالات معلوم کیے۔ اُدھر حاجی صاحب سے بھی انہوں نے حیدر اور اس کے خاندان کی تعریفیں کیں۔ دونوں باپوں کو ملا دیا یہاں تک کہ دونوں بچوں کی منگنی طے ہوگئی۔ سائیں جی کو بہت خوشی ہوئی۔ حیدر اور پھر رضیہ کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔

حیدر خوش تھا لیکن اس وقت اس کی توجہ کچھ بٹی ہوئی بھی تھی۔ شہر میں مسلمانوں پر جو زیادتیاں ہو رہی تھیں اس سے اس کا خون کھولتا تھا۔ یوں تو ہر مذہب والے اپنے آپ کو مظلوم سمجھتے تھے۔

کچھ مسلمان نوجوان حیدر کے ساتھ تھے۔ حالاں کہ وہ کوئی ناجائز حرکت کرنا نہیں چاہتے لیکن وہ ڈرتے بھی نہیں تھے۔ اورمقابلہ پڑنے پر دشمن سے بھڑ جانے میں

ایمان رکھتے تھے۔

اسی اثنا میں حاجی جی نے کچھ انتظام کیا اور امرت سر سے راولپنڈی کو روانہ ہو گئے۔ رضیہ بھی ان کے ساتھ چلی گئی۔ وہ عارضی طور سے گئے تھے۔ یہ سوچ کر حالات موافق ہونے پر لوٹ آئیں گے...... سائیں جی امرت سر میں ہی رہے۔ حاجی جی اپنا مکان اور دوکان انہیں کو سونپ گئے تھے۔

اب مختلف محلوں کی آپس میں لڑائیاں بھی ہونے لگیں۔ لوگوں پر ایک پاگل پن سوار تھا۔۔۔ ایک دوسرے کی زیادتیاں دیکھ دیکھ اور خون کھولتا چنانچہ اور زیادہ بربریت سے کام لیا جاتا۔

حیدر کے جی میں آتا تھا کہ ایک لشکر تیار کرے اور ہندو سکھوں کو روندتا ہوا ہند کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جا پہنچے۔ وہ کہتا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے کلچر اور تہذیب بنیادی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس لیے ان کا ایک جگہ رہنا ہی ناممکن ہے۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان کے مخالفین جان بوجھ کر قیامِ پاکستان کے راستے میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔ یہ تلخی بڑھتے بڑھتے اب نفرت کا روپ دھار چکی تھی۔

ان کے محلے کی بھی دوسرے محلے سے جھڑپیں ہو چکی تھیں۔ بعض اوقات انہوں نے ایک دوسرے کو سخت چوٹیں بھی پہنچائیں۔ ایک روز ان کے محلے کا ایک مسلمان بہت سے زخم کھا کر آیا۔ زخموں اور خون کی بہتات کے مارے اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔

یہ نظارہ دیکھ کر ان سب کا خون کھول اٹھا۔ اتفاق سے ادھر سے تین ہندو گزرے انہوں نے ان پر ہلّہ بول دیا۔ مارنے والے بہت سے تھے ممکن تھا کہ وہ تینوں مارے جاتے لیکن اتفاقاً وہاں پولیس کی لاری آ گئی اور سپاہیوں نے فسادیوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور متعدد آدمیوں کو گرفتار کر کے لے گئے۔

ان میں حیدر بھی شامل تھا۔

ہم

اگست 1947 میں پنجاب میں جو فسادات اور خون خرابے ہوئے ان کی کچھ کچھ خبریں حیدر کو جیل میں ملتی رہیں۔ اس کے ساتھی جو گرفتار ہوئے تھے۔ اس کے ہمراہ نہیں رکھے گئے۔ رفتہ رفتہ نفرت اور بربریت کی آگ کچھ دھیمی پڑی تو دونوں حکومتوں کے مابین صلح، صفائی کی باتیں ہونے لگیں۔ قیدیوں کا تبادلہ ہونے لگا۔ جو لوگ حیدر اور اس کی پارٹی کے ہاتھوں زخمی ہوئے تھے۔ وہ مرے نہیں بچ گئے، اور پھر دنگے فساد میں پورا مجمع حصہ لے رہا تھا۔ اس لیے وہ نظر بند رہے اور ان کا معاملہ یوں ہی کھٹائی میں پڑا رہا۔ یہاں تک کہ قیدیوں کے تبادلے کی خبریں بھی ان کے کانوں تک پہنچنے لگیں کچھ قیدی بھی ان کی جیل سے ہٹا لے گئے، حیدر کو اِدھر اُدھر کی افواہوں سے یقین ہونے لگا کہ وہ جلد آزاد ہو جائے گا۔

وہ دن آ پہنچا۔ حیدر اور کچھ اور قیدیوں سے کہا گیا کہ انہیں ایک ہفتے کے اندر اندر بتا دے میں پاکستان کی سرحد تک پہنچا دیا جائے گا۔

حیدر کا دل ناچ اٹھا۔ وہ تقریباً آٹھ مہینے سے جیل میں بند تھا۔ اب وہ اپنے خوابوں کی دنیا میں پہنچنے والا تھا۔ اس کا پاکستان! پیارا پاکستان! دنیا کی سب سے نئی اسلامی سلطنت۔ وہ پاکستان جس کے لیے انہوں نے اتنی قربانیاں دی تھیں۔ وہ سرزمین جہاں اسلام کی بہترین روایات کو زندہ کیا جائے گا جہاں خالص اسلامی تہذیب کی نشو و نما ہوگی۔ .

پھر وہاں رضیہ ہوگی۔ ہر خطرے سے محفوظ۔ وہ اس کی راہ تکتی ہوگی اس کی آنکھیں اس کے گھر نظر آنے والی ہر راہ گزر پر بچھی ہوں گی۔ حیدر نے سوچا کہ اب وہ سیاست کی بڑی دنیا کو ترک کر کے رضیہ کی چھوٹی سی دنیا میں اپنا جھونپڑا بنائے گا۔ اس

کی گھنی پلکوں تلے مچلنے اور لجانے والی مسکراہٹوں کو چوم چوم لے گا۔

آخر کار انہیں ملٹری کی لاری میں بٹھا کر واگہ لے جایا گیا۔ وہاں انہیں پاکستانی پولس کے حوالے کر دیا گیا۔ پاکستانی پولس نے معمولی قانونی کاروائی یہ کی اس کے والدین کا پاکستان میں پتہ وغیرہ لکھ لیا تاکہ ضرورت پڑنے پر اس سے پوچھ گچھ کی جاسکے۔ اس کے خلاف کوئی ایسی فرد جرم تو لگی نہیں تھی کہ جو پاکستانی پولس کے نزدیک قابل گرفت ہو۔ اس لیے لاہور میں حیدر کو مکمل آزادی مل گئی۔ وہیں پر اسے کچھ پرانے ساتھی بھی مل گئے جنہوں نے اسے مجبور کیا کہ راولپنڈی (کہ جہاں پر اس کے والدین بھی موجود تھے) جانے سے پہلے وہ چند دن ان کے ساتھ لاہور میں گزارے۔

دوستوں کے ساتھ اس نے جی بھر کر لاہور کی سیر کی۔ شہر کا ذرّہ ذرّہ اسے تابناک نظر آتا تھا۔ گو ہندوؤں اور سکھوں کی یکسر غیر موجودگی ذرا عجیب سی معلوم ہوتی تھی بلکہ کبھی کبھی تو اس پر اس کا دل کچھ دکھی سا بھی ہو جاتا تھا......

لاہور میں اچانک رضیہ کے بھائی سے ملاقات ہوگئی۔ وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ کسی کام سے لاہور آیا تھا۔ اس نے اسے فوراً اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ لیکن دوستوں کے منت سماجت کرنے پر اس ارادے سے باز آیا۔ تاہم اس نے کہا کہ وہ راول پنڈی پہنچ کر سب کو یہ خوش خبری سنائے گا۔ انہیں حیدر کی خیر و عافیت کی خبر مل گئی تھی۔ صرف یہ پتہ نہ چلتا تھا کہ اسے قید سے کب رہا کیا جائے گا۔ ورنہ اس کے والدین اسے لینے کو لاہور تک چلے آتے۔ حیدر نے کچھ شرما کر اور رک رک کر رضیہ کی خیریت پوچھی...... آخر وہ اس کا منگیتر تھا...... جواب کافی حوصلہ افزا تھا۔ سالے صاحب نے گھر کا پتہ دیتے ہوئے کہا بھئی! رضیہ کو براہِ راست لکھ ڈالو۔ وہ بہت فکر مند رہتی ہے۔ اپنے گھروں کی لڑکیاں تم جانتے ہی ہو، بے زبان ہوتی ہیں۔ دل کی بات زبان تک لاتے ہوئے شرماتی ہیں۔

حیدر نے چٹھی لکھنے کا وعدہ کیا...... پھر کچھ سوچ کر کہا کہ آپ میرے والدین

اور اس کے لیے دستی رقعے لے جایئے سردست...... اس نے رضیہ کے نام اور والدین کے نام دو رقعے اپنی خیر و عافیت کے بارے میں لکھ کر کورے لفافے میں الگ الگ بند کر کے ان کے حوالے کیے۔

آٹھ دن بعد دوستوں سے بہ مشکل اجازت لے کر وہ گاڑی پر سوار ہوا۔ دوست اسے اسٹیشن تک چھوڑنے آئے۔ انہوں نے اس کے گلے میں پھولوں کے ہار پہنائے۔ گاڑی چلنے کے بعد دیر تک رومال ہوا میں ہلتے رہے۔

ریل گاڑیوں کا انتظام بھی درہم برہم ہو رہا تھا۔ غالباً گاڑیاں کم تعداد میں چل رہی تھیں۔ اسی لیے ہر گاڑی میں بلا کا رش نظر آتا تھا۔

لاہور سے چونکہ گاڑی چلتی ہی تھی اس لیے اسے بیٹھنے کی مناسب سیٹ مل گئی۔ لیکن گوجرانوالے سے آگے جا کر اسے گاری بدلنی پڑی تو دوسری گاڑی کا رش دیکھ کر اس کے حواس گم ہو گئے۔ گھر پہنچنے کی بے قراری میں وہ بھیڑ بھاڑ کو خاطر میں نہ لایا اور پھر گاڑیوں کا تو یہی حال تھا۔ چنانچہ وہ ایک ڈبے میں زبردستی گھس گیا۔ حالانکہ ڈبہ ٹھساٹھس بھرا ہوا تھا۔ جیسے وہ انسان نہ ہوں اناج کے بورے ہوں۔ بیٹھنا تو درکنار کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہ تھی۔

ڈبے میں اونچے لمبے بلوچیوں کی تعداد کافی زیادہ تھی۔ ان کے اونچے قد، لمبے بازو اور ستواں ناکیں انہیں باقی سب سے الگ اور منفرد بناتی تھیں۔ دیہاتی پنجابی مسلمان بھی تھے۔ حیدر ان کے مقابلے میں ایک کمزور سا لڑکا تھا۔ وہ چھچھوندر کی طرح آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے اس طرح آگے ہی آگے بڑھنے سے کچھ آدمیوں کا پارہ اوپر چڑھنے لگا وہ ان کے بیچوں بیچ پھنس گیا۔ اس کی پسلیاں چرچرانے لگیں۔ زبان باہر نکل آئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے چشم زدن میں وہ بے ہوش ہو کر گرے گا اور مر جائے گا۔ اس نے ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرح بری طرح سے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے جس سے دیگر لوگوں کو اور زیادہ جھنجھلاہٹ ہوئی۔

"مجھے آگے جانے دو۔" حیدر نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"اوئے آگے کی اے۔"

"اگے کوئی جگہ نہیں۔" دوسرے نے کہا۔

حیدر نے ملتجیانہ نظریں ادھر اُدھر دوڑائیں۔ "بھائیو! میں رفیوجی ہوں......"

"رفیوجی ہوں...... ارے رفیوجی ہیں تو ہم کیا کریں......"

دوسرا بولا۔ "یار ان رفیوجیوں نے بھی تو ناک میں دم کر رکھا ہے جو آتا ہے کہتا ہے میں رفیوجی ہاں۔ رفوجی ہو تو کیا ہمارے سر پہ ناچو گے؟"

اب حیدر پچھتا رہا تھا۔ وہ خواہ مخواہ اس ڈبے میں گھس آیا۔ کاش کوئی اسے باہر ہی نکلنے دے۔ لیکن اب تو اس کے پاؤں بھی زمین سے اوپر اٹھ گئے تھے۔ وہ لمبے لمبے آدمیوں میں اس بری طرح سے پھنس گیا تھا کہ سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ اگر اور کچھ دیر یہ حالت رہی تو اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر جائے گی۔ چنانچہ اس نے ایک بار زور مارا۔ اس پر دوسروں نے بھی اسے کہنیاں مارنی شروع کر دیں۔ کسی نے ایک آدھ دھوکا بھی جڑ دیا۔

اس دھینگا مشتی میں وہ دو سیٹوں کے بیچ میں جا گرا۔ سیٹوں پر لوگ بری طرح سے بٹے ہوئے تھے کچھ کھڑے بھی تھے لیکن گر کر وہ ایک سیٹ کے نیچے کی طرف لڑھک گیا اس نے نظر اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کسی چہرے پر ہمدردی دکھائی نہیں دی...... لیکن سیٹ کے نیچے اسے سانس لینے میں سہولت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں ہانپتے کانپتے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ متعدد تیل لگے دیسی جوتوں کی سڑاند سے اس کا دماغ پھٹنے لگا۔ اس نے بغل میں دبی ہوئی کپڑوں کی چھوٹی سی گٹھری کو بطور تکیہ اپنے سر کے تلے رکھ لیا اور منہ پھیر کر نتھنے پھلا پھلا کر اپنے پھیپھڑوں میں ہوا بھرنے لگا۔

اس وقت اس کی آنکھیں نیم وا تھیں لیکن سیٹ کے نیچے کی غلیظ فضا بھی فردوس

سے کم نہیں تھی وہ آنکھیں نہیں کھولنا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے ارد گرد دنیا بھر کے جوتوں کی گرد بکھری ہوئی ہے تھوک کی پچکاریوں اور ناک ایزش سے فرش اٹا ہوا ہے...... اس نے سُنا تھا کہ رفیوجیوں کو مسلمان بھائی حلوہ، لچیاں اور پھل وغیرہ کھلاتے تھے۔ لیکن اب دھیرے دھیرے وہ جوش خدمت بھی ختم ہو چکا تھا۔ اب وہ تھے اور ان کے روز بروز کے مسائل...... روز بروز کی بھوک، ضروریات اور بکھیڑے۔

پھر اس کی آنکھیں نیم وا ہوئیں تو اس نے اپنے قریب ایک اور نوجوان کو دیکھا...... اسی کی طرح شہری ٹائپ کا۔ ذرا نازک بدن۔ دبلا پتلا...... معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی اسی کی طرح سب کی ٹھوکریں کھا کھا کر وہاں پناہ گزیں ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں۔ چہرے کی کیفیت سے ظاہر تھا کہ اس نے بہت دکھ بھوگے ہیں۔

حیدر فطرتاً ہمدرد واقع ہوا تھا۔ اس حالت میں بھی اس کے لبوں پہ مسکراہٹ پیدا ہوئی اس نے پوچھا۔ ''تم بھی رفیوجی ہو؟''

اجنبی نے منہ سے کچھ نہیں کہا البتہ اثبات میں سر ہلا دیا۔

حیدر نے دیکھا کہ نووارد کی ٹانگیں سیٹ سے باہر تھیں جنہیں باربار ٹھوکریں لگ رہی تھیں۔ حیدر نے پیچھے ہٹ کر اس کے لیے جگہ بنا دی اور اسے آگے کھسک آنے کو کہا۔ وہ گھسیٹ کر آگے بڑھ آیا۔ وہ ملائم بھورے بالوں والا سرا اس کے بہت قریب آ گیا۔ حیدر کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ ننھا شیر خوار بچہ ہو۔ عین اس وقت حیدر کی نگاہ اس کے بازو پر پڑی جو اس وقت ننگا ہو رہا تھا...... اس پر اردو حروف میں ''اوم'' لکھا تھا......

حیدر چونکا۔ اس کی آنکھیں پھٹ سی گئیں اس نے قریب قریب چلا کر کہا ''تم ہندو ہو؟''

نووارد کا چہرہ فق ہو گیا۔ ہونٹ نیلے سے پڑ گئے اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اس نے پھر بھی منہ سے کچھ نہیں کہا صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔

اب کچھ دیر کے لیے سکوت طاری ہو گیا۔

شور کی وجہ سے کسی اور نے حیدر کی آواز نہیں سنی...... پھر اجنبی نے لرزتے ہوئے ہونٹوں اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں رفیوجی ہوں۔"

گاڑی چلی جارہی تھی۔ حیدر کی آنکھیں پھر بند تھی۔ اجنبی چپ چاپ اس کے قریب...... بہت قریب لیٹا تھا...... اوندھے منہ......

نہ جانے وہ دونوں کیا سوچ رہے تھے۔

گاڑی کسی اسٹیشن پر رکی تو حیدر نے اس کا بازو تھام لیا۔ سیٹ کے نیچے سے بہ مشکل نکلا اور اجنبی کو پیچھے پیچھے کھینچتا ہوا ریلے کے ساتھ گاڑی سے نیچے اتر آیا۔

ذرا الگ تھلگ گوشے میں پہنچ کر اس نے جلدی سے رضیہ کے نام ایک چٹھی لکھی۔

ڈیر رضیہ!

میں تمہارے پاس آرہا تھا۔ لیکن راستے میں ایک ضروری کام پڑ گیا۔ اس لیے اب شاید دو چار دن کے بعد پہنچوں گا۔

رضیہ! آج مجھے سائیں جی یاد آرہے ہیں نہ جانے ان کا کیا حشر ہوا ہے لیکن مجھے آج وہ بہت قریب محسوس ہو رہے ہیں۔

اب تک مجھے یہ نہ معلوم تھا کہ ایک ہندو اور مسلمان، یا مسلمان اور سکھ میں کتنا بعد ہے۔ لیکن انسان انسان کے درمیان کتنا فاصلہ ہے اس کا مجھے آج ہی پتہ چلا ہے۔

تفصیلات ملنے پر! اس وقت بس یہی سمجھ لو کہ ایک کافر کو واگہ پار کرانے کا بیڑا اٹھایا ہے میں نے۔

تمہارا

حیدر

ہوالشافی

Hey, Ho! Listen to the Wisdom of Woman; Woman older and wiser than wisdom itself.

Hey, Ho! .... They are a thousand years old when they are born and ten times than that when we begin only to see them.

Hey, Ho!....... She is as strong as wind, as untouchable as wind, as beautiful as wind— KONRAD BERCOVIVI

اُجالے کی جگمگاہٹ دروازے کے شیشوں میں سے مہاشے جی اور ان کی دھرم پتنی کی صورتیں دکھائی دیں۔ کوشل اپنے دھاری دار پائجامے کو پھڑ پھڑاتا دروازہ کھولنے کے لیے اٹھا۔

دروازہ کھولتے کھولتے اس نے ایک نظر گھوم کر دیکھا کہ اس کی بیوی ابھی محوِ خوابِ ناز تھی۔

"اے ہے ہے! اے ہے ہے! اے ہے ہے!!"

یہ مہاشے جی کے ہنسنے کی آواز تھی۔ ان کے منہ کا دہانہ بہت کشادہ، دانت بڑے اور آگے کو بڑھے ہوئے تھے۔ جس طرح عام لوگوں کو دانتوں کی نمائش کرنے کے لیے

منہ کھولنا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس مہاشے جی کو بہ مشکل تمام منہ بند کرنا پڑتا تھا۔ رہی
لمبی ہر دم عریاں دانتوں کو دیکھئے تو گویا چوبیسوں گھنٹے ہنستے رہتے تھے لیکن جب وہ فی
الحقیقت ہنستے تھے تو دانتوں کے ساتھ مسوڑھوں کی نمائش کے علاوہ پیٹ سے بھی کہیں
نیچے سے ہوا کھینچ کر بلغ کی طرح تیں تے کی آوازیں نکالتے چناں چہ

"اے ہے ہے! اے ہے ہے!! ہم نے سوچا آج تو کوشل جی کے وہاں جائے
نکیں گے۔ اے ہے ہے۔"

ان چھپر پھاڑ قہقہوں کے شور سے مسز کوشل جاگ پڑیں اور وہ اپنی نا خوشی
چھپانے میں زیادہ کامیاب بھی نہیں ہوئیں۔

کوشل پھر اپنے بستر میں گھس کر بیٹھ گیا۔

مہاشے جی اپنی استری کے ساتھ ہوٹل میں انہیں کے ساتھ والے کمرے میں
قیام فرما تھے۔ شملہ آتے وقت کالکا سے انہیں کے ساتھ گاڑی پر سوار ہوئے تھے۔ اسے
ان کا نام یاد نہیں رہا تھا۔ اس لیے وہ انہیں مہاشے جی کے نام سے ہی پکارتا تھا۔ مہاشے
جی کی سب سے بڑی خوبی یا عیب تھا' ان کی بے تکلفی، یوں دل کے برے نہ تھے۔
البتہ چائے کے بعد یعنی دوسرے نمبر پر صنف نازک کی ان کے نزدیک بڑی اہمیت تھی۔
بلکہ بعض اوقات تو عورت کا پد چائے کے پیالے کے برابر اونچا کردیتے تھے۔ چناں چہ
اب کے آتے ہی مسز کوشل کی جانب یوں جھکے جیسے وہ گرم گرم چائے کا پیالہ ہو۔ کوشل
جانتا تھا کہ اب وہ اس کی بیوی سے قدرے دُم بازی (Flirt) کریں گے لیکن وہ یہ بھی
جانتا تھا کہ اس کی بیوی کی نگاہ میں غالب کی آبرو کیا ہے۔

یہ خیال اس کے ذہن کے افق میں پھیلتا چلا گیا۔ اب تو گویا اپنے گریبان میں
منہ ڈالنے والی بات تھی۔ دلی اضطراب پر قابو پانے کے لیے اس نے سگریٹ جلا لیا۔

ہاں وہ معصوم کیا جانے کہ اس کا شوہر گرگ جہاں دیدہ تھا وہ تو پران پیارے
کے ساتھ پہاڑ پر ہوا خوری کے لیے آئی تھی۔ لیکن۔

"کسم! کسم!! تم نے مجھے کہیں کا نہیں رہنے دیا۔"

دل ہی دل میں یہ الفاظ کہہ کر اس نے ہملیٹ (Hamlet) کی طرح بازو اٹھا کر ہاتھ کھڑکی کے چوکھٹے پر رکھ دیا۔

اسٹوو کا شور پس منظر موسیقی کا کام دے رہا تھا۔

کوشل نے سوچا کہ اچھا ہی ہوا جو مہاشے جی آگئے کیوں کہ کل شام کسم نے ہاتھ جوڑ کر بینتی کی تھی کہ سال بھر تمہاری راہ دیکھی اب صورت دکھائی ہے تو مہینہ بھر کے بعد بھاگ جانے کی ٹھان لی۔ کم از کم ایک ہفتہ بھر تو اور رک جاؤ۔''

اس کی بیوی تین ہفتے سے زیادہ رکنے کے حق میں نہیں تھی۔ اسے اخراجات کی فکر تھی؛ ایک مہینہ تو کھینچ تان کر گزر گیا تھا۔ لیکن اور زیادہ طول دینا اس کے بس کی بات نہیں تھی البتہ یہ ممکن تھا کہ مہاشہ جی اور ان کی بیوی کی تائید سے یہ کام بن جائے۔

مسز کوشل خوش مزاج خاتون تھیں۔ میٹھی نیند سے جگائے جانے پر پہلے تو وہ کچھ برہم ضرور ہوئی لیکن مہاشے جی کی ''ہے اے اے'' کے باعث جلد ہی ان کی سستی رفع ہوگئی۔

مسز کوشل مہاشے جی کی بیوی مخاطب ہو کر بولیں۔

''کہیے بچے تو ابھی سوئے پڑے ہوں گے۔''

''اور نہیں تو کیا اُن کے جاگتے ہماری اتنی مجال ہو سکتی تھی کہ آپ کے پاس بیٹھ کر اطمینان سے چائے پی سکیں۔''

اس پر دونوں ہنسنے لگیں۔ ہنس لیجئے! ابھی تو آپ کی شادی کو ایک ہی برس ہوا ہے۔ لیکن وہ دن دور نہیں جب آپ بھی ہماری طرح مجبور ہو جائیں گی۔''

''اے ہے ہے'' مہاشے جی نے چہک کر ہنستے ہوئے اظہار خوشنودی فرمایا۔

بعض اوقات مسز کوشل کو حیرت ہونے لگتی کہ اس قدر سگھڑ اور سنبھلی ہوئی عورت کو مہاشے جی ساتھی کہاں سے مل گیا۔ عجب بے جوڑ جوڑا تھا۔

اب سب قہقہوں سے دور کوشل سگریٹ کے دھوئیں میں کھو سا گیا تھا۔ وہ کش پر کش لیے جا رہا تھا۔ کھڑکی سے باہر سامنے پہاڑ کی ڈھلان پر ایستادہ درختوں پر بندروں

کے جھنڈ ہڑ بازی کر رہے تھے اور آگے ڈھلانیں تہ در تہ دور تک چلی گئی تھیں۔

کسم کنواری ہی تھی جب کوشل کی اس کی محبت کا آغاز ہوا۔ شادی بھی ہوسکتی تھی لیکن کوشل نے اس محبت کو دل بہلاوے کی حد سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ لیکن جب کسم کی شادی ہوگئی تو نہ جانے کسم کی شخصیت میں اسے نئی نئی خوبیاں کیوں دکھائی دینے لگیں۔ اور جب اس کی اپنی شادی بھی ہوچکی تو کسم سے عشق کی شدت اور بڑھی۔ حالاں کہ اپنی بیوی کسم سے بہتر تھی پھر بھی وہ اپنے خاص دوستوں سے یہ کہے بغیر نہیں رہتا تھا کہ یار! کسم میں عجیب Wildness ہے۔ بس میں تو اس کی اسی ادا پر مرتا ہوں۔ کسم! کسم!!

ان دونوں کی ملاقات تقریباً ہر روز ہوتی تھی۔ جلوت میں بھی اور خلوت میں بھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ان دونوں کا پیار کیا رنگ لائے گا۔ اب تو کسم کا ایک پانچ برس کا لڑکا بھی تھا۔ لیکن اس کے باوجود بقول کسم اس کی محبت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا کبھی کبھی کوشل کو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ کسی خطرناک مرض میں مبتلا ہو۔ آخر اس مرض کی دوا کیا تھی؟

چائے تیار ہوگئی۔

اب مہاشے جی کوشل کی جانب متوجہ ہوئے ''اجی کوشل صاحب! اے ہے ہے چائے نہیں پیجئے گا۔''

''پلایئے گا تو ضرور پئیں گے۔''

''اجی پلانے والے تو آپ ہیں۔ اے ہے ہے۔''

کوشل نے زندگی بھر مہاشے جی کی بے مہار باتوں اور ان کی اے ہے ہے سے زیادہ واہیات چیز نہیں سنی تھی۔ اس مہاشے سے تو کسم کا شوہر ہی بہتر تھا۔ حالاں کہ اس کا حریف تھا لیکن بچارا! معصوم!!

پہلا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے مہاشے جی بولے ''آج کی چائے یاد رہے

گی ہمیشہ"

"وہ کیوں؟"

"اے ہے ہے"

ہنس کر مہاشے جی نے دوسرے گھونٹ کے لیے ہونٹ بڑھائے اور دانتوں کے ساتھ ان کے دیدے بھی چمک اٹھے۔ بولے۔

"ارے بھائی آج آپ جا رہے ہیں نا!"

کوشل نے قدرے توقف کیا۔ پھر پانسہ پھینک ہی دیا۔ "ہوسکتا ہے ہوسکتا ہے......"

اس پر اس کی بیوی کا گورا ہاتھ پیالہ اٹھاتے اٹھاتے رک گیا۔ ہموار جبیں پر ایک بل خنجر کی طرح نمودار ہوا پوچھا "کیوں؟"

کوشل بیوی سے آنکھ نہ ملا سکا۔ اس نے منہ پھیر لیا اور دل کڑا کر کے بولا "آج موڈ نہیں بن رہا ہے۔"

"واہ! کیا بات ہے کیا بات کہی ہے" مہاشہ جی نے کوشل کی جانب ہاتھ پھینک کر یوں داد دی جیسے اس نے بہت بلند پایہ شعر کہہ سنایا ہو۔

اس پر خوب لے دے ہوئی۔ کوشل کی شہ پاکر مہاشے جی نے میدانوں کی گرمی کے نقصانات اور پہاڑ کی خنک ہوا کے فوائد کا چارٹ بنا کر پیش کیا اور اس قدر زیادہ کائیں کائیں کہ مسز کوشل کو چپ ہونا پڑا۔

چائے پی لینے کے بعد مہاشہ جوڑی اٹھی اور دروازے سے نکلتے نکلتے مہاشے جی نے کوشل کی بیوی پر بڑی لذیذ نگاہ ڈالی' ایک بار پھر فضا ان کی غیر موسیقانہ ہے اے ہے' سے تلملا اٹھی اور جاتے جاتے وہ یوں بولے جیسے اُنہیں آکاش بانی ہوئی ہو۔ "کل صبح آپ کو ہمارے کمرے میں چائے پینی ہوگی۔"

تنہا رہ جانے پر کوشل نے دل ہی دل میں ایک معذرت نامہ تیار کیا اور اس کی

ابتدایوں کی "سنو ڈارلنگ"

"سنائیے" مسز نے خشک لہجے میں کہا۔

کوشل کھسیانا سا ہوگیا۔ "دیکھو ڈارلنگ"

"دکھائیے" مسز خشک تر لہجے میں بولیں۔

بھئی معلوم ہوتا ہے کہ آپ خفا ہوگئی ہیں حالاں کہ بات معمولی ہے لیکن اگر آپ......"

"جی میں خفا نہیں ہوں" مسز نے خشک ترین لہجے میں جواب دیا۔ "لائیے تھیلا! جب رکنا ہی ہے تو بازار سے سبزی لے آؤں۔"

کوشل جی ہی جی میں بہت خوش ہوا۔ بڑی فرماں برداری دکھاتے ہوئے وہ ایک کونے سے پھول دار کپڑے کا بنا ہوا تھیلا اٹھا لایا، اور بولا "ذرا پہاڑی (نوکر) کو جگادوں...... آپ کے ساتھ......"

لیکن نوکر کے جاگنے سے پہلے ہی بیوی زلفیں لہراتی بازار کی جانب روانہ ہوگئی۔

کوشل نے پھر سوچنا شروع کیا۔ اس بے چاری کو کیا معلوم کہ کسم نے کیسی پیاری پیاری چٹھیاں اسے لکھی ہیں۔ وہ کیا جانے کہ وہ سب خطوط اس کے اٹیچی کیس میں فائلوں کے نیچے محفوظ پڑے ہیں، اور اس کی چابی اس کے پاجامے کے ازار بند کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔

ہوٹل سے بازار تک خاصی چڑھائی تھی، چنانچہ لوئر بازار تک پہنچتے پہنچتے شریمتی جی کا دم پھول گیا اور ابھی تک وہ اچھی طرح سنبھل بھی نہیں پائی تھی کہ دور سے کسم کے پتی شرما جی آتے دکھائی دیے۔ شریمتی جی نے فوراً نظر چرا کر رخ پھیر لیا اور جلدی سے کھسک جانے کے لیے رفتار تیز کردی۔ لیکن شرما جی نے کرکٹ کے ماہر کھلاڑی کی طرح لپک کر آپ کو "نوچ" لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شریمتی جی کو شرمانا پڑا، مسکرانا پڑا، اور ٹہلنی کمر کو

قدرے ہلاکر حیرت سے دریافت کرنا پڑا ارے آپ؟''

شرما جی اپنے زور میں ایک بار توریل کے چھک چھک کرتے ہوئے انجن کی طرح ان کے اوپر ہی چڑھ دوڑے پھر بمشکل سنبھل کر لمحہ بھر کو یوں دم بخود رہ گئے جیسے جلوہ حسن یار کی تاب لانے سے قاصر ہیں۔ لیکن بالآخر...... لے آئے اور بصد شد و مد فرمایا۔

''بیوٹی فل!''

یہ کہہ کر انہوں نے اپنے چہار آتشہ چہرے کو حرکت دی— کیوں کہ بدن کا درمیانی حصہ چربی اور بادی کی وجہ سے پھول کر سپیرے کی بین کے مانند دکھائی دے رہا تھا، پھر تھیلے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

''سبزی لے جانے کے بہانے سے آئی ہیں؟''

''بہانہ؟'' شریمتی جی نے قدرے تامل کیا۔ پھر کچھ سمجھ کر ہنس دیں۔'' جی ہاں بہانہ— بہانہ کر کے آئی ہوں۔''

اس پر شرما جی نے اظہار مسرت کرتے ہوئے پھر آنے جانے والوں کی نظر بچا کر اپنے سینے پر دل والے مقام پر ہاتھ رکھا۔

''کسی نے سچ کہا ہے کہ بھگوان جب دیتا ہے چھپر پھاڑ کر دیتا ہے'' پھر ایک سبک سا بوسہ ہوا میں اڑا کر فرمایا،'' چلا جا لفافہ کبوتر کی چال، جو ہوگی محبت تو دیں گے جواب'' لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ لفافے کے جواب میں آپ خود ہی تشریف لے آئیں گی۔''

''کیسا لفافہ؟'' شریمتی جی دل ہی دل میں سوچنے لگیں۔

اسی اثناء میں شرما جی کا پانچ سالہ لڑکا دوڑتا ہوا آیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔'' آپ مجھے چھوڑ کر ایک دم کیوں بھاگ آئے ڈیڈی!''

''ارے بیٹا! سوری، ویری ویری سوری۔ دیکھو موسی جی کو جے ہند کہو...... دونوں ہاتھ جوڑ کر ہا۔ جے ہند!!''

اس کے بعد شرما جی نے ایک آنکھ بند کر کے شریمتی جی کی جانب دیکھا، مراد یہ کہ ابھی سب انتظام کیے دیتا ہوں۔

پھر وہ بچے کو قریب حلوائی کی دکان پر لے گئے۔

"لو بیٹا! پستے کی برفی کھاؤ۔ کرسی پر بیٹھ جاؤ، یہ بات بس یہیں بیٹھے رہنا۔ لو یہ پیکٹ بھی تمہارے پاس دھرا ہے۔ اس کا خیال رکھنا۔

بچے کو بٹھا کر شرما جی نے شریمتی کی کمر کو چھوا۔ "آئیے اب چلیں"

قدرے ایک جانب ہٹ کر وہ اس بنگلے کی طرف بڑھے، جہاں موچی پرانے فل بوٹوں کی مرمت کر کے انہیں پہاڑیوں کے ہاتھ فروخت کیا کرتے ہیں وہ بلغم کے تودوں سے بچے ہوئے بنگلے سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔

"یاد ہے آپ کو، پرسوں آپ نے مجھ سے کیا کہا تھا؟"

"کیا کہا تھا؟" اس نے بن کر پوچھا۔

"یہی، آپ کیا جانیں کسی کے دل کا حال — یاد آیا؟"

"ہاں جی —" وہ بن کر لجائی۔

"سچ مانئے چار دن سے — یعنی جب سے آپ کی آنکھوں نے اپنے پیار کا پیام دیا ہے کھانا، پینا، سونا، کام کرنا غرض سب کچھ حرام ہو گیا ہے، آپ سب کچھ جانتی تھیں، پھر بھی آپ نے کل درشن نہیں دیئے۔ کارن؟"

"آپ کو تو معلوم ہی ہے، ہمیں واپس جانے کی تیاری کرنی تھی، آج ہی تو جانے کا پروگرام....."

"ایسا مت کہئے، مت کہئے ایسا" شرما جی نے ان کی بات کاٹ کر زمین پر بیٹھتے ہوئے اصرار کیا۔

"لیکن اب تو پروگرام ملتوی ہو گیا ہے۔"

"سچ؟"

''ہاں ہاں!''

''ارے میں بڑا خوش نصیب انسان ہوں، مجھے معلوم نہیں تھا کہ میری چٹھی کا آپ کے دل پر اتنا گہرا اثر ہوگا۔''

''چٹھی کون سی؟''

''وہی جو ابھی ابھی آپ کو ملی ہے۔''

''مجھے تو کوئی چٹھی نہیں ملی۔''

''نہیں ملی؟'' شرما جی چلا کر بولے۔

''نہیں۔''

''میں نے اپنے نوکر کے ہاتھ بھیجی تھی آپ کو۔''

''مجھے نہیں ملی۔''

''ارے واہ! معلوم ہوتا ہے کہ نوکر کے پہنچنے سے پہلے ہی چل دیں آپ۔''

''ہاں ایسا ہی ہوا ہوگا۔''

''تو یہ کہیئے کہ چٹھی پڑھ کر نہیں میرے دل کی پکار سن کر چلی آئیں آپ۔ کاش آپ نے میری چٹھی پڑھی ہوتی۔ میں نے اس میں اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا......''

شریمتی جی نے ناز سے پلکیں جھپکائیں اور دور ہی سے بائیں شانے کو دھکا دینے کے انداز سے حرکت دے کر بولی۔'' ہائے کیا لکھا تھا آپ نے؟''

اس پر شرما جی نے آنکھیں موند لیں۔ ہائے مت پوچھیئے...... میں نے لکھا تھا 'میری اور صرف میری' یعنی اس طرح خط شروع کیا تھا۔ پھر اس نوخیز محبت نے چار دن میں جو حال میرا بنا دیا تھا وہ لکھا تھا، اور اسی محبت کا واسطہ دے کر آپ سے درخواست کی تھی کہ آپ کسی حیلے سے کم از کم ایک ہفتہ تو اور رک جائیں۔ لیکن عجیب بات ہے آپ نے میری چٹھی پڑھی بھی نہیں۔ اور دل کی سب مرادیں بھی پوری ہو رہی ہیں۔''

اتنے میں شرما جی کو اپنا نوکر آتا دکھائی دیا۔ ڈپٹ کر بولے۔

"ابے کہاں مر گیا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ کہیں راستے میں ہی سُلفہ پینے لگا ہوگا، چٹھی بھی وقت پر نہیں پہنچائی۔"

"پہنچا دی حضور ۔۔۔"

"پہنچا دی؟ ابے کس کو دے ڈالی۔"

"بابو جی کو ۔۔۔ بی بی جی ۔۔۔ ارہاں بی بی جی ۔۔۔ تو یہاں کھڑی ہیں؟

"ابے بی بی جی کے...... پ...... میرا مطلب ہے تو نے...... ارے غضب کر دیا تو نے۔"

شرما جی نے پلٹ کر دیکھا تو معشوقہ کو واپس جاتے ہوئے پایا ۔۔۔ ان کا دماغ چکرا رہا تھا، نوکر الگ پریشان تھا ہکلا ہکلا کر کہہ رہا تھا۔ "پر بابو جی نے مجھے گردن سے پکڑ لیا، بولے، سالے کیا کام ہے بی بی جی سے سویرے سویرے......"

لیکن شرما جی نے کچھ نہیں سنا، کیوں کہ مسز کوشل بنگلے کی بغل سے ہو کر نیچے ہوٹل کی جانب جانے والی سڑک پر پہنچ چکی تھیں۔

شرما جی نے گھبرا کر پوچھا۔ "اب کیا ہوگا۔"

مسز کوشل نے چلتے چلتے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ "اب ہم واپس چلے جائیں گے فوراً"

شرما جی نے بنگلے ہی سے ہاتھ بڑھا کر بہ منت کہا۔ "ایسا مت کہئے۔ آپ جانتی ہی ہیں کہ م...... م...... میں آپ کو......"

"یعنی؟"

لفظ 'یعنی' کے جواب میں مسز کوشل دلی اطمینان کے ساتھ چپ چاپ خالی تھیلا گھماتی ہوئی ہوٹل کی جانب چلی گئیں۔

جب وہ اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچیں تو دیکھا کہ سارا سامان باندھا جا رہا ہے۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی انہوں نے اس قدر جلد تیاری پر اظہار حیرت کیا تو کوشل کرخت لہجے میں بولا، ''ہم واپس جا رہے ہیں۔ ابھی اسی وقت''

اس کا خیال تھا کہ بیوی رکنے پر اصرار کریں گی، لیکن وہ بلا حیل و حجت تیار ہوگئیں۔

وہ اسٹیشن پر گاڑی چھوٹنے سے بہت پہلے پہنچ گئے۔ مسز کوشل آرام سے ایک فلمی رسالہ پڑھنے لگیں اور کوشل نے بے چینی سے پلیٹ فارم پر ادھر اُدھر ٹہلنا شروع کر دیا۔ اس کے دماغ میں جیسے کوہ آتش فشاں پھوٹ پڑا ہو، وہ اپنے آپ کو خوب صورت سمجھتا تھا، وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی بیوی کا ذوق اس قدر پست بھی ہوسکتا ہے اور وہ اسے چھوڑ کر شرما جی ایسے بھونڈے انسان سے رومانس لڑانے لگے گی— اس نے سوچا کہ گاڑی میں بیٹھ کر وہ اطمینان سے بیوی کی خبر لے گا۔

جس ڈبے میں وہ بیٹھے تھے وہاں ایک خوب صورت جوڑا پہلے سے ہی بیٹھا تھا، اگرچہ وہ دونوں ایک دوسرے میں مگن تھے۔ لیکن پھر بھی ان کی موجودگی میں وہ بیوی سے جھگڑا تو نہیں کرسکتا تھا۔

اسٹیشن سے گاڑی روانہ ہوئی تو وہ بیوی سے الگ تھلگ سیٹ پر منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔ چند منٹ خاموشی میں گزر گئے۔ پھر یہ دیکھ کر کہ نیا جوڑا بڑی محبت اور اخلاص سے آپس میں کانا پھوسی کر رہا ہے۔ اسے اور بھی کوفت ہوئی، چنانچہ منہ پھیرا تو دیکھا کہ اس کی بیوی کھڑکی کے قریب بیٹھی کچھ کاغذات جلا رہی ہے۔

معاً اس نے دھیمی لیکن مستحکم آواز میں جواب طلب کیا'' یہ کیا جلا رہی ہو۔''

''چند پریم پتر'' اسی لہجے میں جواب ملا۔

''کیسے پریم پتر؟''

''آپ دیکھ سکتے ہیں'' یہ کہہ کر بیوی نے جلتا ہوا ایک کاغذ آگے بڑھا دیا— کسم کے خطوط اس کے نام۔

اس کے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے.....

اور وہ سب کچھ سمجھ گیا تھا۔

بیوی چپ چاپ کھڑکی کے باہر دیکھ رہی تھی۔

جلے ہوئے کاغذوں کا ایک آدھ ٹکڑا ہوا میں ناچ رہا تھا۔

بالآخر کوشل نے سچے دل سے جھینپ کر کہا۔

"تم بہت شریر ہو۔"

بیوی کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"اور آپ؟"

اس پر کوشل نے فوراً آگے بڑھ کر قریب دو زانو ہوتے ہوئے جواب دیا۔

"میں؟— میں آپ کا غلام۔"

یہ افسانہ پہلی بار 'آج کل' اکتوبر 1953 میں شائع ہوا۔ کسی بھی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ کلیات میں پہلی بار شائع کیا جا رہا ہے۔

پہلا پتھر

☆ تب شاستری اور فریسی ایک عورت کو لائے جو بدکاری میں پکڑی گئی تھی، اور اس کو بیچ میں کھڑا کر کے کہا۔
☆ اے استاد! یہ عورت بدکاری کرتی ہوئی پکڑی گئی ہے۔
☆ موسیٰ کے قانون کے مطابق ایسی عورت کو سنگسار کرنا جائز ہے۔ سو تو اس عورت کے بارے میں کیا کہتا ہے؟
☆ جب وہ اس سے پوچھتے رہے تو اس نے سیدھے ہو کر ان سے کہا: ''تم میں سے جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ وہ پہلے اس کو پتھر مارے۔

(یوحنا رسول: آیت ۳،۴، ۵،۷)

1

رندہ ہاتھ سے رکھ کر باج سنگھ نے چوکنا تیتر کی طرح گردن دروازے سے باہر نکالی اور ایک نظر شاہی اصطبل پر ڈالی...... کوئی خاص چیز دکھائی نہیں دی۔ حالانکہ اسے شبہ یہی ہوا تھا کہ گھکی بڑے دروازے میں کھڑی کسی کو آواز دے رہی تھی۔ وہ اس خیال سے اٹھا تھا کہ اندھیرے میں گھکی کی ایک آدھ چمی لے لینا مشکل نہ ہوگا۔
'شاہی اصطبل' در اصل اصطبل نہیں تھا بلکہ یہ سردار ددھاوا سنگھ کی شاندار حویلی

تھی جسے باج سنگھ عرف باجؔ اور اس کے چیلے چانٹے شاہی اصطبل کے نام سے پکارتے تھے حویلی کی سب سے بڑی خوبی تھی اس کی کشادگی۔ یہ حویلی ایک بہت بڑے صندوق کے مانند تھی۔ چھت کا طول و عرض اتنا کہ پوری بارات کے لیے چار پائیاں بچھائی جاسکتی تھیں۔ بڑے بڑے ہال کمرے، دروازے آٹھ آٹھ فٹ اونچے۔ ان ہال کمروں میں عظیم الجثہ سردار ودھاوا سنگھ فیل پا کے باعث زخمی شیر کی طرح اینڈھ اینڈھ کر چلا کرتے تھے۔ حویلی کا ایک حصہ لیبل پرنٹنگ پریس کے لیے وقف تھا۔ اس کے علاوہ حویلی کے اندر کی جانب بڑے والان کے گوشے میں نانک فرنیچر مارٹ کے مالک بھی سردار جی ہی تھے۔ فرنیچر کا کارخانہ یہاں تھا اور شو روم حویلی کی دوسری طرف یعنی عین برلب سڑک۔

باج ہیڈ مستری تھا۔ ہاتھ کی صفائی اور حرمزدگی 'چستی' کے باعث سب کارندوں کا، خواہ وہ کارخانے کے ہوں یا پریس کے، وہ استاد سمجھا جاتا تھا۔

حویلی کے بغل میں سڑک کی جانب چند دکانیں تھیں مع مکانات کے یہ سب سردار جی کی ملکیت تھیں۔ آخر ان کے آبا و اجداد جالندھر شہر ہی میں رہتے آئے تھے۔ اس لیے اتنی سی جائداد کا بن جانا غیر معمولی بات نہیں تھی۔

جب 1947ء کے آغاز میں مغربی پنجاب کے مسلمان بھائیوں نے اپنے کراڑ اور سکھ بھائیوں کا ناکہ بند کردیا تو رفیوجیوں کی ایک بڑی تعداد مشرقی پنجاب میں آگئی۔ ان میں گھکی کا باپ دیوی داس بھی تھا۔ پیشے کے اعتبار سے وہ بنیا تھا۔ چناں چہ سردار جی نے حویلی کے بالکل بغل والا دُکان اور مکان از راہِ کرم اسے کرایہ پر دے ڈالا۔ اور وہ وہاں پنساری کی دکان کرنے لگا۔ اس کی بیوی کو مسلمان بھائیوں نے ہلاک کر دیا تھا۔ لیکن اس کا اپنی تین جوان لڑکیوں سمیت صحیح سلامت نکل آنا معجزے سے کم نہیں تھا۔ ان میں سے سب سے بڑی کا نام گھکی، اس سے چھوٹی کا نام نکی اور سب سے چھوٹی کا سانولی تھا۔ سانولی اندھی تھی۔

گھکی خوب صورت اور بانکی لڑکی تھی۔ موقع پا کر سب سے پہلے باج سنگھ نے

اس کی چٹی لی تھی۔ بوسہ لینے کے سلسلے میں کھل جا سم سم تو باج نے کی۔ لیکن اس کے بعد باقی لوگوں کا راستہ بھی صاف ہوگیا۔ اس میں امیر وغریب کی تخصیص نہیں تھی۔ سردار صاحب کے بیٹے، ان بیٹیوں کے دوست اور کارندے وغیرہ سب ایک آدھ چٹی کی تاک میں رہتے۔ یہ بات نہیں تھی کہ ان میں سے ہر ایک کا داؤ چل ہی جاتا ہو۔ بعض تو دور ہی سے چٹخارے لینے والوں میں سے تھے۔ کیوں کہ گھکی بقول لیبل کاٹنے والے چرن کے 'بڑی چلتی پرزی تھی۔ پٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتی تھی کسی کو۔ اور تو اور خود باج سنگھ جو بڑا دیدہ دلیر اور گھسڑم گھساڑ قسم کا آدمی تھا۔ چٹی سے آگے نہ بڑھ پایا تھا، تو بھلا دوسروں کو وہ قریب کہاں پھٹکنے دیتی تھی۔

مایوس ہو کر باج سنگھ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کارخانے کے دروازے ہی میں کھڑا رہ گیا۔ اس کے بازو کہنیوں تک لکڑی کے برادے سے سنے ہوئے تھے۔ پینتالیس بہاریں دیکھنے کے بعد بھی اس کا بدن اکہرا اور مضبوط تھا۔ صورت گھناؤنی ہونے سے بال بال بچی تھی۔ مونچھوں کے بال جھڑ بیڑی کے کانٹوں کی طرح ہو گئے تھے۔ ہونٹ موٹے، ایک آنکھ میں پھولا۔ اونٹ کے کوہان کی طرح ناک کے نتھوں میں سے بال باہر نکل آیا کرتے تھے۔ جنہیں وہ چٹکی سے کھینچ ڈالتا۔ آج سے دس برس پہلے اس کی بیوی مرگئی۔ بیوی کے چھ مہینے بعد اس کی اکلوتی بچی بھی چل بسی۔

وہاں کھڑے کھڑے باج نے دیکھا کہ جس ہل چل کا اسے احساس ہوا تھا، وہ بالکل بے معنی نہیں تھی۔ کیوں کہ حویلی کے یکے بعد دیگرے چار دروازوں سے پرے باہر والے برآمدے میں برقی روشنی ہو رہی تھی۔ لکڑی کے چھوٹے سے پھاٹک میں سے سامان اندر لایا جا رہا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ضرور کوئی نیا مہمان آیا ہے۔ جب سے مغربی پنجاب میں گڑبڑ شروع ہوئی تھی۔ سردار جی کے یہاں کافی مہمان آرہے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے ان کے ایک ہندو دوست اپنے بال بچوں سمیت آگئے۔ ان کا ایک نوجوان لڑکا تھا۔ چمن —! اس کی گردن مور کی سی تھی اور آنکھیں سریلی۔ وہ بھی گھکی کو

دلچسپی کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ باآج کے چہیتے چونتوں کا خیال تھا کہ گھتی بھی اس پر مرتی تھی۔ باآج کے دل میں حسد پیدا نہیں ہوا۔ وہ ان چیزوں سے بالا تر تھا، کہتا " ارے ہمارا کیا ہے۔ ہم نے آتے ہی گھتی کی چمیاں لے کر اسے کانی کر ڈالا۔ اب چاہے ٹنڈالاٹ بھی اس کی چمی لیا کرے ہمارے...... سے۔" یہ کہہ کر وہ اپنی ایک ثابت اور دوسری پھولا ماری آنکھ سے سب کے چہروں کا جائزہ لیتا ہے۔

جب چمن کے گھر والے الگ مکان لے کر رہنے لگے تو پھر بھی سردار جی کے یہاں چمن کی آمد و رفت جاری رہی۔ ادھر باآج نے گھتی سے زیادہ اس کی چھوٹی بہن نکی کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔

دروازے میں کھڑے کھڑے پہلے تو باج کے دل میں آئی کہ جا کر نئے مہمانوں کو دیکھے۔ شاید کوئی 'لنڈیا' بھی ان میں شامل ہو لیکن آج کل کام بہت آیا ہوا تھا۔ جسے جلد از جلد ختم کرنا ضروری تھا۔ " ہٹاؤ" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ " صبح سب کچھ سامنے آجائے گا۔"

2

دوسرے روز آنکھ کھلی تو باج نے جلتا پھنکتا سورج اپنی پیشانی پر چمکتا ہوا پایا۔

ادھر یہ ہڑ بڑا کر اٹھا، ادھر بڑی سردارنی حسب معمول بھوری بھینس کی طرح کذ و کذ و بجر چھاتیاں تھلتھلاتی، سینہ زوریاں دکھلاتی آگ جلانے کے لیے برادہ لینے کے واسطے چھاج ہاتھ میں پکڑے اس کی جانب بڑھی۔

بڑی سردارنی کے جسم کا ہر عضو اپنے نقطۂ عروج تک پہنچ سکا تھا یعنی جو چیز جتنی موٹی جتنی بھدی، جتنی کشادہ ہو سکتی تھی، ہو چکی تھی، چلتی تو یوں معلوم پڑتا جیسے تنور ڈھاپنے والے جاپڑ کو پاؤں لگ گئے ہوں۔

ایسی ڈبل ڈوز سردارنی بھی سردار جی کے لیے ناکافی ثابت ہوئی۔ چناں چہ

انہیں ایک چھوٹی سردارنی بھی کہیں سے اڑا کر لانی پڑی۔ لیکن جب سے ان کے فوطوں میں پانی بھر آیا تھا۔ تب سے انہوں نے سردارنیوں سے توجہ ہٹا کر ہر روز کئی کئی گھنٹے مسلسل گوربانی کے پاٹھ پر مرکوز کر دی تھی۔

موقع ملنے پر بڑی سردارنی ضرورت سے زیادہ دیر تک باج کے پاس کھڑی رہتی۔ کیوں کہ باج نہایت مسکین بن کر کئی بار کہہ چکا تھا۔ " پروڈھی سردارنی آپ بیالیس برس کی تو نہیں دکھائی دیتیں جی!...... جی! آپ تو مشکل سے تیس برس کی دکھائی دیتی ہیں۔"

اس پر بڑی سردارنی دل ہی دل میں چہک اٹھتیں اور غین (غ) کی طرح منہ بنا کر فرماتیں۔ " ہٹ وے پڑاں۔ کون کہتا ہے میں بیالیس برس کی ہوں۔"

اس کے بعد وہ دروازے سے کندھا بھڑائے جمی کھڑی رہتیں۔ لیکن ٹانگ سیدھی رکھتیں اور دوسری ٹانگ کو دھیرے دھیرے حرکت دیتی رہتیں۔ ڈھلکے ہوئے پپوٹوں تلے دبی ہوئی پتلیاں باج کے چہرے پر جمائے رکھتیں۔

باج دل ہی دل میں سوچتا کہ گھگی کی کمر تو بڑی سردارنی کی پنڈلی سے بھی پتلی ہوگی۔

بالآخر جب سردارنی ٹوٹے ہوئے چھاج میں برادہ بھر کر لوٹیں تو ان کے پچھواڑے کا نظارہ دیکھ کر باج کے منہ سے بے اختیار نکل گیا " بلّے بلّے" پھر اپنے ایک نوجوان ساتھی بونگے سے مخاطب ہو کر بولا " کیوں اوبونگیا! اگر سردار جی بھیل بے خنجر ہیں تو سردارنی بھی وہ چٹان ہے جو جتنی جمیں سے باہر ہے اس سے چار گنا جمین کے اندر دھنسی ہوئی ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے پھلاہ کی داتن منہ میں ڈالی تو اس کی چرمراہٹ سے اس کا بد صورت چہرہ اور زیادہ بھدّا ہوگیا۔

بونگے نے جواب دیا۔ " ابے تو سردار جی کو کیا سمجھتا ہے۔ اگر سردارنی چار گنا

زمین کے اندر ہے تو سردار جی دس گنا جمین میں دبھن ہیں۔"

باجؔ نے بیٹھے بیٹھے مریل بوگے کو لات رسید کرتے ہوئے کہا۔" اوئے چل اوئے سوں دیا متر اڑا۔" جو بات یاد آئی تو پھر بولا۔" پر بونگیا گھگی کی کمر تو سردارنی کی پنڈلی سے بھی کم موٹی ہوگی....."

"تو پھر؟"

" نانا.....سوچ بھلا اتنی پتلی کمر..... بہت پتلی کمر ہے جار! اتنا نا جک لک۔"

" او بئی!" بوگے نے مشفقانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔" عورت کی کمر میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ مرد کی ساری طاقت چھاتی میں اور عورت کی کمر میں ہوتی ہے۔"

"سمجھا!!" گھاگ باجؔ نے گال کے اندر زبان گھمائی۔

اسی اثنا میں چمن بھی ادھر آنکلا۔ وہ ہر وقت چہکتا رہتا تھا۔ باچھوں میں سے ہنسی یوں پھوٹی پڑتی تھی جیسے وہ ریوڑیاں کھا رہا ہو۔ چلتا تو لہرا کے۔ بات کرتا تو بل کھا کے۔

بوگے نے کہا۔" لے بھئی! کھنیا جی تو آگئے۔"

" گوپی بھی آتی ہی ہوگی۔" باجؔ نے چھدرے دانتوں کی نمائش کی اور منہ سے ٹپکتی ہوئی رال کو بہ مشکل روکا۔

بوگے نے پہلے تو چمن کو دل پھینک انداز سے دیکھا اور پھر ایک آنکھ بند کر کے دوسری آنکھ باجؔ کی بغیر پھولے والی آنکھ سے ملائی اور گھی میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔" جار!" جیہ لونڈیا بھی گوپی سے کم نمکین نہیں ہے۔"

باجؔ نے ایک اور لات رسید کی۔"بڑا ٹھرکی ہے تو۔"

بوگے نے بھاؤ بنا کر گانا شروع کیا۔" اوئے بھگت لیوب کبیر بھی تو فرما گئے ہیں کہ اوئے کہنا منڈا ارن ورگا....."

عین اس وقت چھوٹی سردارنی بھی کولھے مٹکاتی دھم دھم کرتی دروازے سے نکل

کر صحن میں آن پہنچیں۔

کہنے کو تو وہ چھوٹی سردارنی تھیں لیکن ڈیل ڈول کے لحاظ سے اگر بڑی بیس تھیں تو وہ انیس۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دھنیے نے منوں روئی دھنک کر ہوا میں اڑا دی ہو۔ البتہ نقوش تیکھے تھے۔ رنگ نکھرا ہوا تھا چہرہ چکنا چپڑا۔ اگلے دو دانتوں میں سونے کی میخیں۔

مشہور تھا کہ وہ سردار جی کی بیاہتا نہیں تھیں۔ بقول باج کچھ جیر جھر معاملہ تھا۔ باوجود موٹاپے کے چھوٹی سردارنی کی بوٹی بوٹی تھرکتی تھی۔ بڑی سردارنی کو حالات نے ذرا فلسفی بنا دیا تھا اور حالات ہی نے چھوٹی سردارنی کو' چل چل چنبیلی باغ میں تجھے میوہ...... الخ'' بنا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بڑی سردارنی کے سامنے کھلے بندوں چھیڑ چھاڑ کا بازار گرم رہتا۔ گرما گری میں چھوٹی سردارنی کی کمر میں بھی ایک آدھ چٹکی بھری جاتی۔ جس پر وہ نوخیز لڑکی کے مانند کلبلاتی بل کھاتی اور کھل کھلاتی تھیں۔ وہ رنگین محفلوں کی جان تھیں۔ ان کی عمر اگرچہ پینتیس سے تجاوز کر چکی تھی، تاہم سردار جی اب بھی ان کی نگرانی کرتے تھے۔ کیوں کہ چھوٹی سردارنی چلتی تو جھکڑے کے ساتھ بیٹھتی تو جھکڑے کے ساتھ۔ اس کی بے تکلفانہ محفلوں میں آنکھیں لڑانے، چٹکیاں لینے اور ہائے وائے کرنے کے مواقع بڑی آسانی سے فراہم ہو جاتے تھے۔ شاذ و نادر وہ ایک آدھ بدتمیزی پر چیں بر جبیں بھی ہو جاتیں تو سب لڑکے اور لڑکیاں انہیں منانے لگتے۔ ان کے بدن کو سہلایا جاتا۔ ان سے لپٹ لپٹ کر خوشامدیں کی جاتیں آخر کار وہ من جاتیں۔

چناں چہ اب جو وہ صحن میں داخل ہوئیں تو گویا نسیم سحری کی طرح آئیں اور اپنے ہم رکاب نہ صرف بوئے چمن لائیں بلکہ اپنے اوٹ میں نرگس، نسرین اور گلاب وغیرہ بھی لائیں یعنی گھکی، نکی اور سانولی اور دیگر لڑکیاں بھی ان کے پیچھے چھپی چھپی آ رہی تھیں۔ مقصود اس سے حاضرین کو تعجب انگیز مسرت بہم پہنچانا تھا۔ وہی بات ہوئی کہ

دفعتاً "ہوئے" کے شور سے فضا گونج اٹھی اور کچے کنوارے قہقہوں کی مسلسل موسیقی سے سارا صحن رسمسا گیا۔

ان سب سے دور، سڑک والے کمرے میں کسی جٹا جوٹ سنیاسی کی طرح پاٹھ کرتے ہوئے سردار جی کے کان بھی ان آوازوں سے تھرتھرائے، پیشانی کے خطوط گہرے ہوگئے انہوں نے جلدی سے اپنے بڑے بڑے دانتوں پہ ہونٹ پھسلا کر بے چینی سے پہلو بدلا اور غرا کر کہا:

"باگورو نام جہاز ہے، جو چڑھے سو اُترے پار۔"

3

داتن کی آخری منزل پر پہنچ کر باج نے بڑا کنستر اٹھایا اور صحن کے پرلے گوشے میں رکھی ٹل کے کے قریب پہنچا۔

اب فضا نسبتاً پرسکون تھی۔ کچھ لوگ تو چھوٹی سردارنی کو گھیرے تھے باقی اپنے اپنے مشاغل میں محو تھے۔

کنستر ٹل کے نیچے رکھ کر باج نے رکی کے دوچار ہاتھ ہی چلائے ہوں گے کہ سامنے سے نکی جلد جلد قدم اٹھاتی ہوئی اس کی جانب آئی اور آتے ہی بولی: "کنستر اٹھاؤ تو......"

باج کی خوشی کا بھلا کیا ٹھکانہ تھا۔ داتن چباتے چباتے اس کا منہ رک گیا۔ آنکھوں کے گوشے شرارت اور حرمزدگی کے باعث سمٹ گئے۔ "نی گوبے کی گل اے۔"

"اے دیکھ گل ول کچھ نہیں۔ کنستر ہٹا جھٹ پٹ۔"

باج نے دانت پیس کر ہاتھ پھینکا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نکی پہلے ہی سے تیار تھی۔ جھپ سے پیچھے ہٹ کر بدن چرا گئی اور نیم معشوقانہ انداز سے چلا کر بولی۔ "ہم کیا کہہ رہے ہیں کنستر ہٹا، نا۔"

"اری کنستر سے کیا بیر ہے...... ہماری ہر چیز سے بدکتی ہو۔"

"پانی پئیں گے۔"

باج نے کنستر ہٹا دیا۔ "لو جانی پیو اور جیو۔ جیو اور پیو۔"

نکی نے نل کے نیچے ہاتھ رکھ دیا اور قدرے انتظار کے بعد انجن کی سیٹی کی سی آواز میں چلائی "اے ہے...... دستی ہلاؤ۔"

باج نے صوفیانہ رمز کے ساتھ جواب دیا۔ "تم ہی ہلاؤ نا دستی......"

"دیکھو تنگ مت کرو۔"

"اری نام نکی ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تو سچ مچ نکی (چھوٹی) ہے۔"

"چھوٹی نہیں تو کیا بڑی ہوں۔" نکی نے نچلا ہونٹ ڈھیلا چھوڑ کر شکایت آمیز نگاہ اس پر ڈالی۔

اب باج نے بڑی فراخ دلانہ ہنسی ہنس کر دستی ہلانا شروع کی۔

پانی پی کر نکی بھاگنے لگی تو باج نے فوراً اس کی کلائی دبوچ کر ہلکا سا مروڑا دے دیا۔

"اوئی۔"

"کیا ہے؟"

"میری کلائی ٹوٹ جائے گی۔"

"یہاں دل جو ٹوٹا پڑا ہے۔"

"چھوڑنا! کوئی دیکھ لے گا۔"

"اری کبھی ہم سے بھی دو بات کر لیا کر۔"

"کہانا، کوئی دیکھ لے گا۔"

"تو پھر آئے گی نا ہمارے پاس۔"

"میں نہیں جانتی۔"

ایک اور مروڑا۔ نجی کو واقعی سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ جان چھڑانے کے لیے بولی۔"اچھا آجاؤں گی۔"

"پکا وعدہ"

"ہاں۔"

"مار ہاتھ پر ہاتھ"

ہاتھ پر ہاتھ مارا گیا۔

"اچھا دیکھ! اب کلائی چھوڑے دیتا ہوں، پر ایک شرط ہے..... تو بھاگے گی نہیں۔" "اچھا نہیں بھاگوں گی۔ چھوڑ اب کوئی دیکھ لے گا۔"

"بس دو بلٹ بات کر لے ہم سے۔ جاد رکھیو جو ہمیں دھوکا دیا تو بانس پر لٹکا دوں گا۔"

ہاتھ چھوٹنے پر نجی ننھی سی خوش وضع ناک چڑھائے اور ابرو پر بل ڈالے نیم رضا مندی سے رکی رہی اور جب کہ باج اس نظارے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ ٹھنک کر بولی۔

"کہہ اب۔"

"بات کرتی ہو کہ ڈھیلے مارتی ہو۔"

"اب جو تم کچھو جلدی سے بات کہہ ڈالو۔ اتا بخت (وقت) نہیں ہے۔"

"بخت (وقت) نہیں ہے۔ کیا کسی جار سے ملنے جانا ہے۔"

"دھت۔ کوئی سن لے گا۔ تم بڑے....."

"بڑے کیا؟"

"بدماس ہو۔"

"ہائے سر ہپ جادی..... کبھی کبھار بدماس سے بھی ایک آدھ بات کر لیا کر..... اچھا نجی یہ بتا کہ تیری عمر کتی ہے۔"

'' سولہ برس۔''

'' کیسی میٹھی عمر ہے۔''

''ہوگی۔ بس جائیں اب۔''

'' گھٹکی کی بھلا کیا عمر ہوگی؟''

'' مجھ سے ڈیڑھ سال بڑی ہوگی۔''

''اور سانولی ......''

'' چودہ کی ہوگی۔''

'' لیکن تکی تو تو چودہ کی بھی نہیں دیکھتی۔''

'' دکھتی کیسے نہیں۔''

''جرا نجیک (نزدیک) آنا! دیکھوں۔''

'' ہٹ۔''

'' آج کل مستی جھاڑ رہی ہو۔ پہلے تو گھٹکی ہی تھی۔ اب تم نے بھی پر نکال لیے ہیں.....تم کیا اب تو سانولی بھی رنگ دکھلا رہی ہے۔''

'' ارے دیکھ سانولی کو کچھ مت کہیو۔ وہ بچاری اندھی ہے۔ اس سے بری بھلی بات مت کرنا۔''

'' اری تکی جوانی بن بولے بات کرتی ہے۔ اس کو اندھی کہتی ہو۔ کھد مجا اڑاتی ہو.....لو وہ رہی سانولی۔ چپ چاپ دروجے میں بیٹھی ہے۔''

صحن کے دوسرے کونے میں دروازے کی دلیز پر اندھی سانولی الگ تھلگ چپ چاپ بیٹھی تھی۔

تکی نے ادھر دیکھا تو ہاتج نے پوچھا۔'' سانولی جنم کی اندھی ہے کیا؟''

''نہیں۔''

'' تو کیسے ہوئی اندھی۔''

"دیکھو بے کار بے کار باتیں کرتے ہو۔ ہم جاتے ہیں۔"

"ٹھہرا جرا۔ بتا تو دے۔" باج نے اصرار کیا۔ وہ قربِ یار کو طول دینے کے لیے بے معنی باتیں کیے جارہا تھا۔

"بھئی ہم کچھ نہیں جانتے۔ لالہ (باپ) کہتا ہے کہ وہ بچپن میں اندھی ہو گئی تھی۔ اب میں کیا جانوں۔ لو ہم چلے۔"

"ارے ہیں دروتے میں سانولی کے پاس کون کھڑا ہے؟"

"نکی چلتے چلتے رک گئی۔" ہم نہیں جانتے۔"

باج باچھوں کو خوب کھینچ کر ہنسا۔" تجھے معلوم نہیں..... بھی تو تیرے جار ہیں۔"

"دیکھ ہم سے بکواس مت کر..... ہم اسے کیا جانیں۔ رات ہی تو آیا ہے۔"

"ارے رات والا..... اچھا اچھا یاد آیا۔ میں نے اس وقت اندر سے سر نکالا۔ سچ نکی میں سمجھا تم ہو..... لیکن نکی تم....."

نکی نے جھنجھلا کر قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔" لو ہم چلے۔"

اس پر باج نے زور سے ناک صاف کی اور دستی ہلانے لگا۔

4

لڈو سرپٹ بھاگتا ہوا آیا اور کارخانے کے دروازے کے دونوں پٹ اس قدر دھاکے کے ساتھ کھولے کہ اندر کام کرتے ہوئے باج اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھ رک گئے۔ وہ قدرے حیران ہو کر اس کا منہ تکنے لگے کہ لڈو لیبلوں کی گڈیاں باندھنی چھوڑ کر بے وقت یہاں کیسے آن ٹپکا۔

اندر پہنچ کر خود لڈو کو اس بات کا احساس ہوا کہ اس قدر دھاکے سے اپنی آمد کے جواز کے لیے جو مواد اس کے پاس ہے وہ کافی اور مناسب ہے بھی یا نہیں۔ بہرحال اس نے ہانپتے ہوئے گردن گھما کر سب کی طرف دیکھا اور بولا۔" جارو! آج بڑی مجے

کی بات دیکھنے میں آئی۔"

مزے کی بات!! — اس وقت گیارہ بجنے کو تھے۔ کاریگر مسلسل کام کر رہے تھے۔ اس لیے وہ مزے کی بات سننے کے موڈ میں تھے۔ اُدھر باج سنگھ نے صبح باسی مٹھے سے سر دھویا تھا۔ اس کے بالوں سے ابھی سڑی لسّی کی بساند دور نہیں ہوئی تھی۔ اس نے بھی موقع غنیمت جانا کہ مزے کی بات سننے کے ساتھ ساتھ وہ بالوں میں کنگھا کرے گا۔ اس طرح جب اس کے بالوں کے اندر تک ہوا پہنچے گی تو بال سوکھنے کے ساتھ بساند بھی دور ہوجائے گی۔ چناں چہ اس نے اپنا پھاوڑا سا کنگھا اٹھایا اور اسے داڑھی میں اڑس کر بولا:

"ابے لڈو ماؤں کے متراڑ، جب سے تو پیدا ہوا ہے۔ آج تک تو نے کوئی مجے دار بات نہیں سنائی لیکن آج تو مینڈکی کو بھی زکام والی مثال تجھ پر لاگو ہوتی ہے...... اچھا بول بیٹے بجورے۔"

حالات موافق پاکر باقی کاریگر بھی پنڈے کھجاتے ہوئے لڈو کے قریب آگئے۔ ان میں مونوں (منڈے ہوئے سروالوں) نے بیڑیاں جلا کر دانتوں میں داب لیں۔

اس غیر متوقع خوش آمدید سے لڈو کی جان میں جان آئی۔ اس نے کھکھیا کر ایک بیڑی طلب کی— جو قدرے ناک بھوں چڑھانے کے بعد دے دی گئی۔ اب لڈو نے بڑے اہتمام کے ساتھ بیڑی کو جلایا یہ توقف حاضرین کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا جارہا تھا۔ باج نے دولتی رسید کرنے کے انداز سے پاؤں اوپر اٹھاتے ہوئے کہا "اوئے بھین کے بگین جلدی سے اُگل ڈال۔ سالے ہم تیرے بے بے کے نوکر تو نہیں ہیں کہ بیٹھے منہ تکتے رہیں تیرا......"

"جار آج بڑے مجے کی بات ہوئی۔" لڈو نے اس طرح بات شروع کی جیسے اُبلتے ہوئے پانی کی کیتلی کا ڈھکنا بھک سے اڑجائے۔ "آج صبح جب باج نگی سے...... باج نگی سے......"

باج نے خونخوار تیور بنا کر کہا۔'' اوئے تیری بہن کو چور لے جائیں...... ہماری ہی بات ملی سنانے کو......''

'' میں میں جی۔'' لڈو نے خالص پنجابی لہجے میں حلق سے گھسا کر آواز نکالی۔

'' پادشاہو! آپ کی بات نہیں ہے۔ وہ تو گھکی کی بات ہے۔''

ایک کاریگر نے اشارہ کر کے ساتھیوں سے کہا۔'' یہ چونگا بھی ٹھرکی ہے اور گھکی پر ٹھرک جھاڑنے والوں میں شامل ہے، ہاں تو برخوردار کیا بات ہے گھکی کی......''

'' اوجی جب چھوٹی سردار اکھبار میں لگی ہوئی ماسٹر تارا سنگھ کی تصویر سب کو دکھال رہی تھیں تو گھکی اور چمن کی نجریں ملیں...... میں دیکھ رہا تھا چپکے سے۔''

'' تو تو دیکھا ہی کرتا ہے گھکی کو، پرسالے چمن نے جتنی چمیاں لی ہیں تونے اُتنی ٹھوکریں نہ کھائی ہوں گی گھکی کی۔''

اس پر لڈو نے روٹھنے کے اندازے سے منہ بسورا تو کسی نے ہمدردی جتائی۔''

بھئی ایسا مت کہو بچارے کو گھکی کی ٹھوکروں میں کیا کم مجا ہے۔ کیوں نے تو ٹھوکر بھی نہ کھائی ہوگی اس کی...... ہاں تو بول بیٹا بول...... بول بجورے بول۔''

'' بس پھر کیا تھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے ہوئے، ابرو ہلے۔ اور پھر گھکی بڑی مسوی کے ساتھ اٹھ کر ٹھک ٹھک چل دی۔''

'' کہاں چھت کو۔''

'' ابے نہیں...... اس بکت تو وہ اپنے گھر کو گئی۔ تھوڑی دیر بعد چمن نے کہا کہ جرا پکھانے جاؤں گی۔ سردارے (سردار جی کا بڑا لڑکا) نے کھانس کر کہا۔ ہئی جلدی آنا۔ نہ جانے پکھانے میں بند کیا کرتے ہو۔ اس پر چمن بڑی میٹھی ہنسی ہنستا ہوا پچھلے کمرے میں چلا گیا...... جہاں سے کہ چھت کو سیڑھیاں جاتی ہیں۔''

ایک دو نے جماہی لے کر کہا۔'' ابے لڈو کے گھسے۔ یہ سب پرانی باتیں ہیں روج کا قصہ ہے......''

"ابے سن تو۔" لڈو نے سرزنش کی۔" سب کی نجر بچا کر میں بھی گیۂ پیچھے اور ہئ جب اوپر پہنچا تو دیکھا کہ سیڑھیوں کا دروجہ بند ہے۔ بس ہئ یہ دیکھ کر میری پھونک نکل گئی۔"

باج ہنسا۔" سالے تیری پھونک تو اچھی طرح نکلنی چاہئے پھول کے گبارہ ہو رہا ہے۔"

لڈو نے سنی ان سنی کرتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔" پہلے تو میں سمجھا کہ دروجے کے پاس ہی کھڑے ہوں گے، مگر کوئی آواج سنائی نہیں دی۔ دراڑ میں سے جھانکا تو چھت پر بھی کوئی صورت نہیں دکھائی دی۔ پھر میں نے سوچا کہ جرور برساتی کے اندر بیٹھے ہوں گے۔"

" بڑی جسوسی دکھائی تو نے۔"

لڈو نے بیڑی کا کش لیا۔" میں نے نیچے اوپر سے ہاتھ ڈال کر چٹکنی سرکادی۔ یہ دیکھو میری بانہہ پر خون جم گیا ہے......"

" آگے بول۔"

" چھت پر سے ہوتا ہوا میں برساتی کی طرف بڑھا۔ اینٹوں کی جالی میں سے دیکھا کہ وہ دونوں اندر چار پائی پر کچھ بیٹھے اور کچھ لیٹے ہیں۔"

ایک کاریگر بولا۔" لیکن گھکی وہاں کیسے پہنچی۔"

لڈو کو اس کی حماقت پر بڑا رحم آیا۔ جارا تم بھی بس...... چھت سے چھت ملی ہوئی جو ہے۔"

" ہئ تو بڑا عکل بند (عقل بند) ہے۔ اب آگے چل۔"

" بس آگے کیا پوچھتے ہو، بڑے مجے میں تھے دونوں۔ گھکی کا منہ تو لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ جی چاہا کہ بس جا کر لپٹ ہی جاؤں۔"

" واہ رے بجورے۔" باج بولا۔" اب تو ایہہ بات پکی ہوگئی کہ معاملہ چمی

چاٹی تک ہی نہیں ہے...... اچھا پھر کیا ہوا؟''

''بڑے پریم کی باتیں ہو رہی تھیں۔ چمن نے گھنگی کے منہ کے آگے سے بال ہٹا کر کھوب بھینچ بھینچ کر......''

''ارے یہ سب تو ہوا ہی ہوگا۔ جیہہ تو بتا کہ باتیں بھی ہو رہی تھیں کچھ؟ جیہہ تو مالوم ہو گیا ارادے ہیں ان کے۔''

''پھر گھنگی نے بڑے پیار سے اس کے گلے میں باہیں ڈال کر پوچھا'' تم سچ مچ مجھی سے پیار کرتے ہو'...... چمن نے مور کی طرح گردن ہلائی اور بولا۔'' سچ مچ''

''مجھے اکین نہیں آتا۔''

''جالم۔ جالم۔ اری ہم تو جان پھدا کرتے ہیں۔''

گھنگی نے یہ سن کر سر نیچا کر لیا اور گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اس پر چمن نے پھر اسے سمیٹ کر اپنی گود میں لے لیا اور کہنے لگا۔'' کہو تو آسمان سے تارے توڑ لاؤں، کہو تو اپنی چھاتی چیر کر...... گھنگی نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور پھر ایسے بولی جیسے سُفنے میں بول رہی ہو۔' تم تارے مت توڑو۔ اپنی چھاتی مت چیرو...... مجھے...... مجھے اپنی داسی بنا لو۔''

''داسی! داسی؟ ارے تم رانی ہو رانی۔ داس تو ہم ہیں تمہارے۔

''گھنگی کچھ دیر چپ رہی۔ پھر بولی۔' تم میرا مطبل نہیں سمجھے۔ مجھ سے سادی کر لونا۔''

جیہہ سن کر چمن بدک گیا۔ جیسے گھنگی کھوب صورت لڑکی نہیں، ناگن ہو اور وہ اسے بڑی عجیب نجروں سے دیکھنے لگا۔ اس بخت گھنگی کا سر جھکا ہوا تھا۔ سائی اپنے کھیال میں مگن بولی۔' میں گریب کی لڑکی ہوں۔ ہر کوئی مجھے بھوکی نجروں سے دیکھتا ہے۔ ہر کوئی مجھے کھانا چاہتا ہے...... گھر سے باہر پاؤں رکھنا مسکل ہو گیا ہے۔ پھر بھی میں نے اجت بچا کر رکھی۔ مگر تمہارے آگے میرا کوئی بس نہیں چلا۔ سوچو اگر مجھے کچھ ہو گیا تو؟''

''جیبہ کہہ کر اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ اس پر چمن نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔'' اری واہ روتی کاہے کو ہے۔ بے پھکر رہو، تمہیں کچھ نیں ہوگا۔ پریم میں ایسی باتیں دن رات ہوتی رہتی ہیں۔تم بڑی دہمن ہو۔''

'' مگر میں تمہاری ہوچکی ہوں۔ سدا کے لیے تمہاری۔ جیبہ کہہ کر اس نے اپنے پیلے رنگ کے کرتے سے آنکھیں پونچھیں لیکن آنسو نہیں تھمتے تھے۔ ہچکیاں بھرتی ہوئی بولی۔'' چمن! میں عمر بھر تمہارے پاؤں دھو دھو کر پیوں گی۔ تمہاری نوکر رہوں گی۔ تمہارے اشارے پر ناچوں گی۔ لالہ کو میری بڑی پھکر لگی ہے۔ ماں ہے نہیں۔ میں ہی سب میں بڑی ہوں۔ مجھے چھوٹی بہنوں کا بھی کھیال کرنا ہے۔ میں تمہاری منت کرتی ہوں۔ مجھے چھوڑنا نہیں۔''

'' اے ہے، تمہیں کون چھوڑتا ہے۔ پگلی ہوئی ہو کیا؟''

'' اس پر گھگی نے بھیگی آنکھوں سے چمن کی طرف دیکھا اور بولی، میں تم وادا کرو کہ مجھ سے سادی کرلو گے...... میں بڑی منہ پھٹ ہوں۔ بے سرمی ماپھ کرو۔ مجھے اپنی بنالو۔ میں خوب پڑھ لکھ لوں گی اور جیسا تم کہو گے ویسا ہی کروں گی۔''

'' جیبہ کہتے کہتے گھگی کا سر جھک گیا اور اس نے مدھم آواج میں پوچھا۔'' کہو مجھی سے سادی کرو گے؟'' اور جب اس نے پھر چمن کی طرپھ دیکھنے کو سر اٹھایا تو چمن نے جھٹ سے اس کا سر دبا کر چھاتی سے لگا لیا۔'' ہاں ہاں بھئی۔ تجھی سے سادی رچاؤں گا اری تم میں کمی کس بات کی ہے۔تم سندر ہو۔ ہجاروں میں ایک ہو۔۔۔ لو اب چلیں تم بھی گھر کو جاؤ۔نہیں تو نیچے والے سک کریں گے......''

'' جیبہ سن کر میں بگٹٹ بھاگا وہاں سے۔''

5

دوپہر کے وقت گرمی کی وہ شدت ہوتی تھی کہ کیا کارخانے اور کیا پریس کے

کاری گر سبھی کام چھوڑ کر الگ بیٹھ جاتے۔ دن کا یہ حصہ سب سے زیادہ دلچسپ ہوتا تھا۔ فرصت کا سماں ہوتا تھا۔ حویلی جی بھر کر کشادہ تھی۔ چھوٹے بڑے متعدد کمرے، ان میں اونچی اونچی الماریاں، کرسیاں، میزیں، پلنگ، صندوق—— غرض آنکھ مچولی کھیلنے کا پورا سامان میسر تھا۔

باج سنگھ تنور سے روٹی کھا کر لوٹا تو سیدھا حویلی کے اندر داخل ہوگیا۔ بڑے بڑے سردار جی کے سوا حسب معمول سبھی لوگ موجود تھے لیکن بڑی سردارنی سب سے الگ تھلگ پہلے بڑے کمرے میں براجمان تھیں۔ دوسرے کمرے سے ہنسی ٹھٹھوں اور خوش گپیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

آج تنور پر روٹی کھانے کا باج کو کچھ مزا نہیں آیا تھا۔ دل میں کنکر، راشن کے آٹے میں ریت، تنور والوں کی ایسی تیسی کر کے پیٹ بھرے بغیر ہی وہ لوٹ آیا تھا۔ جب وہ حویلی میں داخل ہوا تو قدرتی طور پر سب سے پہلے اس کی نگاہ سردارنی پر پڑی۔ تعجب! آج وہ پان چبا رہی تھی۔ چھوٹی سردارنی تو خیر ہر کھانے کے بعد ایک عدد پان کلّے میں دبا لیتیں۔ نہ جانے کہاں سے لت لگی تھی انہیں۔ بڑی سردارنی کو پان چباتے ہوئے اس نے پہلی بار ہی دیکھا تھا۔ ان کی باچھوں اور ہونٹوں پر گہرے سرخ رنگ کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ نظریں چار ہوتے ہی بڑی سردارنی اس قدر بے دریغ انداز میں مسکرائیں کہ ایک بار تو باج بدک گیا لیکن پھر سنبھال کر وہیں اینٹوں کے فرش پر بیٹھ گیا اور اپنے ٹخنوں اور پنڈلیوں پر سے لکڑی کا برادہ جھاڑنے لگا۔

بڑی سردارنی نے اس کی جانب چوکی دھکیلتے ہوئے کہا۔" ہاۓ ہاۓ! جمین پر کا ہے بیٹھتے ہو چوکی پر بیٹھو۔"

"نہیں بڑی سردارنی! اینٹیں ٹھنڈی لگ رہی ہیں، مجا آرہا ہے۔ اچھا کریں ہیں آپ جو دوپہر کو پھرش پر پانی بکھرا دے ہیں۔ سچ بڑی سردارنی بڑی دور کی سوجھے ہے آپ کو...... سچ ہے۔"

یہ سن کر سردارنی نے چاہا کہ مارے خوشی کے پھولی نہ سمائے لیکن اب اور پھولنے کی گنجائش ہی کہاں تھی۔ چناں چہ اس نے پہلے تو کمال انکار سے سر جھکا دیا۔ پھر قدرے بھونڈے مستانہ پن سے نظریں اٹھائیں۔

باج کو کوئی بات سوجھ نہیں رہی تھی۔ اس لیے اس نے پگڑی کے اندر دو انگلیاں داخل کر کے سر کھجانا شروع کر دیا۔ سردارنی محققانہ انداز میں بولی:

"روٹی کھا کر آ رہے ہو؟"

"جہر مار کر کے آ رہے ہیں۔"

باج کو برہم پا کر سردارنی بڑے مبالغے کے ساتھ پریشان ہوئیں۔" آخر ماجرا کیا ہے؟"

باج نے ماجرا سنایا اور نتیجہ یہ برآمد کیا کہ" روٹی! ہائے روٹی! تو بڑی سردانی آپ کی ہوتی ہے۔ مکھن سسرا روٹی کی نس نس میں رچ جاتا ہے۔ نوالہ منہ میں رکھتا ہی نہیں بتاشے کی طرح گھلا اور چل اندر۔"

بڑی سردارنی کو تعریف و توصیف کے یہ فقرے ہضم کرنے کے لیے خاصا پرانا یام Deep Breathing کرنا پڑا۔ جب دم میں دم آیا تو ایک خاص سرتال میں بولیں:

"کبھی ہمارے یہاں کھاتے بھی ہو۔"

"کبھی کھلاتی بھی ہیں آپ۔" چالاک باج نے اسی سرتال میں برجستہ جواب دیا۔

اس پر جلال میں آ کر جو بڑی سردارنی اٹھیں تو باج کو یوں محسوس ہوا جیسے زمین سے آسمان تک اودی گھٹا چھا گئی ہو۔

روٹی کھاتے کھاتے باج نے پوچھا۔" کیوں جی! آج بڑے سردار جی بیٹھک میں کس سے بات چیت کر رہے ہیں؟"

سردارنی نے جھالر دار پنکھا جھلتے ہوئے جواب دیا۔" معلوم نہیں۔"

گھر میں ایک ہی ٹیبل فین تھا بجلی کا، اور وہ جدھر بڑے سردار جی جاتے ان کا

پوچھا کرتا۔

باجی نے نمک حلال کر ڈالنے کے خیال سے کہا۔ "کیوں مذاخ کرتی ہیں سردارنی! بھلا یہ کبھی ہوسکتا ہے کہ ادھر بات چیت ہو رہی ہو اور آپ کو خبر نہ ہو۔"

سردانی نے بڑے بڑے کی طرح منہ کھولا لیکن دفعتاً اس کا دہانہ تنگ کر کے بولیں۔" جسوس چھوڑ رکھے ہیں ابھی مالوم ہوجائے گا سب کچھ۔"

اسی اثنا میں چھوٹی سردارنی بغل والے کمرے سے نکل کر ان کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ بتیسی نکلی پڑتی تھی۔ سنہری کیلیں چمک رہی تھیں۔ حسب معمول لڑکیاں ان کے ساتھ تھیں۔ جب لڑکیاں ساتھ تھیں تو قدرتی طور پر لڑکے بھی ساتھ تھے......

بڑی سردارنی کو چھوٹی سردارنی کے یہ چھن پسند نہیں تھے اور پھر اس موقع پر؟ چناں چہ اس نے چپکے سے ناک بھوں چڑھا کر ہاتھ کو ذرا Slow Motion سے گھما کر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اسے یقین تھا کہ باجی بھی اس معاملے میں اس سے متفق ہے لیکن باجی نے بڑی دیدہ دلیری سے اپنے بے ڈول دانتوں کی نمائش کی اور ترمال اپنے سامنے پاکر اس نے دل ہی دل میں نعرہ لگایا۔" جو بولے سو نہال......"

چھوٹی سردارنی معہ کم سن پریوں کے اور جنات کے دھوم دھڑاک سے آگے بڑھیں۔ ان کے پہلو بہ پہلو ان کا ہاتھ جھلاتی گھنگی چہکتی، پھدکتی چلی آ رہی تھی۔ گھنگی محض بانکی نہیں تھی بلکہ اسے اپنے بانکپن کا احساس بھی تھا۔ ہر نگاہ جو اس کے چہرے یا جسم پر پڑتی تھی۔ اس کا ردعمل اس کی ابروؤں کی لرزش، ہونٹوں کی پھڑکن یا جسم کی کسی نہ کسی حرکت سے ظاہر ہوجاتا۔

اس کے بعد قلی...... گھنگی نوک پلک اور چہرے کے خد و خال کے لحاظ سے غضب تھی تو قلی بدن کے اعضا کی متناسب بناوٹ، تناؤ اور تڑپ کے اعتبار سے قیامت تھی۔ اس کی نظریں بڑی بہن کی طرح دور تک نہیں پہنچتی تھیں۔ وہ اس انسان کے مانند دکھائی دیتی تھی جو ویرانے میں بھٹکتا بھٹکتا دفعتاً میلے میں آ نکلے......

نکّی کی چندری کا دامن اندھی سانولی کے ہاتھ میں تھا۔ اس کا چہرہ اوپر کو اٹھا رہتا۔ وہ بڑی دونوں بہنوں سے کم گوری تھی۔ خدو خال گوارا لیکن چہرہ بحیثیت مجموعی پرکشش تھا۔ اسے اس بات کا مطلقاً احساس نہیں تھا کہ مرلی والا اس کے بدن میں عمر کے ساتھ ساتھ کیا کیا تبدیلیاں کر رہا ہے۔ کیوں کہ اس مٹّے کا احساس تو لڑکی کو آنکھیں چار ہونے پر ہی ہوسکتا ہے۔ وہاں ایک بھی دیکھنے والی آنکھ نہیں تھی۔ اس لیے آنکھیں چار ہونے کا وچار ہی پیدا نہیں ہوتا تھا......

"بلّے بلّے۔" باؔج کو اپنے کان میں آواز سنائی دی۔ دیکھا کہ بونگا بھی اسے کارخانے میں نہ پاکر وہاں آن پہنچا تھا اور پھر رال ٹپکاتے ہوئے بولا۔" جار! گھکّی کی کمر تو دیکھو۔ کیسی پتلی۔ کیسی لچک دار ہے۔ آنکھ نہیں ٹکتی اس پر......"

"اوئے میں جٹّی پنجاب دی۔

میرا ریشم برگا لک......"

معاً باؔج نے بونگے کو کہنی کا ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔" دیکھ اوئے جل ککڑ!!"

جل ککڑ پریس میں لیبل پرنٹ کیا کرتا تھا۔ اس کی عمر چونتیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ دو بچے بھی تھے۔ تعجب! وہ بھی سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہوگیا تھا۔ یہ راز باؔج کی سمجھ میں اب تک نہ آیا تھا۔ لیکن آج اس نے دیکھا کہ کیسے جل ککڑ نے دیدہ دانستہ نکّی کو دھکا دیا اور کیسے نکّی معشوقانہ ادا کے ساتھ اس کی اس حرکت کو برداشت کیا لیکن آخر جل ککڑ میں رکھا ہی کیا تھا۔ اس کی مضحکہ خیز صورت کی وجہ سے ہی تو یاروں نے اس کا نام جل ککڑ تجویز کیا تھا......مگر عورت کے دل کو کون پاسکتا ہے......

بونگے نے کہا۔" جار یہ تو دور مار توپ نکلا۔ کیسا مسکین بنتا تھا۔"

آج کل جل ککڑ زیادہ تر رنگین بشرٹ پہنے رہتا تھا۔ جس کے کپڑے پر چینی طرز کے اژدہا ناچتے دکھائی دیتے تھے۔

سردار جی کے لڑکے بھی" چل کبڈی تارا۔ سلطان بیگ مارا۔" کہتے ہوئے ساتھ

ساتھ چلے آ رہے تھے اور ان کے پیچھے وہ نوجوان تھا جو وہاں کوئی امتحان دینے کے لیے نیا نیا آیا تھا۔ اسے دیکھتے ہیں باج نے پوچھا۔ ''اوے ماں دیا متراڑا ایہہ کون ہے۔''

''اوئے جیہہ بھی اپنا منڈا ہے۔ نواں داخل ہو یا اے عسک دے مدرسے دے بچ۔''

''اچھا اچھا...... ایہہ تاں پرسوں ہی آیا ہے۔''

''آہو جی لونڈیوں کی باتیں چھوڑو۔ اب ناریوں کی باتیں کرو۔''

پریوں کے اس قافلے نے زمین پر ڈیرے ڈال دیے اور اس کی خوش نوائیوں میں بڑی سردارنی اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگی۔

''اوئے پرجی چمن کہا ہے؟''

ایک چھوٹا لڑکا (غالباً بڑی سردارنی کا جاسوس) جو بیٹھک سے اسی وقت وہاں آیا تھا بولا۔ چمن ادھر بیٹھک میں بیٹھا ہے۔''

باج کو حیرت ہو رہی تھی، یہ کیا؟ گل اِدھر اور بلبل ادھر؟ پھر اسی جذبے کے تحت اس نے گھگی کی جانب دیکھا۔ وہ نظروں ہی نظروں میں سب کچھ سمجھ گئی۔ اس کے ابرو لرزے، پلکیں جھپکیں، کمر لچکی اور پھر وہ ساکت ہوگئی۔ باج نے دل پھینک تیور بنا کر آنکھوں ہی آنکھوں میں سمجھایا کہ لو ہم تفتیش کرتے ہیں اور حسن کے چور کو حسن کے حضور میں حاضر کرتے ہیں۔ چناں چہ اس نے بلند آواز میں پوچھا۔ ''لیکن بئی وہ وہاں کیا کر رہا ہے؟''

''اُدھر ایک جرنیل صاحب بیٹھے ہیں۔''

باج نے سوچا کوئی فوجی افسر ہوگا۔ یہ لونڈے ہر ایسے افسر کو ایک دم جرنیل بنا دیتے ہیں۔ پھر بولا۔ ''پرہائی! چمن کا وہاں کیا کام؟''

''چمن کے بابو جی بھی بیٹھے ہیں۔''

اس سے مراد یہ کہ چمن کو باپ کی وجہ سے مجبوراً وہاں بیٹھنا پڑ رہا ہے۔ ''اچھا تو

بچو چمن کو انہوں نے وہاں کس لیے پھانس رکھا ہے۔" باج نے جرح کی۔

"وہ پھوج میں بھرتی ہو رہا ہے۔" لڑکے نے ٹیں سے جواب دیا۔

اب باج نے ایک نظر بڑی سردارنی پر ڈالنا ضروری سمجھا اور پھر منہ ٹیڑھا کر کے اس کے ایک کونے میں سے سانپ کی پھنکار کی سی آواز نکالتے ہوئے بولا۔" اے جی آپ کا جسوں تو بڑا ہسیار نکلا۔"

داد پا کر سردارنی ہاتھی کی طرح جھومنے لگیں اور عرصہ تک جھومتی رہیں۔

جب جسوں لونڈے کو محسوس ہوا کہ وہ ایسی باتیں کہہ رہا ہے جن سے سب کو بڑی دلچسپی محسوس ہو رہی ہے تو اس نے مزید معلومات بہم پہنچانے کے لیے کہا۔" چمن ماہاؤ جا رہا ہے۔"

" اوئے ماہاؤ کون جگہ کا نام ہے۔ وہاں تیری ماؤں (ماں) رہتی ہے کیا؟" بونگے نے دبی زبان میں کہا تاکہ صرف باج سن سکے۔

سردارے نے کہا۔" اوئے ماہاؤ نہیں مہو کہو مہو۔"

" کیا چمن، مہو جا رہا ہے؟" سردار جی کے چھوٹے لڑکے نے سوال کیا اور ساتھ ہی پہلے تو مصنوعی تعجب کے مارے دونوں ٹانگیں خوب پھیلا کر اور پاؤں فرش پر جما کر بالکل بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ اور پھر سمٹ کر جو کودا تو کمرے سے باہر اور بیٹھک کے اندر۔

" اوئے چمن ہم کو چھوڑ کر مہو جا رہا ہے اور ہم کو خبر تک نہیں دی۔"

لفظ" ہم" سے اس کا اشارہ گھکی کی طرف تھا۔ یہ الفاظ اس نے کھڑے ہو کر کہے۔ اس وقت اس کی میلی کچھ کا اور بھی زیادہ میلا ازار بند اس کے دونوں گھٹنوں کے بیچ میں جھول رہا تھا اور اس نے پر معنی انداز میں انکھیوں سے گھکی کی جانب دیکھا۔ بھلا گھکی کو اس کی بات کا مطلب پا لینے میں کیا مشکل پیش آ سکتی تھی۔ اس کے دل میں ایسی گدگدی پیدا ہوئی کہ وہ اٹھ کر رقصاں و شاداں چھوٹی سردارنی کے ایک بازو سے اٹھ

کر اس کے دوسرے پہلو میں جا بیٹھی اور بے حد سریلی آواز میں بولی۔ ''ہمیں پہلے ہی سے معلوم تھا۔''

کھکی نے یہ بات زیادہ زور سے نہیں کہی لیکن یہ اتنی بلند ضرور تھی کہ باآج اسے آسانی سے سن سکے۔

اس پر باآج ٹھنڈا ہو کر ٹھنڈے فرش پر اس طرح بیٹھ گیا جیسے غبارے میں سے دفعتاً ساری ہوا نکل جائے اور پھر اس نے ابرو ہلا کر اور مونچھیں پھڑکا کر بونگے کے کان میں کہا:

''جار! سچ مچ یہ لونڈیا بڑی چلتی پرزی ہے۔''

6

ایت وار!

آج سردار جی کے دونوں لڑکے دس بجے کا انگریزی شو دیکھنے جا رہے تھے۔ بڑے زور شور کے ساتھ تیاریاں ہو رہی تھیں۔ نہ جانے کب کی پرانی نکٹائیاں برآمد کی گئیں۔ ایک مسہری لگانے کے بانس کے سرے پر بندھی تھی اور دوسری بڑے ٹرنک کے پیچھے سے گیند کی طرح گول مول کی ہوئی نکلی۔

چوں کہ اس وقت چھوٹی سردارنی غسل کر رہی تھیں اس لیے ان کی چیلیاں بے جان سی ہو کر ادھر اُدھر لٹک رہی تھیں۔ نکی بڑی سردارنی کے ساتھ باورچی خانے کے اندر بیٹھی تھی۔ سانولی پرے نل کے پاس بیٹھی ایڑیوں کو رگڑ رگڑ کر دھو رہی تھی۔ دستی ہلانے والا نیا نوجوان تھا۔ کھکی حویلی کے بڑے دروازے کے آگے بنی ہوئی چند پختہ سیڑھیوں کے بیچ والے حصے پر بیٹھی تھی اس کی دونوں کہنیاں اس کے گھٹنوں پر ٹکی تھیں اور دونوں ہتھیلیوں کے بیچ میں اس کا چہرہ پھنسا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں اداس تھیں۔ چمن کو گئے پچیس دن گزر گئے تھے لیکن کھکی کو اس کا ایک خط تک نہ آیا تھا۔ حالانکہ دوسروں

کو اس کی چٹھیاں آ چکی تھیں......

اتوار کی وجہ سے چھٹی تھی، اس لیے کاریگروں کی گہما گہمی نہیں تھی۔ البتہ باج اور بونگا موجود تھے کیوں کہ وہ مستقل طور سے وہیں پر مقیم تھے۔

دیواروں کی سفیدی کرنے کے کام میں آنے والے پانچ فٹ اونچے اسٹول پر پاؤں کے بل بیٹھا باج داتن چبا رہا تھا۔ اسٹول کے ساتھ سٹ کر زمین پر بیٹھا ہوا بونگا آئینے میں دیکھ دیکھ کر چمٹی سے ناک کے بال نوچ نوچ کر پھینک رہا تھا۔

دور بیٹھک کی طرف سے ایک بڑے سنکھ کی سی آواز میں سردار جی پاٹھ کر رہے تھے۔ سردار جی کا پاٹھ اور باج کی داتن دونوں مشہور چیزیں تھیں۔ ادھر سردار جی مسلسل کئی کئی گھنٹے پاٹھ کرنے میں جتے رہتے۔ ادھر اتوار کو فرصت پا کر باج علی الصبح ہی منہ میں یہ لمبی داتن اڑس کر بیٹھ جاتا۔ پہلے اسے چباتا پھر دانتوں پر گھساتا۔ پھر چباتا اور دانتوں پر گھساتا۔ یہاں تک کہ داتن ختم ہو جاتی۔

بونگے نے اپنے کام سے فرصت پا کر اطمینان سے ٹانگیں زمین پر پھیلا دیں۔

بلند نشین باج نے اپنے تیزی سے ہلتے ہوئے منہ کو لحہ بھر کے لیے روکا اور بونگے سے مخاطب ہو کر دبی زبان میں پھنکار کر بولا۔ ''بونگیا! آج گھکی کچھ اداس ہے۔ شاید چھوٹی سردارنی کا انتجار ہو رہا ہے۔''

اس طرح بولنے سے باج کی مونچھوں میں پھنسے ہوئے تھوک کے قطرے اڑ کر بونگے کے چیچک مارے چہرے پر پڑے اور اس نے بھڑک کر اسٹول کو ذرا سا ہلا دیا اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں لال چنگاری بنا کر کہا۔ '' اوئے ابھی ہلا دوں تو راج سنگھاسن سے سر کے بل نیچے گر پڑے۔ ہم پر تھوکتا ہے؟''

اسٹول کے قدرے ہل جانے پر باج نے گدھ کے مانند بازو پھڑ پھڑائے اور اس کی طرف دھیان دیے بغیر بولا۔ '' کیوں یہی بات ہے نا! ملکاں (چھوٹی سردارنی) کا انتجار ہو رہا ہے۔''

"اوئے کمیں ۔۔۔" بوٹنگے نے نتھنے پھلا کر عالمانہ انداز میں جواب دیا۔" ہیر کو رانجھے کا۔ سسّی کو پنّوں کا۔ گوپی کو کنھیا کا انتجار ہے، سمجھے؟"

"سمجھا۔" باج سے بھلا کیا بات چھپی تھی۔ اس نے بوٹنگے کو محض گرمانے اور پھر اس کی کسی حرکت بازی کا لطف اٹھانے کے لیے انجان پن کا ثبوت پیش کیا تھا۔

اب بوٹنگے نے احتیاطاً ادھر اُدھر دیکھا اور کسی کو قریب نہ پا کر ہلکا سا نعرہ بلند کیا۔" ہائے" روئے سخن کھلی کی جانب۔

"کیا ہے؟" باج نے پوچھا اور سمجھ گیا کہ بوٹنگے کو خرمستی سوجھ رہی ہے۔

"درد۔" بوٹنگے نے جواب دیا۔

"کہاں؟"

"جیہہ تو میں مرجاواں تاں بھی نہ دستاں۔" بوٹنگے نے خاص زنانہ آواز میں جواب دیا اور پھر قدرے سکوت کے بعد گانے لگا۔

"چھوڑ گئے بالم!"

"اکیلی مجھ نوں چھوڑ گئے۔"

فضا بوٹنگے کی لرزاتی آواز سے گونج اٹھی۔

اب دونوں چھوٹے سردار تیار ہو کر اندر سے نکلے تو اس شان سے کہ پہلے تو بڑے بھائی نے اندر سے چھلانگ لگائی تو کھلی کے اوپر سے کود کر صحن میں۔ وہ سمجھنے بھی نہ پائی تھی کہ دوسرا بھائی صاف کود گیا اوپر سے۔ کھلی ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا۔ چمک کر بولی۔" ہمیں نہیں اچھا لگتا ایسا مجاخ، اگر ہماری گردن ٹوٹ جاتی تو؟"

اس پر چھوٹے بھائی نے پنجاب کے مشہور لوک ناچ بھنگڑا کے انداز میں چند چک پھیریاں لیں اور گلے کی گہرائیوں میں سے نہایت گگیائی ہوئی آواز نکال کر گیت کا بول دہرایا:

''چھوڑ گئے بالما!''

اُدھر بونگا بھی بس تیار ہی بیٹھا تھا۔ فی الفور چھاتی پر دو ہتڑ مار کر بین سر میں گا اٹھا:۔

''اکیلی مجھ کو چھوڑ گئے۔''

اس پر باج نے جو قہقہے لگائے تو وہ سیدھے آسمان کے اس پار پہنچے۔ بڑی سردارنی معہ نکی کے باورچی خانے کے دروازے میں آن کھڑی ہوئیں۔ چھوٹی سردارنی بھی غسل سے فارغ ہو کر نکل آئیں۔ سانولی سمجھی ضرور کوئی مزے دار بات ہو رہی ہے۔ چناں چہ وہ نل کے پاس بیٹھی زور زور سے ہنسنے لگی۔

چلتے چلتے چھوٹا۔ سردار وہی بول دہراتا گیا اور بونگا بھی گرمی کھا کر سینے پر دو ہتڑ مار مار جواب دیتا گیا۔ صحن میں قیامت کا شور سن کر بڑے سردار جی اندر سے ہی کڑکے — تو چھوٹے سردار جی بگٹٹ بھاگے۔ باج اسٹول سے کودا اور بونگے سمیت کارخانے میں جا گھسا۔ بڑی سردارنی اور نکی نے اندر سے باورچی خانے کا دروازہ بھیڑ دیا۔ گھکی اچھلی اور چھوٹی سردارنی نے اسے بغل میں دابا اور ایک بار پھر غسل خانے کے اندر......

7

دیومی داس کے مکان اور دکان کے آگے سڑک کے آر پار کاغذ کی رنگ برنگی جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ باجے بج رہے تھے۔ گھر کے اندر کسی تاریک گوشے میں چند عورتیں بطخوں کی قیں قیں کی سی آواز میں ٹوٹے پھوٹے گیت گا رہی تھیں۔

گھکی کی شادی ہو رہی تھی!

چمن کے ساتھ؟ نہیں۔

بارات آنے والی تھی۔ محلے کے لونڈے دوڑ دوڑ کر دولھا کی پیشوائی کو جاتے

لیکن بڑے بوڑھوں کی زبانی یہ سن کر کہ ابھی بارات نہیں آئی تو مایوس ہو جاتے اور چپ چاپ چڑوے ریوڑیاں چبانے لگتے۔

بیٹھک میں بڑے سردار جی اور ان کے چند معزز اور بزرگ ساتھی کاٹھ کے الوؤں کی طرح ساکت بیٹھے تھے۔ کبھی ایک آدھ بات ہو جاتی تو سب اثبات میں سر ہلا ہلا کر اظہار اطمینان کرتے۔

پریس کے کاریگر سڑک کی جانب برآمدے میں کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ادھر کارخانے کے کاریگر جلیبیں بجاتے چھت پر چڑھ گئے۔ وہاں سے دیوی داس کی نیچی چھت صاف دکھائی دیتی تھی۔ اس کی چھت پر دس پندرہ چارپائیاں بچھی تھیں کیوں کہ زیادہ براتیوں کے آنے کی امید نہیں تھی۔ چند بچے اور عورتیں بے جان رنگوں کے کپڑے پہنے سست قدموں سے ادھر اُدھر کے کام کرتی پھرتی تھیں۔ قریب والے پیپل کے پیڑ کا تاریک سایہ چھت پر پھیل رہا تھا — اور باجے الگ کراہ رہے تھے۔

چھت والے کاریگروں میں سے ایک سر ہلا کر بولا۔ "تت تت عورت کی بے وفائی کے بارے میں سنا تھا، لیکن آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔"

بوگے نے نتھنے پھلا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر کچھ کہنے کے لیے منہ پھلایا — اور پھر نتھنے اور منہ دونوں سکوڑ کر رخ دوسری جانب پھیر لیا۔

کاریگر کو تعجب ہوا۔ اس نے باج کو کندھا مار کر کہا۔ "کہو استاد! آج بوگے کو کیا ہو گیا ہے۔"

باج نے پہلے بھولے ماری آنکھ دکھا کر بے رخی برتی۔ لیکن پھر چشم بینا سے شرارے برسا کر کہا۔ "عورت کی بے وفائی نہیں، مرد کی بے وفائی کہو۔"

"یعنی؟"

"یعنی جیسے کہ چمن کو یہاں سے گئے تین مہینے گزر چکے ہیں اس نے ایک سطر تک نہیں لکھی گھتی کو......"

"اور گھمّی نے؟"

"اس نے اپنے ہاتھ سے ٹوٹی پھوٹی ہندی میں اسے کئی چٹھیاں لکھیں لیکن ایک کا بھی جواب نہیں آیا۔"

اب بونگے نے بھی بولنا شروع کر دیا۔" چمن نے اپنے چار دوستوں کو لکھا کہ کسی نہ کسی طرح گھمّی کو چٹھی لکھنے سے روکا جائے۔ ہر چٹھی اس کی اس بات سے کہ اگر میرے پر ہوتے تو میں اڑ کر آپ کے پاس آجاتی۔" "تنگ آ گیا ہوں۔"

"اُدھر کہیں چمن کے پتا جی وہاں جانکلے۔" باج نے بات آگے بڑھائی۔" ان کی موجودگی میں کہیں کوئی کھت آیا تو انہوں نے پڑھ لیا۔ پہلے بیٹے کے کان مروڑے اور پھر یہاں آ کر بڑے سردار جی کو بتایا۔ سردار جی نے دیوی داس کو بلایا اور کہا۔" اوئے لونڈیا کی سادی کردے جھٹ پٹ، پندرہ دن کے اندر۔ نہیں تو دکان کھالی کردے اور اٹھا بوریا بستر مکان سے بھی۔" ایسے مسکل سمیں میں بھلا دیوی داس کہاں جاتا۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔ پر جی گریب کی لڑکی کی سادی بھلا اتنی جلدی کہاں ہوسکتی ہے؟ چمن کے باپ نے کہا۔" آکھر تمہاری لونڈیا کو ایسے کھت لکھنے کی ہمت کیسے ہوئی۔ جیبھ کی کھاک سر کو چڑھے، بڑے سردار جی نے ڈانٹ پلائی۔ اب میں نے کہہ دیا۔ جیادہ رعایت نہیں نا ہوسکتی۔ پندرہ دن کے اندر اندر سادی کر ڈال کہیں، میں تو مکان اور دکان دونوں سے کھارج۔"

گفتگو اسی منزل پر پہنچی تھی کہ بڑی سردارنی جی بھی اوپر آنکلیں اور حسب عادت باج کے قریب کھڑی ہوگئیں۔ اپنی آمد پر سب کو چپ دیکھ کر بولیں، "بارات نہ جانے کب آئے گی؟"

ان کی بات ختم بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ لوگ باگ چلّا اٹھے۔" بارات آ گئی۔ بارات آ گئی!"

شہنائیاں اور زور سے کائیں کائیں کرنے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد سردار جی کا چھوٹا لڑکا دوڑا دوڑا آیا۔ ’’ اوئے نئیں ڈوب گئی۔
دھت تیری کی۔‘‘

’’ کیوں کھیریت؟ دوھا دیکھا؟ کیسا ہے؟‘‘ سب نے ایک زبان ہو کر پوچھا۔

لڑکے نے بڑے واہیات انداز سے بازو ادھر اُدھر پھینک کر جواب دیا۔ ’’ دھت تیری کی...... چڑی مار...... بالکل چڑی مار دکھائی دیتا ہے۔‘‘

8

اگست 47ء کے فسادات زور شور سے شروع ہوئے تو حویلی کے مکینوں اور کاریگروں کے وقت کا کچھ حصہ قتل و غارت، ہندوؤں اور سکھوں پر ڈھائے گئے مظالم اور ان کے خواتین کی آبرو ریزی جیسے موضوعات پر صرف ہونے لگا۔ لیکن وہاں کی روز مرہ کی زندگی اور چہل پہل میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا۔ سوائے اس کے کہ گھکی کی شادی کو تین ساڑھے تین ماہ گزر چکے تھے۔ ان تین مہینوں کے دوران میں چمن دوچار دن کے لیے جالندھر آیا۔ انہوں نے الگ مکان کا انتظام کر لیا تھا۔ پھر بھی چمن سردار جی کے گھر چوری چھپے آتا رہا۔ وہ گھکی سے بچ کر رہتا تھا۔ خود گھکی نے بھی بطورِ خاص اس امر کی احتیاط برتی کہ اس کی چمن سے مڈبھیڑ نہ ہو۔

چمن نے سردار جی کے لڑکوں کو بتایا کہ مہو میں اس کی زندگی بڑے مزے اور چین میں کٹ رہی تھی۔ اردگرد معشوقوں کی بھی کچھ کمی نہیں تھی۔ اس نے ایک نیا آرٹ سیکھا تھا۔ جس کا مظاہرہ اس نے سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے بنا بنا کر کیا۔ اگر گھکی کی کوئی بات چلتی تو کہتا۔ ’’ ہندوستانی لڑکیاں بھی بس، عجیب ہوتی ہیں۔ ذرا ہنس کر بات کو لو تو گلے کا ہار ہو جاتی ہیں۔ فلش Foolish چائلڈش Childish!!‘‘

بالآخر وہ گھکی سے ایک بات کیے بغیر ہی واپس چلا گیا۔

بظاہر گھکی پر اس کا کوئی خاص ردعمل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ اب بھی چھوٹی

سردارنی کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی، ہنستی بولتی، لیکن اس کے دل کو گھن لگ چکا تھا۔ اس کا جسم نرم اور کمزور تو پہلے ہی تھا۔ لیکن اب تو بالکل ہی ہڈیوں کا ڈھانچ سا ہوتا جارہا تھا۔ وہ نہایت نازک اور شگفتہ پھول کے مانند تھی اسے اگر مناسب حالات میسر آجاتے تو یقیناً اس کی مہک دور دور تک پھیلتی۔ لیکن اب وہ درد دبا کر خاموش ہوگئی تھی۔ اس کے چہرے سے ایسا سنجیدہ وقار ٹپکتا تھا کہ اب کسی کو اس سے چہل بازی کرنے کی جرأت تک نہیں ہوتی تھی۔ اُسے کھانسی آنے لگی تھی۔ جب کھانسی چھوٹتی تو وہ اپنے کمزور سینہ کو چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے تھام کر کھانستے کھانستے بے حال ہوجاتی۔ اس کا چہرہ سرخ ہوجاتا۔ بعض دیکھنے والوں کو اس کی حالت پر ترس آنے لگتا۔ لیکن وہ مسکراتی ہوئی اپنے خوش وضع سر کو پیچھے کی جانب پھینک کر اُسے دائیں بائیں دو چار جھٹکے دیتی اور پھر بات چیت میں مصروف ہوجاتی۔

نکّی، البتہ اب اڑ نکلی تھی۔ اسے بات بے بات پر اس قدر ہنسی چھوٹتی تھی کہ بس لوٹ پوٹ ہوجاتی۔ پہلے گھکی ان محفلوں کی جان تھی تو اب نکّی! گھکی کا رویہ پہلے بھی پر وقار تھا۔ اب سینہ پر زخم کھا کر وہ اور سنجیدہ ہوگئی تھی۔ مگر نکّی شروع ہی سے شوخ تھی اور اب میدان صاف پاکر وہ تڑپتی ہوئی بجلی بن گئی تھی۔ چھیڑ چھاڑ کی اس میں بہت برداشت تھی۔ اس لیے وہ گھکی سے زیادہ مقبول تھی۔ خفا ہونا تو اسے آتا ہی نہیں تھا۔ سمٹنا، بننا، بچنا، جھوٹوں ہی ابرو پہ بل ڈالنا، پٹھے پر ہاتھ نہ رکھنے دینا، یہ سب درست، پھر بھی وہ خفا نہیں ہوتی تھی۔ خواہ کچھ بھی ہوجائے۔ اس کی چہک اور مہک میں فرق نہیں آتا تھا۔

اب نکتہ سنجوں کو یہ بھی کوئی راز کی بات نہ رہی تھی کہ نکّی کا خاص منظورِ نظر پریس کا وہی آدمی تھا جسے سب جل ککڑ کہتے تھے لیکن سمجھ میں نہ آنے والی بات یہ تھی کہ آخر اس کے پاس کون سی ایسی گیدڑ سنگی تھی جس کی وجہ سے نکّی سب کو چھوڑ چھاڑ کر اس کی بغل گرم کرتی تھی۔

ایک روز شام کے وقت ایک بہت بڑے زمین دوز چولھے پر لوہے کی کڑا ہی جمائی گئی جسے دیکھ کر سب کے منہ میں پانی بھر آیا۔ کیوں کہ چند مہینوں کے وقفے کے بعد یہ وہ شام ہوتی تھی، جب بڑی سردارنی کڑا ہی میں ریت گرم کر کے اس میں مکّی، چنا اور چاول بھونتیں، گڑ ملا کر ان کے مرونڈے تیار کرتیں اور سب کو جی بھر کر کھلاتیں۔ چناں چہ جب کارخانے کے اندر تیشہ چلاتے ہوئے باج سنگھ کو بونگے نے خبر سنائی کہ آج صحن میں کڑا ہی جمائی گئی ہے اور بڑی سردارنی کے کیا تیور ہیں تو اس سے نہ رہا گیا۔ وہ تیشہ ویشہ پھینک فوراً باہر نکلا اور دیکھا کہ بونگے نے جو زیادہ تر جھوٹ بولا کرتا تھا' اب کے جھوٹ نہیں کہا تھا۔

بڑی سردارنی نے جب باج کو دیکھا تو اس انداز سے مسکرائی کہ جیسے اسے پہلے ہی سے یقین تھا کہ باج سب کام چھوڑ چھاڑ کر فوراً باہر آئے گا۔ آج سردارنی نے جامنی رنگ کا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ یوں تو اسے کوئی بھی رنگ نہیں پھبتا تھا لیکن جامنی رنگ تو بہت ہی بھونڈا لگ رہا تھا۔ اس رنگ کے تلے اس کے پلپلے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلتی جارہی تھی۔ باج سے آنکھیں چار ہوتے ہی وہ بامعنی انداز سے لٹک کر باورچی خانے میں داخل ہوگئی۔

رفتہ رفتہ سب قسم کے دانے بھن چکے تو پھرتی کی مدد سے بڑی سردارنی نے سوندھی سوندھی بووالے دانوں کو گڑ میں ملا کر الگ الگ قسم کے مرونڈے تیار کیے۔

چھن منٹ منٹ کی خبر پریس میں پہنچا رہا تھا۔ کارخانے کے کاریگر چوں کہ باورچی خانے کے زیادہ نزدیک تھے، اس لیے وہ کام میں من لگا ہی نہیں سکے۔ وہ اس بات کے منتظر تھے کب سردارنی اپنی لوچ دار آواز میں انہیں کھانے کی دعوت دے اور کب وہ پل پڑیں میٹھے مرونڈوں پر۔

سب سے پہلے سردارنی نے گھکّی کو آواز دی۔ اب اسے گھکّی پر پیار سا آنے لگا تھا۔ گھکّی دونوں کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے اور منہ بازوؤں میں چھپائے کھانس رہی تھی۔

کھانس چکی تو حسب عادت اس نے سر کو پیچھے کی جانب پھینک کر دائیں بائیں دوچار جھٹکی دیے اور پھر ہنسنے لگی...... اس کی ہنسی خوب فراخ ہوتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس کے چہرے پر عجیب کیفیت طاری رہتی تھی۔ اب اس پر پہلے والے لطیف ردعمل نہیں ہوتے تھے، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ خود اپنے لیے ہنس رہی ہے...... اسی طرح کھل کھلا کر ہنستی ہوئی وہ آگے بڑھی اور اس نے دونوں ہاتھ ایسے پھیلائے جیسے اسے مندر یا گوردوارے سے پرشاد مل رہا ہو۔

بڑی سردارنی نے سب کو نام لے لے کر بلایا۔ ''وے بونگیا، وے چرن، نی سانولیے، نی پریمو......'' باج اپنے محبوب اسٹول پر ٹنگا ہوا تھا۔

اسے نہیں بلایا گیا۔

نہیں، اسے نام لے کر نہیں بلایا گیا۔ بلکہ سب کی نظریں بچا کر سردارنی جی اسے ابروؤں آنکھوں اور سر کے اشاروں سے بلاتی رہیں۔ گویا اس کے لیے مخصوص پیغامات بھیجے جارہے تھے۔ باج بھی ایک کائیاں تھا۔ جی میں حیران بھی تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کسی روز سردارنی بغل گیر ہوجائے۔ کچھ دیر سردارنی کی حرکات سے محظوظ ہونے کے بعد وہ قلانچ بھر کر اسٹول سے اترا اور دوسری قلانچ میں وہ سردارنی کے قریب پہنچا۔ مرونڈے لیتے وقت اس نے سردارنی کی پسلیوں میں کہنی کا ایک ٹہوکا بھی دیا۔ کیوں کہ...... اب اتنا حق تو ضرور تھا سردارنی کا اس پر۔

بونگا آج بہت لاڈ میں آیا ہوا تھا۔ باج کے پاس بیٹھنے کے بجائے وہ چھوٹی سردارنی کے قریب جا بیٹھا اور بندر کی طرح بڑے مبالغے کے ساتھ منہ آگے کو بڑھا کر اور چپ چپا چپ کی آوازیں نکالتا ہوا مرونڈے چبانے لگا۔ اسی وقت نکی کو قریب سے خاص انداز میں اٹھتے اور ذرا غیر قدرتی انداز میں چلتے دیکھ کر بونگے نے چھوٹی سردارنی سے مخاطب ہوتے ہوئے بڑی بے باکی سے کہا:

''او جی! نکی کا پاؤں تو بھاری دکھائی دیتا ہے۔''

بوّج نے بھی یہ بات سن لی۔ اس نے غور سے دیکھ تو اسے بھی یقین سا ہونے لگا اس نے سوچا۔ آخر بات کیا ہے۔ آج بونگا سچ ہی بولے جارہا ہے۔

9

رفتہ رفتہ نکّی کا پاؤں اور زیادہ بھاری ہوگیا تو حویلی میں کچھ چہ مہ گوئیاں ہونے لگیں اور پھر دفعتاً نکّی غائب ہوگئی۔ پہلے تو یہ افواہ اڑی کہ وہ جل ککڑ کے ساتھ غائب ہوئی لیکن جل ککڑ حسب معمول کام پر آتا رہا۔

سب سے اہم بات یہ تھی کہ جس روز نکّی غائب ہوئی تو اس کے گھر والوں نے پریشانی کا اظہار بالکل نہیں کیا۔ تیسرے دن گھکّی نے دبی زبان سے اعتراف کیا کہ موسی گاؤں سے آئی تھی۔ وہ اسی کے ساتھ چلی گئی تھی۔ موسی کب آئی تھی؟ بس وہ آئی اور چلی گئی۔ لیکن نکّی نے کبھی کہیں جانے کا ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا— ان سب سوالوں کا ٹال مٹول کے سوا کوئی جواب نہیں تھا..... اگر کوئی اور زیادہ کرید کر پوچھتا تو گھکّی کو کھانسی چھڑ جاتی۔ وہ کھانستے کھانستے بے حال ہوتی۔ یہاں تک کہ بات آئی گئی ہوجاتی۔

ماہ اکتوبر ختم ہونے کو تھا لیکن اگست سے جو فسادات شروع ہوئے تھے، ختم ہونے ہی میں نہ آتے تھے۔

حویلی کے طویل و عریض صحن کے ارد گرد متعدد کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ بہت سے کاریگر شہر کے خطرناک حصوں سے نکل کر معہ بال بچوں کے عارضی طور پر وہاں مقیم تھے۔ چناں چہ رات کو کارخانے میں کافی رونق ہوجاتی۔ کھانے سے فارغ ہوکر کاریگر گئی رات تک آپس میں گپ شپ ہانکتے اور مغربی پنجاب میں جو مظالم ہندوؤں اور سکھوں پر ڈھائے جارہے تھے۔ ان کی دل کھول کر مذمت کرتے۔

ایسی ہی ایک رات تھی۔

کھانا کھانے کے بعد کاریگروں کا ایک گروہ کارخانے میں گھسا گپ شپ میں

مصروف تھا۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ اسی لیے اندر سے کنڈی چڑھا دی گئی تھی بلکہ بونگا تو سلگتے ہوئے اپلوں کی مٹی کی انگیٹھی رانوں میں دبائے بیٹھا تھا۔ کسی نے آوازہ کسا:

"ابے بونگے اچھی جوانی ہے سالے، انگیٹھی رانوں میں دابے ہے۔"

"جار! جن انگیٹھیوں کی گری تھی ان میں سے ایک کی سادی ہوگئی اور دوسری گائب......"

"ہاں بھئی ڈیڑھ مہینہ ہوگیا تکی کو گیب ہوئے۔"

ایک بولا۔ "جار اچھی بات جاد دلائی مجھے، آج ایک آدمی ملا تھا جو تکی کی موسی کے گاؤں کے قریب والے گاؤں میں رہتا ہے۔"

"کیا تکی کی کوئی کھبر ملی؟" ایک دو نے دلچسپی لی۔

"ہاں۔"

"کیا؟"

"اس نے کنویں میں چھلانگ لگا دی تھی۔"

"ہرے رام !!"

"اس نے جیہہ بھی بتایا کہ اس کے بچہ ہونے والا تھا۔"

"ہو...... او...... پھر؟"

"اس نے بتایا جیادہ کھبر نہیں۔ سنا تھا کہ لڑکی بچ جائے گی۔"

باج نے رائے دی۔ میرے کھیال میں تو دیوی داس نے اس کی حالت دیکھ کر گاؤں بھیج دیا ہوگا تاکہ وہیں کہیں بچے سے جان چھڑا کر لوٹ آئے گی تو جلدی سے سادی کردی جائے گی اس کی۔"

اس افسوس ناک واقعہ کا سب کے دلوں پر اثر ہوا اور ہنستی بولتی محفل پر خاموشی طاری ہوگئی...... اتنے میں دروازے پر دستک کی آواز آئی۔

"کون؟" باج نے دریافت کیا۔ لیکن جواب میں پھر مسلسل دستک کی ہلکی ہلکی

آوازیں آتی رہیں۔

سب کو یہ بات عجیب سی معلوم ہوئی۔ باج اپنی جگہ سے اٹھا لیکن اس کے دل میں کھد بد کھد بد ہو رہی تھی کہ کہیں بڑی سردارنی نہ ہو۔ موقع پا کر اس نے چڑھائی کر دی ہو شاید۔

باؔج نے کنڈی کھول دی۔

باہر سے دروازے کو بہت آہستہ آہستہ دھکیلا گیا۔

چراغ کی تھرتھراتی ہوئی لو کی مدھم روشنی میں ایک لڑکی اندر داخل ہوئی۔

سانولی!!

باج دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

حاضرین میں سے سب کی آنکھیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ سانولی کو دیکھ کر قریب تھا کہ ان کے منہ سے بے اختیار مختلف آوازیں نکل جائیں۔ لیکن باج کے اشارے پر وہ اسی طرح چپ چاپ بیٹھے رہے۔

سانولی اور آگے بڑھی۔ اس کا گول چہرہ، نوخیز جوانی کی حدت سے تمتمائے ہوئے چہرے کی جلد، قدرے موٹے اور بھرپور ہونٹ۔ چکنے گال...... ان سب چیزوں کے حُسن کو پہلے کبھی کسی نے قابلِ توجہ نہیں سمجھا تھا۔ ان سب دل لیوا خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر شیر خوار بچّے کا سا بھولپن ہویدا تھا۔

لیکن اتنی گئی رات کو وہ وہاں کیا کرنے آئی تھی؟

سانولی نے ہاتھ پھیلا کر اس کی اونچی اور بھاری بھرکم میز کا سہارا لیا۔ جس پر باؔج فرنیچر بناتے وقت مختلف حصوں پر رندہ کیا کرتا تھا۔ لڑکی نے منہ کھولا اور سرگوشی میں بولی: ''باج، چاچا!''

''ہاں۔'' باؔج نے داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔

سانولی نے گردن اِدھر اُدھر گھما کر کوئی اور آواز سننے کی ناکام کوشش کی۔ اس

وقت اس کے نیم وا منہ کے اندر دانتوں کی قطار کے پیچھے اس کی جیبھ چھوٹی سی مچھلی کی طرح متحرک تھی۔ پھر اس نے راز دارانہ لہجے میں دریافت کیا۔ "تم اکیلے ہو؟"

یہ سن کر سب نے گردنیں آگے کو بڑھائیں۔ اُن کی آنکھیں پھیل گئیں۔

باج نے آواز کا لہجہ بدلے بغیر جواب دیا۔

"ہاں سانولی! میں اکیلا ہوں۔"

"کہاں ہو؟" یہ کہہ کر وہ بازو پھیلا کر ہاتھ ہلاتی ہوئی آگے بڑھی۔ پھر اس نے اسے چھو لیا۔

"یہ رہے تم!" وہ اسے چھو کر بہت خوش ہوئی۔

"سانولی! تم اس بخت یہاں کیوں آئی ہو؟"

"کیوں اس وخت کیا ہے؟"

"اس بخت رات ہے تم...... تم جوان ہو...... کریب کریب"

"میرے لیے رات اور دن ایک برابر ہیں۔"

"لیکن اس بخت رات کے گیارہ بج چکے ہیں...... اور پھر تم اکیلی ہو۔"

یہ سن کر سانولی کے صاف ستھرے چہرے پر اذیت کے آثار پیدا ہو گئے۔ وہ حیران ہو کر بولی:

"پر باج چاچا! بھلا تمہارے پاس آنے میں کیا برائی ہو سکتی ہے۔ تم تو دیوتا ہو......"

باج ٹھٹھک کر پیچھے ہٹا۔

"تم نہیں جانتے چاچا۔" سانولی نے پھر کہنا شروع کیا۔ "تمہاری دنیا اور ہے اور اندھوں کی دنیا اور۔ چاچا تم کتنے اچھے، کتنے مہربان ہو۔ جب میں تمہاری آواج سنتی ہوں تو گھنٹوں اس کی مٹھاس اور پیار کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔ جب کبھی لالہ (باپ) مجھے گتے ہوتا ہے تو میں سوچتی ہوں کہ کوئی بات نہیں میرا باج چاچا جو ہے۔ وہ مجھے لالہ سے کم پیار تو نہیں کرتا...... ٹھیک ہے نا۔"

اس دوران میں باجے مونچھ کا ایک سرا دانتوں میں ہلکے ہلکے چباتا رہا اس کی بات ختم ہوجانے پر اس نے تامل کیا اور پھر اس کے بدنما چہرے پر ایک دل کش مسکراہٹ پیدا ہوئی اور اپنا کھردرا ہاتھ اس کے سر پر رکھ کر بولا۔'' ہاں سانولی! یہ سچ ہے...... لیکن...... اس بخت تم جاؤ۔''

''نہیں، نہیں چاچا میں تم سے باتیں کرنے آئی ہوں۔''

'' اچھی لڑکی بنو سانولی! اس ٹیم جاؤ۔ کل کریں گے باتیں......''

'' اونہیں چاچا، کل تک صبر ہوسکتا تو میں بستر سے اٹھ کر کیوں آتی؟''

سب دم بخود۔

کارخانے کے کمرے میں ایک بار پھر سانولی کی آواز گھنٹی کی طرح گونج اٹھی۔'' باج چاچا! تم سمجھتے نہیں۔ میں تم سے باتیں کرنے آئی ہوں۔ اس بخت یہاں کوئی نہیں۔ جبھی تو میں تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

'' کیا باتیں کرنا چاہتی ہو؟''

'' باج چاچا!'' اب سانولی کی آواز بدل گئی۔ اس نے توقف کیا اور پھر بولی۔'' باج چاچا!...... کلد یپ بابو بہت اچھے ہیں...... وہ کہتے تھے کہ میری آنکھیں ٹھیک ہوسکتی ہیں میں جنم کی اندھی نہیں ہوں نا! اس لیے...... اور ...... وہ...... کہتے تھے کہ تم سے بیاہ...... بیاہ کروں گا۔''

اس پر باجے نے اپنی داڑھی کو مضبوطی سے مٹھی میں پکڑ لیا۔'' کون کلدیپ؟''

'' وہ جو نئے آئے تھے، وہی ناں!''

'' کیا کہتا تھا وہ......''

'' وہ کہتے تھے سانولی! تم مجھے بڑی پیاری لگتی ہو۔ میں کہتی میں اندھی ہوں، بھلا اندھی لڑکیاں بھی کسی کو پیاری لگتی ہیں۔ وہ کہتے باؤلی! پیار کیا نہیں جاتا، ہوجاتا ہے۔ میں تمہیں پیار کرتا ہوں اور پھر تم جنم کی اندھی نہیں ہو۔ تمہارا علاج ہوسکتا ہے۔ تم دیکھنے

لگو گی...... پر چاچا! ان کو گئے پندرہ دن ہو چکے ہیں۔ لوٹ کے نہیں آئے...... اور...... اور......"

یہ کہتے کہتے سانولی نے اپنی بے نور آنکھوں کو اور پھیلایا اور جیسے کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو اور پھر جھینپ کر بولی: "...... اور میرا پاؤں بھی بھاری ہے......"

باآج نے دفعتاً کھل جانے والے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

سانولی کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئی اور بغیر جوش و خروش کے ذرا غم میں ڈوبی ہوئی آواز میں اس نے پھر سلسلۂ کلام جاری کر دیا۔" آج بستر پر لیٹے لیٹے میں سوچ رہی تھی کہ اگر وہ نہ آئے تو......؟ لالہ بہت دکھی ہے۔ وہ کہتا ہے کھٹی اور نکی دونوں کھراب ہیں۔ ایک کو ایسا روگ لگ گیا ہے جس سے بچنا محال ہے۔ دوسری کا پاؤں...... سچ باج چاچا۔ لالہ بے حد دکھی ہے۔ وہ رات رات بھر روتا رہتا ہے...... وہ مجھ سے پیار کرتا ہے۔ مجھے گلے سے لگا کر کہتا ہے۔ یہ میری رانی بٹیا ہے۔ اسے باپ چھو کر بھی نہیں گیا...... لیکن اسے نہیں ملوم کہ میرا پاؤں بھی...... میں سوچتی ہوں کہ اگر کلدیپ بابو نہ آئے تو...... لالہ کو ملوم ہوجائے گا۔ وہ مر جائے گا۔ ایک دم مرجائے گا...... یہ سوچتے سوچتے مجھے رونا آگیا۔ مجھے کچھ نہیں سوجھا تو جی کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے تمہارے پاس چلی آئی...... لیکن وہ جرور آئیں گے...... ہیں! چاچا! وہ آئیں گے نا؟"

سب لوگ دم سادھے بیٹھے رہے۔

باآج نے ایک بار پھر اپنا بھاری بھرکم ہاتھ اس کے سر پر رکھا اور اسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔" ہاں سانولی! کلدیپ آئے گا...... وہ جرور آئے گا......"

تھرتھراتی ہوئی مدھم روشنی میں باج نے دیکھا کہ سانولی کی بے نور آنکھوں کے گوشوں میں آنسو دمک رہے ہیں......

"اور اب سانولی تمہیں واپس جانا چاہئے......"

یہ کہہ کر باآج نے دروازہ آہستہ سے کھولا اور سانولی کی پیٹھ پہ ہاتھ رکھ کر اسے آگے بڑھایا۔ وہ قدم بہ قدم چلنے لگی۔

باآج دروازے پہ ہی رک گیا۔ وہ سانولی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ہر چہار جانب خاموشی کی حکومت تھی۔ تاروں کی مدھم روشنی میں سانولی ایک سائے کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے لیے اندھیرا اجالا ایک برابر تھا۔ وہ بلا کسی ہچکچاہٹ کے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

باورچی خانے کے کونے سے گزر کر حویلی کی پر شکوہ لیکن سیاہ دیوار کے سیاہ تر سائے تلے سے ہوتی ہوئی جب وہ بڑے پھاٹک پر بنی ہوئی اس اونچی محراب کے تلے پہنچی، جس کے نیچے سے تین ہاتھی اوپر تلے آسانی سے گزر سکتے تھے تو باآج کو میلے کچیلے کپڑے پہنے وہ ابھرے بدن کی ہٹی کٹی اندھی لڑکی بہت کمزور، بے حقیقت اور بے دست و پا دکھائی دی۔ جیسے وہ کوئی رینگتا ہوا حقیر کیڑا ہو۔

باآج وہیں پہ کھڑا رہا۔ اس نے آسمان کی وسعتوں، حویلی کی بلند و بالا دیواروں، بے جان عمارتوں کے سلسلوں اور پھر اس طویل و عریض دالان پر نگاہ دوڑائی جس کی فضا میں کئی کچے کنوارے قہقہے گونجتے گونجتے دلخراش دردناک چیخوں میں تبدیل ہو گئے تھے......

رات، کوئی رات اس قدر کالی اس کے دیکھنے میں پہلے کبھی نہیں آئی تھی...... اور تارے خون کی چھینٹوں کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔

10

جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے۔ توں توں سانولی کے رازداں کاریگروں، خصوصاً باآج کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ سانولی اپنی بہنوں کی طرح برباد ہو۔ تل کے پاس یا دروازے کی سیڑھیوں پر، یا اونچی محراب تلے بیٹھی ہوئی اندھی سانولی کی حالت انہیں بڑی قابلِ رحم دکھائی دیتی تھی۔ آتے جاتے جب بھی ان کی

اُن سے مڈ بھیڑ ہوتی تو سانولی نے کبھی ان سے یا باج سے دوبارہ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔

تین دن اور بیت گئے۔

پنجاب برباد ہو رہا تھا۔ وارث شاہ کا پنجاب، گندم کے سنہرے خوشوں والا پنجاب، شہد بھرے گنّوں والا پنجاب، ہیر کا پنجاب، دُنبوں اور رہٹوں والا پنجاب: اور اس کی ایک بے نور آنکھوں والی حقیر سی بیٹی بھی برباد ہو رہی تھی۔

ایک رات جب کہ سب کاریگر کھانے دانے سے فارغ ہو کر حسب معمول کارخانے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو قدرتی طور پر سانولی کا ذکر شروع ہو گیا۔ ان سب کی دلی تمنا یہی تھی کہ کاش! سانولی کا اپنی بہنوں کا سا حال نہ ہو۔ لیکن وہ اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ یہ ناممکن ہے اور یہ سوچنا پرلے درجے کی حماقت ہے۔

باج کھلے دروازے میں کھڑا کالے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بوٹے کو سردی محسوس ہوئی تو اس نے چلّا کر کہا۔ "اوئے مئوں دیا مترا! دروا جا بند کر دے، سالے تو تو سانڈ ہو رہا ہے پھول کر، ہم غریبوں کا تو خیال کر۔"

اور کوئی موقع ہوتا تو باج بوٹے کی گالی کے جواب میں کوئی نئی اور بھاری بھرکم گالی کی اختراع کرتا۔ لیکن اس وقت اس نے چپکے سے دروازہ بھیڑ دیا اور خود بڑی میز پر ہاتھ ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔

سب اسے چہنے بولنے کے لیے اکساتے رہے لیکن جب اس کا موڈ ٹھیک نہیں ہوا تو انہوں نے بڑے اصرار سے پوچھا۔ بئی باج! آج کیا بات ہے۔"

"میں سوچ رہیا ہوں۔"

بوٹے نے سردی لگنے کے باوجود اٹھ کر جھٹ سے کبڈی کھیلنے والے کھلاڑی کا سا پوز بنایا اور قریب آ کر بولا۔ "بچے پادشا ہو! کیا سوچ رہے ہو؟"

باج نے اس کی جانب فلسفیانہ انداز سے دیکھا تو اسے ہنسی آ گئی۔ لیکن باج کے

تیور ویسے کے ویسے رہے۔

بوٹے کو تمسخرانہ انداز سے اپنی جانب دیکھتے ہوئے باج نے کلّے کے اندر زبان گھمائی اور پھر سر کو حرکت دے کر اس نے بوٹے اور دیگر ساتھیوں پر چھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور کہا:

"میں ایک بات سوچ رہا ہوں۔"

"کیا؟" سب کو اس کا فلسفیانہ موڈ دیکھ کر ہنسی آرہی تھی جسے وہ بہ مشکل روکے ہوئے تھے۔

باج نے سر کو یوں جھٹکا دیا جیسے وہ بہت بھاری جہاں دیدہ بزرگ ہو اور پھر میز کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ کر بولا:

"پنجاب میں کتا ظلم ہو رہا ہے۔ ایسا کھون کھرابا نہ دیکھا نہ سنا ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک۔"

"...... اور پھر ہندو اور سکھ عورتوں کی جو بجتی (بے عزتی) پچھی پنجاب میں مسلمان کر رہے ہیں۔ وہ سب تم کو مالوم ہے۔ ٹھیک؟"

"ٹھیک۔" سب نے ذرا جوش میں آکر جواب دیا۔

اب کچھ دیر تامل کرنے کے بعد دھیرے دھیرے سیاہیانہ انداز میں سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اور ایک لفظ پر زور دے کر بولا:

"پر — میں سوچتا ہوں کہ مسلمان گستے میں آکر جو بیا کوپھی (بے وقوفی) کر رہے ہیں، وہی بیا کوپھی ہم چنگے بھلے اپنی بہنوں اور بہو بیٹیوں کے ساتھ کر رہے ہیں۔ بتاؤ مسلمانوں کو دوش دینے سے پہلے ہمیں کھد کو شرم سوس نہیں ہونی چاہیے؟"

محفل پر سناٹا چھا گیا۔

ننھے سے چراغ کی پتلی سی تھرتھرائی لو کی روشنی میں باج نے اپنی موٹی اور لمبی انگلی اٹھاتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا:

'' ایسے ہی پاکستان میں گھمّی، نّھی اور سانولی کی ہزاروں لاکھوں بہنیں ہوں گی، تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم یا وہ کس عجت (عزت) کے لیے لڑ رہے ہیں۔ کیوں ایک دوسرے کو جانگلی کہتے ہیں؟''

اتنے میں دروازہ بڑے دھاکے کے ساتھ کھلا۔ سب نے ادھر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ سانولی دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی ہے۔ اس کے اعضا میں لرزش ہے۔ پیش تر اس کے کہ کوئی بولتا، وہ زور سے چلائی:

'' باج چاچا! باج چاچا!''

زندگی میں پہلی بار باج کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

'' باج چاچا! باج چاچا!''

سانولی کی آواز فضا میں دوبارہ گونجی۔

''ہاں، ہاں سانولی بول۔ گھبرائی ہوئی کیوں ہے تو، بول......''

'' وہ آگئے ؟''

'' کون؟''

'' کلد یپ بابو آگئے۔''

'' آگیا وہ؟'' سب خوشی کے مارے چلّا اٹھے۔

'' اور آتے ہی وہ مجھے ڈاکدار کے پاس لے گئے۔ ڈاک دار نے کہا آنکھیں ٹھیک ہو جائیں گی۔ لیکن علاج بہت دن کرنا پڑے گا......''

باج نے بڑھ کر سانولی کے دونوں کمزور کندھوں کو اپنے ہاتھوں میں دبوچ لیا اور اسے ملا کر بولا:

'' سچ، کب؟''

'' ہاں سچ۔ ان کی ماتا جی بھی ساتھ آئی ہیں۔''

'' اری تو وہ اتنے دن کہاں گیب رہا۔''

"انہوں نے مجھے بتایا کہ پہلے ان کی بات کوئی نہیں مانتا تھا۔ انہوں نے بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ بڑی مشکلوں سے انہوں نے ان کی بات مان لی۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسا رگڑا جھگڑا ہوا کہ میں گھت بھی نہ لکھ سکا۔ لکھتا بھی تو کیا لکھتا......"

"ہو ہو ہو ہو۔" سب بے اختیار ہنسے

سانولی نے جھوم کر کہا۔

"وہ میری منتیں کرنے لگے، کہنے لگے، سانولی مجھے معاف کر دو...... اگر تمہیں کوئی دکھ پہنچا ہو۔ ہم کوئی امیر نہیں ہیں، لیکن سب کام ٹھیک ہو جائیں گے...... ہم تمہیں دلّی لے جائیں گے......"

اب سب لوگ سانولی کی طرف بڑھے اور اپنے اپنے انداز اور لہجے میں خوشی کا اظہار کرنے لگے۔

آخر باج نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا:

"بھائیو! ٹھہرو۔ میرے خیال میں اب سانولی کو آرام کرنا چاہئے اسے رات کے سے گھر سے باہر نہیں رہنا چاہئے...... سانولی ہم بہت خوش ہیں۔ اب کل باتیں ہوں گی۔ چلو...... اب تم جلدی سے گھر جاؤ۔"

سانولی کے ساتھ کسی کا جانا مناسب نہیں تھا۔ کیوں کہ وہ گھر والوں سے چوری چھپے آئی تھی۔ سب اسے انتہائی پیار سے کارخانے کے دروازے تک چھوڑنے گئے۔

آٹھ دس منٹ بعد جب سارا ٹولہ بازار جانے کا پروگرام بنا کر باہر نکلا تو اونچی محراب تلے سے گزرتے وقت انہیں دیوار کے ساتھ ایک میلا بت سا نظر آیا۔

وہ سب رُک گئے۔

باج نے آگے بڑھ کر غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ سانولی ہے۔

"سانولی! تم ابھی گھر نہیں گئیں؟"

سانولی نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

" باج چاچا! نہ جانے میرے دل کو کیا ہوگیا ہے۔ کچھ سوجھتا ہی نہیں کہ کیا کروں۔ ذرا دم لینے کے لیے رک گئی..... باج چاچا! سوچتی ہوں۔ ایسی کھشی کی بات کیسے ہوسکتی ہے۔ لیکن چاچا تمہیں میری بات پر اکین ہے نا؟"

باج نے گھوم کر اپنے ساتھیوں کی جانب سوالیہ انداز سے دیکھا سب چپ تھے۔ وہ بھی چپ رہ گیا۔

سب کو خاموش پاکر ساتولی نے اپنا سوال دہرایا۔" آپ سب کو اکین نہیں آتا؟"

باج کی آنکھوں کے گوشے پر آب ہوگئے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ساتولی کے سر پر رکھ دیا اور پھر دھیمی آواز میں بولا:

" ہمیں اکین ہے— اور دیکھو تمہیں بے بخت گھر سے باہر نہیں رکنا چاہئے اور پھر سردی پڑنے لگی ہے۔ کہیں تم بیمار نہ ہوجاؤ۔"

ساتولی نے اس کی مضبوط کلائی کو اپنی کمزور انگلیوں سے چھو کر پوچھا۔" پر باج چاچا آپ سب لوگ بے وَخت کہاں جارہے ہیں؟"

" ہم" باج نے پدرانہ پیار سے لرزتے ہوئے اس کے گال کو چھوتے ہوئے جواب دیا..... " ساتولی بیٹی! ہم اس کھوشی میں برفی کھانے جارہے ہیں۔"

یہ افسانہ افسانوی مجموعہ 'پہلا پتھر' میں شامل ہے اور عنوان کتاب بھی ہے۔

بابا مہنگا سنگھ

ایک ہمارے ماموں صاحب ہیں کہ شہر میں کسی نہ کسی کام سے آتے رہتے ہیں۔ رات عموماً میرے ہاں ہی گزارتے ہیں اور جب رخصت ہونے لگتے ہیں تو مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کرتے ہیں۔ مجھے گاؤں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کھلی ہوا، دودھ، دہی، اور سیدھے سادے بھولے بھالے لوگوں سے مجھے کیا تعلق؟ میں دودھ کے بجائے چائے پینا پسند کرتا ہوں۔ کھلی ہوا کے بجائے کافی ہاؤس کی دھواں دھار فضا زیادہ اچھی معلوم ہوتی ہے۔ دیہات کے سیدھے سادے لوگوں سے براہِ راست تعلقات پیدا کرنے کے بجائے میں آرام کرسی پر بیٹھ کر کسی دوست کے ساتھ ان بیچاروں کے مفاد پر گفتگو کرنا افضل سمجھتا ہوں۔ حفظانِ صحت کی رو سے شہر کی ضرر رساں فضا میں چالیس برس جینے کو دیہات میں اسّی سال تک زندہ رہنے پر ترجیح دیتا ہوں...... لیکن ماموں صاحب کے اصرار سے مجبور ہو کر ایک مرتبہ دیہات میں جانا پڑا۔

گاؤں میں پہنچ کر مجھے مایوسی بالکل نہیں ہوئی بلکہ کچھ خوشی ہوئی کہ گاؤں کی بابت جو میرے خیالات تھے، وہ درست نکلے، اب ہر طرف کھلی ہوا تھی، کوئی اچھا مکان نہیں، کوئی سینما نہیں، کوئی کار نہیں، کوئی کمیونسٹ نہیں، بس کھلی ہوا ہے اور مجھے اس بات پر خوش ہونے کی دعوت دی جا رہی تھی۔ میں ماموں کے مکان کے باہر والے

کمرے میں بیٹھا جماہیاں لیا کرتا۔ گھر کے سامنے کھلی جگہ میں ماموں صاحب کی بھینسیں کھڑی دم ہلایا کرتیں۔ کبھی کبھی میری طرف دیکھتی۔ کہو بیٹا دودھ پیو گے، مکھن چاٹو گے، دہی کھاؤ گے...... میں کہتا، میڈم! آپ دودھ کی بجائے گرم چائے کیوں نہیں دیتیں، معلوم ہوتا ہے کہ آپ چائے کے ذائقے سے واقف نہیں، ورنہ...... بھینس بھی آخر دیہاتن ٹھہری۔ وہ قطع کلام کرکے سینگ ہلانے لگتی اور پھر اپنی بے قدری پر مضمحل ہوکر انتہائی بے اعتنائی سے پورب کی طرف دیکھنے لگتی اور میں ٹائی کی گرہ ڈھیلی کر کے پچھم کی طرف نظر جما دیتا۔

دو ہی روز بعد مجھے یقین ہوگیا کہ اس جگہ میرے دیکھنے کی کوئی چیز نہیں ہے۔ البتہ میں گاؤں والوں کے لیے دیکھنے کی چیز ہوں، ماموں جان مجھے اپنے ہمراہ لے کر باہر نکلتے تو جو واقف ملتا اور گاؤں بھر میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو ان کا واقف کار نہ ہو— اسے میری تفصیلات سے آگاہ کرتے۔ وہ لوگ مجھے سر سے پاؤں تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگتے— ان کے اس رویہ سے میں بھول ہی گیا کہ مجھے بھی یہاں کچھ دیکھنا ہے...... اور وہ پیاری پیاری دیہاتی لڑکیاں— جن کی تربوز تربوز بھر چھاتیاں، جنہیں دیہاتی سچ مچ چھاتیاں سمجھتے ہیں...... اور ان کے وہ گوبر میں سنے ہوئے ہاتھ، جنہیں پھیلا کر وہ کچھ ایسے بے باک انداز سے میری طرف دیکھتی تھیں کہ میں اپنے آپ کو بالکل سادہ لوح ظاہر کرنے لگتا، آنکھ وانکھ مارنا تو ایک طرف مسکرانے تک کی جرأت نہ ہوتی تھی— اور بچارے بھولے بھالے نوجوان جن کی صورتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اگر میرے ساتھ ماموں جان نہ ہوتے تو وہ ایک ٹکے کے لیے میری جان لینے سے گریز نہ کرتے۔

اس فضا میں میرنے لیے اور زیادہ عرصے کے لیے زندہ رہنا ناممکن ہوا جارہا تھا۔ مجھے بڑے اہتمام سے وہاں لے جایا گیا تھا اور میں بھی بڑے طمطراق سے وہاں گیا تھا۔ اس لیے دو ہی دن بعد لوٹ آنا قطعاً نا مناسب معلوم ہوتا تھا۔ نہ معلوم، میں کیا کر گزرتا۔ اگر سچ مچ میری دلچسپی کا سامان پیدا نہ ہوجاتا۔ منجملہ اور چیزوں کے میرے دل میں سب سے زیادہ کشش سردار مہنگا سنگھ کے لیے پیدا ہوئی۔

ایک روز صبح کے وقت جبکہ ماموں صاحب مجھے پورا آدھ سیر تازہ دوہا ہوا دودھ پلانے پر مصر تھے۔ [illegible] سردار مہنگا سنگھ [illegible] ماموں سے علیک سلیک تھی۔'' واہگورو جی کی فتح'' کہہ کر آگے [illegible] مجھے ماموں جی کی باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ تو میرے لیے مجسم درسِ عبرت تھا— وہ کیوں کر؟ —اب سردار مہنگا سنگھ کی عمر تین کم اسی برس کی تھی، لیکن اس عمر میں بھی دو چار سیر دودھ ایک ہی سانس میں پی لینا، اس کے لیے کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی اور ادھر میں جو ابھی نوجوان تھا۔ آدھ سیر دودھ بھی نہیں پی سکتا اور جب سردار مہنگا سنگھ جوان تھا تو وہ دودھ سے لبریز گھڑے کو منہ لگا دیا کرتا تھا۔

'' پینے کے لیے۔ ''؟

'' اور نہیں تو کیا؟''

میں کھیتوں میں غائب ہوتے ہوئے مہنگا سنگھ کو دیکھتا رہا۔ اس کا اونچا قد، لمبی داڑھی اور بڑے بڑے ہاتھ پاؤں......

'' کام کیا کرتا ہے؟''

'' کچھ نہیں، اپنی زمین کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ پہلے ڈاکے ڈالتا تھا، اب واہگورو کی بھگتی کرتا ہے۔''

مجھے مہنگا سنگھ کی شخصیت سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ وہ ایک ذہین شخص تھا۔ سیاسیات، معاشیات اور نفسیات وغیرہ مضامین پر وہ گفتگو نہیں کرسکتا تھا لیکن بحیثیت ایک انسان وہ یقیناً بہت دلچسپ تھا۔ اس کا راکششوں کے مانند ڈیل ڈول، گینڈے کی طرح کھال مرتے والی پھولی ہوئی ہرڑ کی سی آنکھیں، گھنے بالوں سے ڈھکا ہوا سینہ، چھاج کے مانند کان، قدیمی بابلی بادشاہوں کی طرح بٹی ہوئی لمبی داڑھی اور مونچھیں دیکھ کر انسان کو اس بات کا شبہ تک نہ ہوسکتا تھا کہ وہ کوئی مزیدار بات کہہ سکتا ہے یا گدگدی پیدا کرنے والے کسی چٹکلے کو سن کر قہقہہ لگا سکتا ہے۔

چاندنی راتوں میں گاؤں سے باہر عام طور پر نوجوان کبڈی کھیلا کرتے تھے۔ لیکن اندھیری راتوں میں عموماً مہنگا سنگھ کو گھیر لیتے۔ مہنگا سنگھ کو زندگی میں بے شمار دلچسپ واقعات پیش آچکے تھے۔ وہ ان کی سزائیں بھگت چکا تھا اور جو ثابت نہ ہوسکے تھے وہ دنیا نے معاف کردیے تھے۔ اب وہ واگورو نام کا سمرن کرتا تھا یا گاؤں کے نوجوانوں کو کوئی مزیدار قصہ سنا دیتا۔

گاؤں سے تقریباً ایک فرلانگ پر لفٹین کی باغیچی تھی، یعنی لفٹنٹ کا باغ۔ میں نے اس کی وجہ تسمیہ جاننے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ خیر اس باغیچے کے قریب ایک اونچا ٹیلا تھا۔ مہنگا سنگھ رات کا کھانا کھانے کے بعد اس ٹیلے پر جا بیٹھتا اور پریم رس میں ڈوبے ہوئے شبد، اپنے بے ڈھب آواز، لیکن اپنی دانست میں نہایت دردناک لے کے ساتھ پڑھا کرتا۔ کچھ آدمی بھی اس کے قریب آن بیٹھتے۔ داڑھیوں پر ہاتھ پھیر پھیر کر شبدوں کے الفاظ اور معانی کی داد دیتے۔ بعض اوقات پریم رس اور گیان دھیان سے دفعتاً گریز کر کے وہ عورتوں کی باتیں کرنے لگتے۔ ان کے بالوں، آنکھوں، ہونٹوں، گردن اور چھاتیوں سے ہوتے ہوئے گہرائیوں تک اتر جاتے، سب مل جل کر بڑی فحش باتیں کرتے اور جب جی بھر جاتا تو دفعتاً ساری گفتگو کا ایک بہت ہی اعلیٰ اخلاقی نتیجہ نکال لیتے اور پھر سب بڑے گیانیوں کی طرح زندگی کی ناپائداری پر لمبی آہیں بلند کرتے ہوئے اٹھ کر گاؤں کی طرف چل دیتے۔

میرا بھی یہ معمول ہوگیا تھا کہ شام کا کھانا کھایا، اور بابا جی کے ٹیلے کی طرف چل دیتا۔ بابا مہنگا سنگھ آنکھیں موندے، گورو چرنوں میں سیس نوائے یا تو کپڑے کی بنی ہوئی مالا جپتے یا شبد گاتے، جس روز کا اب ذکر کر رہا ہوں، اس روز بھی سب لوگ پریم رس میں رس گلے بنے بیٹھے تھے۔ نہ معلوم عورتوں کا ذکر کیوں اور کہاں سے شروع ہوا، اس روز صنفِ نازک پر نیا الزام لگایا گیا اور مہنگا سنگھ نے پہلے گورو صاحب کے لکھے ہوئے استری چرتر کا حوالہ دیا اور پھر اس کا ذکر ترک کر کے ذاتی

تجربات بیان کرنے لگے......

ہم سب سرک کر ان کے قریب ہو بیٹھے۔

تاروں کی مدھم روشنی میں جب مہنگا سنگھ نے اس نئے مضمون پر گفتگو کرنے کے لیے منہ کھولا تو اس کی آنکھوں میں ایک نئی چمک پیدا ہوگئی۔ اس کی ہوا میں لہراتی ہوئی داڑھی جیسے جھوم جھوم کر اظہار مسرت کرنے لگی۔

"عورتوں کی چالاکی......؟ ...... ہاہا...... مرد خود اپنے آپ کو کتنا ہی عقل مند کیوں نہ سمجھے لیکن عورت کے سامنے اس کی ایک نہیں چلتی۔ اب میں آپ بیتی بتاتا ہوں جو بظاہر اس قدر حیرت انگیز ہے کہ شاید تم لوگوں میں سے بعض کو اس بات کا یقین بھی نہ آئے......"

ہم سب اس کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ غور سے سن رہے تھے۔ اصل بات شروع کرنے سے پہلے اس نے بتایا کہ اس وقت اس کی عمر تیس برس کے لگ بھگ تھی۔ وہ بہت طاقتور شخص تھا۔ گھونسہ مار کر اینٹ توڑ ڈالتا تھا۔ کئی معرکے کے ڈاکے ڈال چکا تھا۔ علاقے بھر کے لوگ تو اس کا نام سن کر تھرتھر کانپتے تھے۔ پولس تک کی جرأت نہ ہوتی تھی کہ......

یہ تمہید کافی لمبی تھی۔ وہ یہ باتیں پہلے بھی اتنی مرتبہ دہرا چکا تھا کہ ہم اسے سن سن کر تنگ آچکے تھے۔ لیکن نہ اسے ٹوکا جاسکتا تھا، نہ اس کی تردید کی جاسکتی تھی، اب بھی لڑنے مرنے پر آمادہ ہوجاتا تھا، آخر وہ اصل قصے کی طرف متوجہ ہوا۔

......جس واقعہ کا میں اب ذکر کرنے والا ہوں' اس سے پہلے کئی روز مال ہاتھ نہ لگا تھا۔ یوں تو واہگوروں کا دیا سب کچھ تھا اور پھر زور بازو سے بھی بہت کچھ کمایا تھا۔ لیکن جسم میں جان تھی، طاقت کا استعمال بھی تو لازم تھا نا...... ہاں بھئی چرن! تم تو تقریباً میرے ہم عمر ہی ہونا؟ تمہیں یاد ہے؟ کیلاں کے گاؤں کے ارد گرد کا علاقہ کس قدر خطرناک سمجھا جاتا تھا......"

"ہاں، مجھے یاد ہے، وہاں بڑے بڑے درختوں کے جھنڈ اور جھاڑیاں دور دور تک چلی گئی تھیں، جنگل ہی جنگل تھا......"

مہنگا سنگھ نے پھر بات شروع کی،" بڑا سنسان علاقہ تھا، وہاں یا تو بھیڑیے رہتے تھے، یا ڈاکوؤں کی کمین گاہیں تھیں، مجھے بھی بعض اوقات وہاں پناہ لینی پڑتی تھی...... ایک مرتبہ کافی عرصے تک وہاں چھپے رہنے کے بعد میں نے اپنے گھر جانے کی ٹھانی— مہینوں سے نہ گھر والوں کی مجھے، اور نہ میری گھر والوں کو کوئی خبر رہی تھی، میں نے دو تین ساتھیوں کو تاکید کردی کہ میں زیادہ سے زیادہ آٹھ دس روز تک لوٹ آؤں گا اور اگر میں اتنے عرصے کے اندر اندر واپس نہ آؤں تو سمجھنا کہ گرفتار ہو گیا ہوں، پھر مجھے جیل سے چھڑانے کی تجویز کر لینا......"

بابا مہنگا سنگھ نے اپنی ٹانگوں کو سہلاتے ہوئے قدرے سکوت کیا......" اپنے گاؤں تک چالیس کوس کا فاصلہ تھا، سوچا رات کو سفر کیا کروں گا، اور دن کو کہیں چھپ رہوں گا۔ جنگل ختم ہوتے ہی پہلا گاؤں "کیلاں" تھا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ میرے ہاتھ میں ایک لمبا لٹھ اور کمر سے ایک ڈیڑھ فٹ کی کرپان لٹکی ہوئی تھی۔ یہ کرپان میں نے خالص لوہے کی بنوائی تھی...... اس وقت مجھے سوائے جانوروں کے اور کسی کا خطرہ نہ تھا، کیلاں کے لوگ چونکہ بڑے خطرناک علاقے میں رہتے تھے۔ اس لیے سردیوں میں تو شام پڑتے ہی گھروں میں گھس بیٹھتے تھے۔ میں مزے سے شبد گنگناتا کھیتوں کے بیچ میں سے ہوتا ہوا چلا جارہا تھا۔ دفعتاً جو میری نظر اٹھی تو ایک بہت عجیب منظر دکھائی دیا...... کیلاں سے کئی کھیت ادھر درختوں کے پیچھے شمشان اور قبرستان ساتھ ساتھ کچھ اس انداز سے بنے ہوئے تھے کہ اگر گاؤں سے ایک طرف دیکھا جائے تو سوائے ان گھنے درختوں کے اور کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا...... دیکھتا کیا ہوں کہ قبرستان میں تیز روشنی ہو رہی ہے پہلے میں نے خیال کیا کہ ممکن ہے شمشان میں کوئی مردہ جلایا گیا ہو، اور آگ ابھی جل رہی ہے لیکن یہ روشنی کچھ اور ہی طرح کی تھی اور پھر لمحہ بہ لمحہ

تیز ہو رہی تھی......''

سب لوگ بلا آنکھیں جھپکائے مہنگا سنگھ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مہنگا سنگھ نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے قصہ جاری رکھا:

''یہ روشنی دیکھ کر میرے دل میں کئی قسم کے خیالات پیدا ہوئے۔ ذرا غور کرنے کی بات ہے کہ ایسی سنسان جگہ، اندھیری رات، شدت کی سردی، ہر طرف خاموشی کا عالم...... اور قبرستان میں بڑھتی ہوئی روشنی، پہلے میں نے سوچا، ہے منا! (اے دل!) تجھے ان باتوں سے کیا لینا، سیدھا راستہ ناپتا چلا جا! تجھے منزل طے کرنی ہے، واہگورو کی باتیں واہگورو ہی جانے۔'' لیکن دل کی تسلی نہ ہوئی، اور میں نے سوچا، دیکھوں تو سہی، آخر معاملہ کیا ہے؟...... لو بھائی! میں نے اپنا راستہ چھوڑ کر قبرستان کا رخ کیا۔ قبرستان مجھ سے کافی فاصلہ پر تھا، جوں جوں میں قریب پہنچ رہا تھا، توں توں روشنی اور صاف نظر آنے لگی۔ قبرستان سے کچھ فاصلہ پر میں رک گیا...... گھنی جھاڑیوں میں نہ صرف آگ کی روشنی صاف صاف دکھائی دے رہی تھی بلکہ وہاں کوئی چیز ہلتی ہوئی دکھائی دی...... پہلے سوچا، شاید میرا وہم ہو، چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا۔ یوں معلوم ہوا جیسے دو سینگ ہل رہے ہوں، میں قدم ناپتا، درختوں کی اوٹ لیتا ہوا کچھ اور قریب پہنچا تو سر سے پاؤں تک بالکل سیاہ گائے دکھائی دی...... آگ کا ایک آدھ شعلہ جھاڑی کے اوپر لپکتا ہوا دکھائی دے جاتا تھا...... وہ سیاہ گائے ویرانے میں تنہا کھڑی ہوئی چڑیل کا روپ معلوم ہوتی تھی۔ میں نے ہمیشہ واہگورو اکال پرکھ کا بھروسہ کیا ہے...... چناں چہ میں واہگورو کا نام لے کر اور آگے بڑھا۔ پھر ٹھٹھک گیا۔ کچھ اس قسم کا شبہ ہو رہا تھا کہ وہاں کوئی اور ہستی بھی ہے رات مکمل طور پر تاریک تھی۔ درختوں کے وہ حصے جہاں آگ کی روشنی نہیں پہنچ رہی تھی۔ بڑے خوف ناک دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے ایک نظر اپنے سر کے اوپر ڈالی۔ ٹہنیوں پر بھی ڈالی، کہ کہیں وہاں کوئی چھپا ہوا نہ بیٹھا ہو......''

ہم لوگ اس کی آواز کی گونج اور الفاظ کے جادو سے بت بنے بیٹھے تھے۔

حاضرین میں سے کسی کے منہ سے تھرتھراتی ہوئی آواز نکلی...... " پھر تم نے کیا دیکھا......؟"

" میں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ ایک درخت کی اوٹ سے دوسرے درخت کی اوٹ تک انتہائی احتیاط کے ساتھ چلتا ہوا میں بالکل قریب پہنچ گیا۔ میں نے زندگی بڑے بڑے ویرانے میں بسر کی ہے۔ کئی عجائبات دیکھنے میں آئے، لیکن جو منظر وہاں دیکھا، وہ مرتے دم تک نہ بھولوں گا...... گائے کے قریب ایک قبر کے پاس بڑا سا چولہا بنا ہوا تھا۔ اس میں آگ جل رہی تھی۔ کچھ برتن پڑے تھے، پانی کا ایک کورا مٹکا...... ان سب چیزوں کے درمیان ایک عورت......"

" عورت......؟" سب کے حلق سے نکلا۔

" ہاں عورت......! بیس اکیس کے قریب ہوگی، اس قدر حسین اور پر شباب کہ زبان بیان نہیں کر سکتی، میں تو اسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ سوچا، نہ معلوم یہ پری ہے سچ مچ کی یا کسی چڑیل نے پری کا روپ دھارا ہے۔ درخت کے تنے کے ساتھ لگا ہوا میں چپ چاپ اسے دیکھتا رہا...... سوچنے کی بات ہے کہ ایسی کالی رات کو، آبادی سے پرے، ویرانے بلکہ قبرستان میں کسی نوجوان اور حسین عورت کی یہ جرأت کیوں کر ہو سکتی تھی، میں نے دل میں کہا کہ دیکھیں، اب یہ کیا کرتی ہے...... اس نے میرے دیکھتے دیکھتے چولھے میں اور لکڑیاں ڈال دیں، آگ بھبھک اٹھی، پھر اس نے سر سے دوپٹہ اتار دیا، اس کے سیاہ بال دکھائی دینے لگے، اس نے مینڈھیوں کو کھولا اور پھر ساری چوٹی کھول کر بال بکھرا دیئے اور روئی کی صدری کے بٹن کھولنے لگی، صدری کے نیچے ایک مخملی واسکٹ پہن رکھی تھی، اس کے بٹن کھول کر اسے بھی اتار دیا، اور جب اس نے قمیص کے بٹن بھی کھولنے شروع کیے تو میرا دل دھڑکنے لگا...... باگورو...... باگورو!!...... بٹن کھولنے کے بعد الٹا کر قمیص کو بھی اتار دیا، اب اس کے اوپر والے حصے پر ایک تار نہیں تھا۔ آپ لوگ میری حیرانی کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں، اس وقت مجھے بھی ارد گرد کی کچھ خبر نہ

رہی، دل دھڑک رہا تھا، نہ معلوم یہ عورت کیا کرنے کو ہے میں ایک بچے کی سی حیرانی کے ساتھ اس کی طرف دیکھتا رہا اور اب جو اس نے اپنی شلوار کا ازار بند کھینچا، تو میں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا...... چند لمحوں تک میری حالت کچھ عجیب سی ہوگئی۔ میں نے سمجھا کہ یہاں ضرور بھوتوں اور چڑیلوں کا مسکن ہے، اتنے میں پانی کے گرنے کی آوازیں آنے لگیں، میں نے جھجکتے ہوئے اس طرف نظر ڈالی تو عورت نے پانی کا مٹکا کالی گائے کے سر پر سینگوں میں پھنسا کر رکھ دیا تھا۔ ایک ہاتھ سے اس نے مٹکا تھام رکھا تھا، دوسرے سے لوٹے بھر بھر کر پانی اپنے بدن پر ڈال رہی تھی۔ نہا کر اس نے ایک چادر سے بدن پونچھا، بغیر کپڑے پہنے اس نے ایک رنگین ٹوکری میں سے زیور نکال کر پہننے شروع کر دیئے۔ انگوٹھیاں، گوکھڑو، چونک، تو تیڑیاں، کنٹھا، بازو بند، بالیاں غرض وہ سر سے پاؤں تک سونے سے زرد ہوگئی......"

ہم میں سے ایک نے کہا۔ "ایسی سردی میں اس نے ...... کپڑے نہیں پہنے—"

"نہیں...... یہی تو حیرانی کی بات ہے، اب اس نے ایک چھوٹی سی رکابی سے کپڑا سرکایا اس میں گندھا ہوا آٹا تھا، چولھے پر توا رکھا، اور آٹے کو پراٹھے کے انداز میں لپیٹ کر توے پر ڈال دیا اور اسے گھی میں تلنے لگی......"

اب میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے، میں نے سنا تھا کہ پریوں کی کمر کا پچھلا حصہ کھوکھلا ہوتا ہے یعنی ریڑھ کی ہڈی نہیں ہوتی، دوسرے بھوتوں کا سایہ نہیں ہوتا اور اس عورت کا سایہ صاف نظر آرہا تھا اور پھر ہر چیز اس قدر واضح تھی کہ میں نے سمجھ لیا دال میں کچھ کالا ہے۔ ایک تو بھوت چڑیلوں پر میرا یقین نہیں تھا، لیکن اس عورت کا واقعہ اس قدر عجیب تھا کہ یقین نہ آتا تھا کہ ایک کم سن اور حسین عورت ایسی سنسان جگہ پر آنے کی جرأت کرسکتی ہے، خیر! اب میں نے قدم بڑھایا اور اس سے چند قدم پرے کھڑے ہوئی گائے کی پیٹھ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا...... گائے کے جسم کو چھو کر میرا

یقین پختہ ہوگیا کہ یہ کوئی غیر معمولی ہستی نہیں ہے، اب میں کھڑا ہوا ہی تھا کہ اس عورت کی نظر میرے پاؤں پر پڑی۔ اور پھر دفعتاً اس نے نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اب دفعتاً اس کی صورت مسخ ہوگئی۔ باچھیں چر گئیں، دانت چمکنے لگے، نتھنے پھیل گئے اور آنکھیں جیسے ابل پڑیں...... ہاتھوں کی انگلیوں میں تشنج کی کیفیت پیدا ہوئی اور وہ بال پھیلائے ''کلیجہ کھالوں گی، کلیجہ کھا لوں گی'' کہتی ہوئی میری طرف جھپٹی۔ اس کی آواز سن کر مجھے تسلی ہوگئی کہ یہ کوئی عورت ہے، چڑیل نہیں، جونہی وہ میرے قریب پہنچی، میں نے مسکرا کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ وہ وحشیوں، کی طرح میرے ہاتھ کاٹنے لگی۔ میں نے زور سے اسے پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔ وہ گرتے ہی پھر مجھ سے گتھم گتھا ہوگئی۔ اس عورت میں بلا کی طاقت تھی، لیکن ظاہر تھا ہم دونوں کا کوئی مقابلہ ہی نہ ہوسکتا تھا۔ میں نے تنگ آکر اس کے بالوں کو خوب جھنجھوڑا اور اس کی پیٹھ پر دو تین دھپ مارے لیکن صرف اتنے زور سے، جو اس کی قوت برداشت سے باہر نہ ہوں، پھر میں نے اس کی نازک گردن کو اپنی لمبی انگلیوں کی گرفت میں لے کر کہا۔ دیکھو! اگر ایسی چھچھوری حرکتیں کرو گی، تو میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گا...... وہ بیچاری تھک کر ہانپ رہی تھی، میں نے اسے پرے دھکیل کر کہا۔ ''ذرا وہاں کھڑی ہو کر بات کرو مجھ سے......''

اب اسے بھی اس بات کا یقین ہوگیا کہ میں اس کی حقیقت سمجھ چکا ہوں اس لیے زیادہ حیل و حجت فضول تھی، دفعتاً اس نے چادر اٹھائی اور اپنے جسم پر لپیٹ لی، اوراس کی آنکھیں نیچے جھک گئیں، میں نے اصل مقصد جاننے کی کوشش کی، وہ زمین کی طرف دیکھتی رہی اور جھجک جھجک کر باتیں کرتی رہی۔ اب اسے مجھ سے ڈر معلوم ہوتا تھا، اس کی باتوں سے ظاہر ہوا کہ چار برس پہلے اس کی شادی ایک بڑے ساہوکار سے ہوئی تھی، لیکن اب تک وہ اولاد کے لیے ترس رہی تھی اور اس کا شوہر دوسری شادی پر تلا ہوا تھا۔ ادھر یہ پریشان تھی۔ آخر ایک بوڑھی عورت نے اسے یہ نسخہ بتایا تھا کہ کالی گائے

کے سر پہ پانی کا مٹکا رکھ کر قبرستان میں اشنان کر، اور وہیں سے ایک پراٹھا پکا کر لا، اور کسی اولاد والی عورت کو کھلا دے، تو اس کے بچے مرجائیں گے، اور تیرے گھر اولاد ہوگی...... میں نے یہ سنا تو قہقہہ مار کر ہنسا، اس وقت گہنوں سے لدی ہوئی وہ عورت آگ کی روشنی میں بہت حسین دکھائی دے رہی تھی، میں نے آگے بڑھ کر اس کے رخسار کو چھوا۔ وہ فوراً پیچھے ہٹ گئی۔ کیسی نرم جلد تھی اس کے چہرے کی، اور کس قدر بھولی صورت تھی اس کی—!

اس نے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں ایک شریف گھرانے کی عورت ہوں!"

میں نے ہنس کر کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تو شریف عورت ہے، لیکن اے نیک بی بی! میں بھی بھلے خاندان کا آدمی ہوں، پرائی استری کی طرف بری نیت سے دیکھنا پاپ سمجھتا ہوں، گورو کا دیا کھاتا ہوں، انتہائی مجبوری کے سوا کبھی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ اس لیے تو خاطر جمع رکھ...... لیکن یہ بات سن لے، کہ تو نے جو طریقہ اولاد حاصل کرنے کا اختیار کیا ہے، یہ بہت بڑا پاپ ہے۔ کسی کا برا چاہنا بھلے آدمی کا کام نہیں ہے، بڑے بڑے رشیوں، گوروؤں، نبیوں، غرض کسی نے بھی اولاد حاصل کرنے کا یہ طریقہ نہیں بتایا، جو تو اختیار کر رہی ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے کچھ داڑھی کو سنوارا، کچھ پگڑی کو درست کیا، انگوچھے سے منہ اور بازوؤں کی گرد پونچھی...... " اور بھئی میں خاصا کڑیل جوان تھا...... وہ مسکرا دی—"

بابا مہنگا سنگھ خاموش ہوگئے۔ ہم نے کہا— "بابا جی! اس کے بعد تم نے کبھی ملنے کی کوشش کی—؟"

" ہاں، لیکن پھر ملاقات نہیں ہوئی...... معلوم ہوتا ہے کہ پھر اسے میری کوئی ضرورت ہی نہیں رہی ہوگی...... اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ مجھ سے خفا ہوگئی ہو؟"

" کیا تم نے کوئی خفگی کی بات کی تھی—؟"

"نہیں، اسے میری کوئی حرکت نا پسند نہیں تھی، البتہ جب وہ جانے لگی، تو میں نے اس کا کنٹھا پکڑ لیا، وہ حیران سی رہ گئی۔ بولی— "تمہارا مطلب" میں نے جواب دیا کہ اس سے پہلے تو میرا کوئی مطلب ہی نہیں تھا، میرا اصل مطلب یہی ہے، اس نے کہا کہ اکیلی جان کر میرے زیوروں پر ہاتھ ڈال رہے ہو۔ میں نے جواب دیا،" چلو گاؤں میں جتنے آدمیوں کے سامنے کہو، تمہارے زیورات اتار لوں۔" اسے میری یہ تجویز پسند نہیں آئی، چناں چہ اس نے سارے زیورات میرے حوالے کر دیے......"

یہ کہہ کر بابا جی نے سر جھکا لیا، اور پھر جیسے گم ہو گئے۔ ایک بزرگ بولے۔" دیکھا! ایسی پاجی ہوتی ہیں عورتیں......"

لیجئے، میں دل میں سوچنے لگا۔ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ، اس قصے کا کیا ہی شان دار اخلاقی نتیجہ نکالا گیا ہے، سب لوگ آپس میں عورتوں کی بدمعاشی اور ان کی چالاکی پر رائے زنی کرنے لگے، لیکن بابا جی آنکھیں نیم وا کیے چپ چاپ بیٹھے رہے۔

"واگورو! واگورو!!" ان کے لب ہلے۔

میں نے انہیں افسردہ دیکھ کر پوچھا— "بابا جی! آپ نے جو اس عورت کے زیورات اتار لیے۔ غالباً آپ کو اسی بات کا دکھ ہو رہا ہے اس وقت—!"

بابا جی کے بھاری پپوٹے ہلے، اور انہوں نے میری طرف پریم بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے سرد آہ کھینچی اور بولے— "نہیں، مجھے اس کا دکھ نہیں، لیکن دکھ اس بات کا ہے کہ پچاس برس گزرنے کو آئے۔ واگورو اکال پرکھ نے مجھے ایسا موقع پھر کبھی نہیں بخشا—"

یہ افسانہ افسانوی مجموعے 'پہلا پتھر' میں شامل ہے۔

کالے کوس

چھوٹا سا قافلہ، جو تین عورتوں اور ایک مرد پر مشتمل تھا، دم لینے کے لیے کوئیں کے قریب ڈیرا ڈالے تھا۔

وہ لوگ مسلمان تھے — اور وہ دن اس سرزمین کو آزادی ملنے کے دن تھے جسے آج کل پاکستان اور ہندوستان کہتے ہیں۔

مرد، 32، یا 33 برس کا گرانڈیل شخص تھا۔ سر پر چھوٹی سی پگڑی کے دوچار بل...... گلے میں کرتا، اس کے نیچے چوڑی نیلی دھاری کا تہبند — ناک نقشے میں کوئی عیب نہیں تھا۔ داڑھی استرے کی یورش سے کئی دنوں سے بے نیاز تھی۔ مونچھیں خوب بڑی بڑی، کبوتروں کے پروں کی مانند، نیچے کو گری ہوئیں۔ آنکھیں، متجسس اور تیز جن میں اب تھکن کے آثار ہویدا تھے، جسم کے پھیلے ہوئے ڈھانچے، لمبی لمبی بانہوں، اور طویل ٹانگوں کے باوجود وہ موٹا نہیں تھا۔ اس کے بدن کی پرورش میں ڈنڈ، بیٹھک، اور باداموں کا ہاتھ نہیں بلکہ اس کے جسم کے ریشے ریشے کی پرورش گیہوں یا مکی کے آٹے اور ساگ بھات پر ہوئی تھی۔ اس کا نام غلام محمد عرف گاماں تھا — وہ اچھا آدمی نہیں تھا — اس میں ایک ہی اچھی بات تھی، وہ یہ کہ اسے نیک ہونے کا دعویٰ نہیں تھا۔ یہ چیز اس کے چہرے ہی سے ظاہر تھی۔

تین عورتیں — ایک بوڑھی، ایک جوان اور ایک نوخیز، بالترتیب اس کی ماں، بیوی اور بہن تھیں۔

بوڑھی پانچوں نمازیں پڑھ پڑھ کر سارے ہندوؤں خصوصاً سکھوں کے نیست و نابود ہوجانے کی دعائیں مانگا کرتی تھی سوائے پھلور سنگھ کے — پھلور سنگھ عرف پھلورا اس کے بیٹے کا دوست تھا۔

بیوی کی عمر پچیس برس کے قریب تھی۔ سیدھے سادے خد و خال — شادی کو آٹھ برس گزر چکے تھے لیکن ایک بلونگا تک پیدا نہیں ہوا تھا۔ گامے کے دوست پر معنی انداز سے اسے کہنیوں سے ٹھوکے دے کر پوچھتے۔ ''کہو استاد! آخر ماجرا کیا ہے؟'' — اس پر گاماں اچھا انسان نہ ہونے کے باوجود لمحہ بھر کے لیے آسمان کی جانب دیکھتا اور کہتا— ''جو اللہ کی مرضی!''

''ہاں بھئی آڑے وقت میں اللہ کے سوا اور کون کام آتا ہے!''

اس کی بہن عاشاں حسین اور نازک اندام تھی۔ اس اعتبار سے وہ گامے سے بہت مختلف تھی— اس کی بابت گامے نے اڑتی ہوئی خبر سنی تھی کہ وہ گاؤں کے ایک چھوکرے اللہ دتے کو میٹھی نظروں سے دیکھتی ہے اور اللہ دتہ بھی اس کے فراق میں سرد آہیں بھرتا ہے— گاما نے تہیہ کر لیا تھا کہ جب بھی وہ انہیں اکٹھا دیکھ پائے گا تو گنڈاسے سے ان کے سر اڑا دے گا، لیکن باوجود کوشش کے گامے کو اس افواہ کی صداقت کا ثبوت نہیں مل سکا۔

چار ناخوش انسانوں کا یہ خانماں برباد قافلہ پیادہ پا پاکستان کو جا رہا تھا۔

ان کی کہانی دوسرے لاکھوں مسلمانوں کی کہانی تھی جو مشرقی پنجاب سے مغربی پنجاب کو جانے کے لیے مجبور کیے گئے تھے۔

گاماں— لٹیرا بھی تھا اور قاتل بھی۔ بدمعاش بھی تھا اور ڈاکو بھی— لیکن ان سب برائیوں کے باوجود وہ کسان تھا...... ہل چلانا اور بیج بونا اس کا آبائی پیشہ تھا۔

ملک کی تقسیم کے بعد دفعتاً ساری خدائی ان کی دشمن ہوگئی۔ گھر کی چار دیواری تک انہیں بھینچ کر مار ڈالنے کی دھمکیاں دینے لگی۔ وہ دھرتی جو پہلے بجائے ماں کے تھی،

اب گرم ہو کر اس قدر تپ گئی تھی کہ اس پر اس کے بچوں کا چلنا پھرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ وہ زمین جو پہلے ان کا پسینہ جذب کر کے سونا اگلتی تھی، اب ان کا خون پی کر بھی مطمئن نہیں ہوتی تھی، چناں چہ ایک روز گامے نے گھر آ کر کہا۔ ''اب ہمیں جانا ہی ہوگا۔''

سامان؟

اس پر وہ تلخ ہنسی ہنسا اور اس نے تینوں عورتوں کو بکریوں کے مانند گھر سے باہر ہانک دیا۔

اس کے بعد خونی نظارے، آگ، دہشت، بھوک اور پیاس— مسلسل— پھلور سنگھ، گامے کا دوست تھا۔ برے کاموں میں دونوں ساتھی رہے تھے۔ مل کر انہوں نے اچھا کام کبھی نہیں کیا تھا۔ پھلور سنگھ نے مشورہ دیا کہ ان کا کسی بڑے قافلے کے ہمراہ جانا خطرے سے خالی نہیں۔ چناں چہ گامے نے سب کچھ پھلورے پر چھوڑ دیا اور وہ راتوں رات چوری چھپے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک پہنچا دیتا۔ دن کے وقت وہ لوگ آرام کرتے اور رات ہوتے ہی پھر سفر شروع کر دیتے۔

ایک رات پھلورے کے آنے میں کچھ دیر ہو گئی تو مالک مکان جو ڈرپوک تھا، ان سے کہنے لگا، بھئی! آج رات حملے کا سخت خطرہ ہے۔ ان کا وہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔ ورنہ وہ خود بھی جان سے ہاتھ دھوئیں گے اور اسے بھی پھنسا دیں گے۔

گاؤں سے باہر بھی جان کا خطرہ کم نہیں تھا لیکن مجبوری کے عالم میں گاماں اللہ کا نام لے کر، تینوں عورتوں سمیت وہاں سے چل کھڑا ہوا۔

ہر چند گاماں مضبوط انسان تھا، اسے اپنے زور بازو پر بھروسہ بھی تھا لیکن مسلح ہجوم کا مقابلہ کرنا اس کی قوت سے باہر تھا اور پھر عورتوں کا ساتھ!

انہوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ دن کے وقت کھیتوں، جھاڑیوں یا کسی اندھے کنوئیں میں چھپ جاتے اور رات بھیگ جانے پر چل کھڑے ہوتے۔

انہیں پھلور سنگھ سے جدا ہوئے دو راتیں گزر چکی تھیں اور تیسری گزر رہی تھی۔

رات بھیگ چکی تھی لیکن انہوں نے ابھی سفر جاری نہیں کیا تھا۔

چاندنی رات تھی لیکن آسمان پر ہلکا سا غبار چھایا ہوا تھا اس لیے چاندنی بہت اداس دکھائی دے رہی تھی۔

اس وقت وہ ایک ایسے کنوئیں کے پاس بیٹھے تھے جوایک مدت سے ویران پڑا تھا۔ کنوئیں کی مینڈھ گر چکی تھی۔ دو کچی دیواریں اس امر کی گواہ تھیں کہ کبھی یہاں بھی رہٹ کی روں روں سنائی دیتی ہوگی۔ شاید الغوزوں کی تانیں بھی اڑتی ہوں گی اور چنچل کنواریوں کے نقرئی قہقہے بھی نضا میں گونجتے ہوں......

یہ مقام سطح زمین سے قدرے بلند تھا۔ گاماں سر اٹھا کر دور دور تک نگاہ دوڑا رہا تھا۔ وہ اندازاً مغرب کی جانب بڑھ رہے تھے، لیکن انہیں اس کا کوئی علم نہیں تھا کہ اس وقت وہ کہاں ہیں اور پاکستان کی حدود سے کتنی دور ہیں۔

وہ قریب قریب نڈھال ہو چکے تھے۔ کاش بھلورے کا ساتھ نہ چھوٹتا تو شاید اب تک وہ منزل مقصود تک پہنچ گئے ہوتے۔

بوڑھی ماں کے ڈھیلے ڈھالے چہرے میں جھانکتی ہوئی بے رونق آنکھوں سے حیرت اور درماندگی کا اظہار ہوتا تھا۔ اپنی طویل زندگی میں اس نے اس قسم کے واقعات دیکھے نہ سنے تھے...... بیوی، بھوک، مسلسل پریشانی اور عزت و آبرو کے خوف سے بالکل نڈھال ہو چکی تھی۔ اس کا سر ڈھلک کر دیوار سے ٹک گیا تھا...... عاشاں، وہ نسبتاً تازہ دم تھی۔ ایک تو خیر عمر کا تقاضا تھا اور پھر شاید اسے خطرے کی اہمیت اور نوعیت کا پورا پورا احساس بھی نہیں تھا۔ اس کے بوجھل بالوں نے جھک کر اس کے چہرے کے بہت بڑے حصے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ البتہ اس کے نازک لب، ترشی ہوئی حسین ناک اور گھنی بھوئیں صاف دکھائی دے رہی تھیں...... پھیکی چاندنی نے اس کی صورت کو خوابناک بنا دیا تھا۔

بیٹھے بیٹھے گاما سوچنے لگا۔ ممکن ہے، عاشاں اور اللہ دتے والی بات درست ہو...... اب اس قسم کے خیال سے وہ ناخوش نہیں ہوا...... ننھی منھی بھولی بھالی فاختہ سی

بہن کبھی کبھار اچٹتی ہوئی نظروں سے بھائی کی جانب دیکھ لیتی اور پھر آنکھیں جھکا لیتی..... وہ بچپن ہی سے بھائی سے سخت ڈرتی تھی تاہم وہ اکثر بھائی کی سلامتی کے پیارے پیارے سوز بھرے گیت گایا کرتی۔

دفعتاً ہوا چلنے لگی۔ پیپل کی پتیوں نے تالیاں بجا بجا کر گامے کو چونکا دیا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوگیا اور بوجھل آواز میں بولا۔" اب ہمیں چلنا چاہئے۔"

عورتیں کچھ تامل کے بعد گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان میں سے کسی کو بھی پتہ نہیں تھا کہ انہیں کدھر جانا ہے۔ سب لوگ بوجھل قدموں سے ایک سمت کو چل دیئے۔

آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ کنوئیں سے کچھ دور ہی گئے ہوں گے کہ گامے کے قدم رک گئے۔ عورتیں بھی رک گئیں۔

زمین ناہموار تھی۔ دور دور تک آبادی کا کوئی نشان نہیں ملتا تھا اور پھر آبادی سے انہیں کیا سروکار؟ ان کے جسم تھک کر چور ہو چکے تھے۔ بدن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ مارے بھوک کے انہیں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کلیجہ کسی بھاری پتھر کے نیچے دب گیا ہو۔

گاماں کھوئی کھوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ قریب ہی اینٹوں کا بھٹہ تھا وہ بھی سنسان پڑا تھا۔ معلوم ہوتا تھا مدت سے اسے یوں ہی چھوڑ دیا گیا ہے..... حد نگاہ تک کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ ان کے حق میں یہ بات اچھی تھی، لیکن تکلیف دہ بات یہ تھی کہ منزل مقصود کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ ابھی غالباً انہیں اَن گنت کوسوں کا فاصلہ طے کرنا پڑے گا۔ اَن گنت کوس! اس کے ذہن میں الجھن سی پیدا ہونے لگی۔ اس نے گھوم کر عورتوں کی جانب دیکھا۔ انہیں دیکھ کر اسے بڑا رحم آیا۔ یہ معصوم، بے گناہ، سادہ لوح صورتیں!

پھر اس نے کھیت کی مینڈھ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔" آؤ تھوڑی دیر آرام کرلیں۔"

وہ سب ایک لفظ تک کہے بغیر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے اتنا بھی تو نہیں کہا کہ ابھی

تو ہم دو فرلانگ بھی نہیں چلیں، آرام کی کیا ضرورت ہے۔

کھیتوں کے سلسلے پھیلتے ہوئے افق میں گم ہو رہے تھے، جہاں آسمان تپتی ہوئی زمین کے لب چومتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس نے ہر جانب بار بار نظر دوڑائی اور پھر زیرِ لب بڑبڑایا۔ ''نہ معلوم پاکستان کہاں ہے۔''

بوڑھی ماں نے آسمان کی جانب نظر اٹھا کر کہا۔ '' اللہ! ہمیں ملت کی سرزمین تک جلد پہنچا دے۔''

وہ عفت مآب عورتیں اپنی آبرو کے لیے فکر مند ہو رہی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ ایک مرتبہ وہ آبرو مندی کے ساتھ پاکستان کی سرزمین تک پہنچ جائیں۔ خواہ وہاں پہنچتے ہی ان کو موت آ جائے۔ انہیں اپنی جانیں ایسی پیاری نہیں تھیں۔

گامے نے تاروں سے نظر ہٹا کر دونوں ہاتھوں میں کھیت کی بھربھری مٹی کو اٹھایا اور اسے بڑے انہماک سے دیکھنے لگا۔ اس نے اسے دبا کر اس کے لمس کو محسوس کیا۔ اس نے ہوا کو سونگھا۔ طول و عریض جال کے مانند پھیلی ہوئی کھیتوں کی مینڈھوں پر نگاہ دوڑائی جو ایک دوسری کو کاٹتی چھانٹتی افق تک پھیل گئی تھیں...... لیکن گامے کی نگاہیں پاکستان کی زمین، پاکستان کی مٹی، پاکستان کے کھیتوں اور پاکستان کی جھاڑیوں کی متلاشی تھیں۔

فضا مغموم تھی لیکن وہاں اس قدر سکون اور امن تھا کہ ایک مرتبہ تو ان عورتوں کو بھی یقین سا ہونے لگا کہ کالی کملی والا ضرور انہیں با عزت تمام منزلِ مقصود تک......

معاً ایک جھٹکے ساتھ گاماں چوکنا ہو گیا۔ اس نے مضبوط مچھلیوں والا بازو حفاظت کے انداز سے عورتوں کے آگے پھیلا دیا۔ دوسرا ہاتھ چشم زدن میں چھری تک پہنچ گیا۔ اس کے طاقتور بازوؤں کے پٹھے پھڑپھڑانے لگے۔ اس کی متجسس آنکھیں پچھلے کی جانب ایک نقطے پر جم گئیں۔

آخر ہے کیا؟ ...... لیکن یہ سوال عورتوں کے لبوں تک نہیں آ سکا۔

اب گاما عظیم الجثہ اصیل مرغ کے مانند بازو پھیلائے، قدم زمین میں گاڑ گاڑ کر آگے بڑھتے ہوئے دھیرے سے بولا۔'' اس بھٹے کے پیچھے ضرور آدمی چھپے بیٹھے ہیں۔''

انھیں بھی ایک شخص کی جھلک دکھائی دی۔ عورتوں نے سوچا کہ اب اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کی کوئی سبیل نہیں ہو سکتی۔

چند لمحوں بعد ٹوٹی پھوٹی اینٹوں اور مٹی کے ٹیلوں کے پیچھے سے ایک آدمی نمودار ہوا...... وہ سکھ تھا۔

وہ تن تنہا آگے بڑھنے لگا۔ وہ بھی گامے کے مانند لمبا تڑنگا شخص تھا۔ حرکات و سکنات سے وہ بھی شریف انسان دکھائی نہیں دیتا تھا...... اس کے پیچھے ...... اس کے پیچھے اور کوئی نہیں تھا۔ شاید اس کے ساتھی بھٹے کے پیچھے چھپ بیٹھے تھے۔

وہ قدم بہ قدم آگے بڑھ رہا تھا۔

گاماں رک گیا۔ دھندلی روشنی میں وہ سایہ قریب سے قریب تر آگیا یہاں تک کہ گامے کے اعصاب کا تناؤ نقطۂ عروج تک پہنچ کر دفعتاً صفر پر آگیا۔ غالباً...... نہیں یقیناً...... نو وارد پھلورا تھا۔

اور پھر نسبتاً بلند نعروں سے انھوں نے ایک دوسرے کا استقبال کیا۔

آتے ہی پھلورے نے پہلے عورتوں کا جائزہ لیا۔ سب کو صحیح سلامت پا کر بولا۔

''شکر ہے! شکر ہے!!''

گامے نے مسکرا کر کہا۔'' ہم سب سلامت ہیں۔''

'' لیکن تم لوگ تنہا کیوں چلے آئے تھے۔ میرا انتظار کیوں نہیں کیا تم نے......''

گامے نے سارا قصہ کہہ سنایا۔

اس پر پھلورے نے غل مچا کر کہا۔'' یہ تو تمھیں گھر سے نکالنے والے کی انتہائی حماقت تھی اور تمہاری بھی بے وقوفی تھی۔ اُفوہ! وہاں پہنچ کر میں بہت پریشان تھا۔ یہ درست تھا کہ کچھ خطرہ پیدا ہو چلا تھا، لیکن تمھیں باسانی چھپایا جا سکتا تھا۔ اس

دن سے تمہاری تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ یہی فکر تھی کہ کہیں فسادیوں کے ہتھے نہ چڑھ جائیں۔"

ماں بولی۔" بیٹا! اللہ کے فضل سے ہمارا بال تک بے کار نہیں ہوا، لیکن ہمارے یہ دن تو بہت ہی مصیبت میں کٹے ہیں۔ اس میں تو یہ امید بھی نہیں رہی تھی کہ تم ہمیں دوبارہ ملو گے......"

"واہ جی واہ" چھلورے نے اور شور مچا کر کہا۔" بھلا تمہارے دل میں اس قسم کے خیالات پیدا ہی کیوں ہوئے۔ دیکھو! تمہارے پیروں کے نشانات دیکھ کر یہاں تک آن پہنچا ہوں۔"

فضا میں دونوں غیر شریف مردوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ اداس چاندنی رات میں چہل پہل نظر آنے لگی۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ عورتوں نے بڑے اطمینان کا سانس لیا۔ جیسے اب ان کی مدد کو پوری فوج پہنچ گئی ہو...... چھلورا جو اس بڑھیا کے ہاتھوں میں پل کر جوان ہوا باتیں کیے جارہا تھا۔

ادھر اُدھر کی باتیں ہوچکیں تو گامے نے کہا۔" یارا ہم تو اٹکل پچو چلے آئے ہیں۔ نہ جانے کہاں سے کہاں نکل آئے ہیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا......"

یہ کہہ کر وہ خود ہی رُک گیا اور آنکھیں سکیڑ کر دور دور تک نگاہیں دوڑانے لگا کہ شاید کہیں پاکستان کی سرزمین دکھائی دے۔

اس پر چھلورے نے گامے کو ایک بازو میں سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اوئے گامیاں! اب تو تم پاکستان پہنچ چکے ہو۔ تم کیا سمجھے بیٹھے تھے...... کہ وہاں پہنچنے کے لیے دریا پہاڑ پھاندنے پڑیں گے؟"

گاماں ہکا بکا رہ گیا۔ ہکلا کر بولا" سچ؟...... کہاں ہے پاکستان؟"

یہ کہہ کر وہ پھر آنکھیں سکیڑ کر افق کی جانب دیکھنے لگا۔

عورتوں کے لبوں پر بھی مسکراہٹ کی لہریں دوڑنے لگیں۔

پھلورے نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔" وہ رہے پاکستان کے کھیت۔"
سب لوگ پھلورے کے ساتھ ساتھ تیز تیز قدم اٹھا کر چلنے لگے۔ بہ مشکل ایک فرلانگ دور پہنچ کر پھلورا رک گیا۔ پھر ہاتھ سے اشارہ کر کے بولا۔" لو اب یہاں سے پاکستان کے کھیت شروع ہوجاتے ہیں۔تم سیدھے چلے جاؤ۔ کہیں پولس یا فوج کی چوکی تک پہنچ جاؤ گے یا کسی گاؤں میں جا پہنچو گے...... اب تمہیں کوئی خطرہ نہیں......"
عورتوں نے جنگلی چکوریوں کی طرح اپنی رفتار تیز کردی۔ گاماں دو کھیت تو تیر کی سی تیزی کے ساتھ پار کر گیا اور پھر رکا۔ تینوں عورتیں لپکتی ہوئی اس کے پیچھے چلی آرہی تھیں۔ تیز چلنے کے باعث وہ ہانپنے لگی تھیں۔
گامے کی باچھوں میں سے ہنسی پھوٹی پڑتی تھی۔ گھوم کر کہنے لگا۔" اماں! ہم پاکستان پہنچ گئے ہیں۔"
معصوم عورتوں نے رک کر نظریں اِدھر اُدھر دوڑائیں اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔
گامے نے قدرے توقف کے بعد جھک کر دونوں ہاتھوں میں کھیت کی بھربھری مٹی بھری اور اسے اپنے چہرے کے قریب لے آیا۔ چندلمحوں تک اسے غور سے دیکھتا رہا۔ دبا کر اس کے لمس کو محسوس کیا، ہوا کو سونگھا، پھر سر گھما کر طویل و عریض جال کی مانند پھیلی ہوئی کھیتوں کی مینڈھوں پر نگاہ دوڑائی جو ایک دوسرے کو کاٹتی چھانٹتی افق تک چلی گئی تھیں......
اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی کے آثار پیدا ہونے لگے۔
پھر اسے احساس ہوا کہ پھلورا اس کے ساتھ نہیں ہے— پھلورا دو کھیت پرے دھندلی چاندنی میں اڑیل ٹٹو کی طرح زمین پر پاؤں جمائے کھڑا تھا۔
چندلمحوں تک وہ سب چپ چاپ اس کی جانب دیکھتے رہے۔
بلند و بالا پھلور سنگھ کی ڈھیلی ڈھالی پگڑی کے شملے ہوا میں لہرا رہے تھے اور اس

کی طویل لاٹھی کی برچھی شام کے داہنے کان کی لو کو چوم رہی تھی۔

عمر رسیدہ ماں نے پھلورے کی طرف دیکھا اور پھر پس منظر میں چھپتے ہوئے ستاروں پر نظر دوڑا کر دل میں کہنے لگی۔ میں پانچوں وقت نماز کے بعد اللہ سے اس شخص کے حق میں دعا مانگا کروں گی۔

سادہ لوح عورت یہ بھول گئی کہ کیا اس شخص کے حق میں دعا مانگنے پر شانِ کریمی سب کے گناہ معاف کر دے گی؟

الوداع کہنے کے لیے گاماں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا اپنے دوست کی جانب بڑھا ــــ اس کے پاؤں من من کے ہو رہے تھے ــــ وہ جانتا تھا کہ پھلورا دو کھیت پرے کیوں رک گیا ہے۔

جب دونوں قریب قریب کھڑے ہوئے تو قد و قامت اور ڈیل ڈول میں دونوں برابر تھے۔

پھلورے کے پُر خشونت چہرے پر بھدی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی...... جیسے وہ کہہ رہا ہو۔ "گاماں! تم سرزمینِ پاکستان سے مجھے ملنے کے لیے واپس آئے ہو۔"

گاماں نے اپنے بلند قد کو اور بھی بلند کیا اور ایک مرتبہ پھر اپنے سامنے کھڑے ہوئے کڑیل کسان سے آنکھیں ملائیں۔ اس کی گھنی مونچھیں متحرک ہوئیں۔ اس نے پھلورے کا چوڑا چکلا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر...... جیسے اثبات میں سر ہلاتے اس نے بھرپور مردانہ آواز میں جواب دیا۔

"آہو پھلوریا!"

یہ افسانہ افسانوی مجموعہ 'پہلا پتھر' میں شامل ہے۔

لمحے

سوم کا دن تھا۔

یوں تو میں اپنے دوستوں کی بہت قدر کرتا ہوں لیکن کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ دوستوں کی صورت تک نہ دکھائی دے اور میں محض اپنے لیے ہی ہو کر رہ جاؤں۔ میرے دوستوں کی تعداد بہت کم ہے اس لیے مجھے ایسے دن بھی میسر آجاتے ہیں۔

جس روز کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ وہ اسی قسم کا دن تھا، صبح کا وقت تھا، پیش تر اس کے کہ کوئی دوست میرے مکان پر پہنچ کر "اماکانت! اماکانت!!" کے نعرے لگاتا میں چائے سے فارغ ہو کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

نہ بیوی، نہ بچے، نہ ملازمت، نہ کاروبار، نہ خوشی نہ غمی، عجب رندانہ کیفیت میں زندگی بسر ہو رہی تھی۔ میری بے کاری سے گھر والوں کی ناخوشی کے باعث دل پر اداسی چھائی رہتی تھی۔ کوئی ذمہ داری نہ ہونے کی وجہ سے دماغ ہلکا رہتا تھا۔ اپنی بیوی نہ ہونے کے سبب سے ذہن پر رومانیت کا تسلط تھا۔

بس اسٹینڈ پر پہنچ کر دیکھا کہ کناٹ پلیس جانے کے لیے بس تیار کھڑی ہے۔ اندر اکا دکا مسافر بیٹھے ہیں، میں نے فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر جیب میں سے 'کیملو' کی ڈبیا نکالی اور بڑے اطمینان سے ایک سگریٹ کو سہلاتا رہا، پھر اسے ہونٹوں میں دبایا

اور سلگا کر طویل کش لیا۔ بالآخر کوٹ کے کالر درست کرتا ہوا بس کے اندر داخل ہوگیا۔
آٹھ بجے تھے۔ بھلا سردی کے موسم میں کسی کو کیا پڑی تھی کہ گھر کی گرم فضا سے نکل کر باہر کو اٹھ بھاگے۔ چناں چہ بس میں ایک عجیب سکون طاری تھا۔ چند لوگ ایک دوسرے سے پرے پرے بیٹھے دھیرے دھیرے باتیں کرنے میں محو تھے۔
میں نے پہلے تو عورتوں اور لڑکیوں کا جائزہ لیا۔ تین لڑکیاں تھیں اور دو عورتیں۔
لڑکیاں گوری تھیں۔ دو دو چوٹیاں، آنکھیں بڑی نہ چھوٹی، باتیں میٹھی نہ پھیکی۔۔۔ لیکن گال..... اف توبہ ۔۔۔ اس قدر بے ہودہ گال!! ہڈیاں ابھری ہوئیں اور گہری گہری لکیریں جو ہنستے وقت اور گہری ہو جاتیں تھیں۔۔۔ اب دوسری عورت کی جانب دیکھا...... ہرے رام! وہ تو صورت سے بالکل آیا لگی۔ شاید سچ مچ کی آیا ہو۔ اسی بات سے مجھے خیال آیا کہ ہم لوگ بچوں کے لیے کس قدر بد صورت آیائیں مقرر کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عمر بھر ہمارے بچوں کی جمالیاتی حس پنپنے نہیں پاتی۔۔۔ خیر اب ایک عورت کا جائزہ لینا باقی تھا۔ وہ میری جانب پیٹھ موڑے بیٹھی تھی۔ اس کے کندھے پر ننھے بچے کا سر ٹکا تھا اور ایک بچی سامنے کی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ گویا وہ کم از کم دو بچوں کی ماں تھی۔

دل پر مایوسی کا جذبہ طاری ہونے لگا۔ بیس پچیس منٹ کا یہ سفر یوں ہی کٹ جائے گا۔ دل بہلاوے کی کوئی حسین صورت دکھائی نہ دے گی۔ کیا یہ سفر جماہیاں لیتے ہی بتانا پڑے گا۔
سوچا۔۔۔ اگر دو بچوں کی ماں بدصورت ہے تو اپنی بہنوں سے بڑھ کر کیا ہوگی۔ یہی نا کہ ان کے برابر ہوگی یا ذرا بہتر۔ آخر یہی طے پایا کہ اس خاتون کے عین پیچھے والی سیٹ پر ڈیرا جمایا جائے۔
پچھلی سیٹ پر چپکے سے بیٹھ کر میں نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بالوں کی تہ جمائی اور پھر انتظار کرنے لگا کہ وہ ذرا ادھر اُدھر گھوم کر دیکھے تو صورت کا جائزہ لیا جائے۔
لیکن وہ ادھر اُدھر دیکھے بغیر سامنے کی جانب منہ کیے چپکی بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ بس چل دی۔

مجھے بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ بارے کنڈکٹر نے آکر دام طلب کیے۔ ٹکٹ لیتے وقت خیال آیا کہ کاش اس خاتون سے تھوڑی بہت بات چیت ہوچکی ہوتی تو اس کے ٹکٹوں کے دام دے کر اچھے خاصے مراسم پیدا کیے جاسکتے تھے۔

جب اس کی باری آئی تو اس نے منہ پھیر کر دیکھا۔ رخِ روشن کا جلوہ دکھائی دیا۔ دل دھک سے رہ گیا۔

وہ واقعی بہت حسین تھی۔ تارا سی آنکھیں، نازک لب، اور درخشاں پیشانی— خلافِ امید اس عورت کو حسین پاکر ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

اب مسئلہ یہ در پیش تھا کہ اس سے گفتگو کیوں کر شروع کی جائے۔ کون سا موضوع مناسب رہے گا۔ موسم؟...... لیکن ہندوستان میں ابھی موسم کے موضوع پر گفتگو کا آغاز کرنا خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں کرسکتا۔ اس عورت سے یہ کہنا کہ آہا! کیا ہی خوشگوار موسم ہے محض بے کار ہوگا۔ سنیما، ایکٹر، ایکٹرسیں، بسیں، سڑکیں...... نہیں، نہیں، یہ باتیں مہمل ہیں...... اتنے میں عورت کے شانے کے ساتھ لگے ہوئے ننھے بچے نے آنکھیں کھولیں اور حیرت و استعجاب سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ بڑا پیارا بچہ تھا۔ میں نے اس کے گال پر ہلکی سی چٹکی لی تو اس کے چھوٹے چھوٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ پھر میں نے دونوں انگلیوں سے اس کی ٹھوڑی کو ہلکے سہلانا شروع کیا تو وہ ہنسنے لگا— میں جانتا تھا کہ اس کی ماں کو اس بات کا علم ہوچکا ہے۔

بچے کے کانوں کے پیچھے داد کے نشان دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے جرأت سے کام لے کر پوچھا۔

"کیوں جی! ننھے کے کانوں کے پیچھے داد ہو رہا ہے......"

"جی— ہاں......"

"تو کیا آپ اس کا علاج نہیں کرائیں گے؟"

"علاج تو ہو رہا ہے......"

"کیا ہومیو پیتھی علاج کرا رہی ہیں؟"

"جی نہیں، ہے تو ایلو پیتھی۔"

"ایک ڈاکٹر ہیں رچی رام۔ ہومیو پیتھی علاج کرتے ہیں۔ خصوصاً بچّوں کے علاج میں تو انہیں مہارت حاصل ہے۔ اگر یہ علاج موثر ثابت نہ ہوا، تو ان سے رجوع کیجئے گا۔"

"بہتر۔"

"بہت ہی پیارا بچہ ہے۔" میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

عورت نے بچّے کو شانے سے ہٹا کر کھڑکی کے ساتھ پیٹھ لگالی۔ اب اس کا رخ قریب قریب میری جانب تھا۔ اس نے بچّے کو زانو پر بٹھا کر دیکھنا شروع کیا کہ وہ واقعی حسین ہے یا نہیں۔ پھر جیسے دل ہی دل میں اس نے میرے قول کی تائید کرتے ہوئے میٹھی نظروں سے میری جانب دیکھا۔

"آپ کو بچّوں سے خاصا لگاؤ ہے۔ کیا آپ کے بھی بچّے ہیں؟"

"جی نہیں۔" میں نے قدرے جھینپ کر کہا۔ "ابھی تو میری شادی بھی نہیں ہوئی۔"

"کیوں شادی نہ ہونے کی کیا وجہ ہے؟"

"یوں ہی۔" میں نے سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔ "یہی، ابھی بے کار ہوں۔ جب تک آمدنی کی معقول صورت نہ ہو، دل میں شادی کا خیال بھی نہیں آسکتا۔"

"لیکن آپ بے کار کیوں ہیں؟"

میں اس جرح سے گھبرا گیا تھا۔ میں نے پنجاب یونی ورسٹی سے بی۔اے کرنے کے بعد پشاور میں کاروبار شروع کیا تھا۔ آمدنی کی صورت نظر آنے لگی تو فساد شروع ہوگئے اور مجھے اِدھر بھاگنا پڑا...... اب نئے سرے سے کام کرنے کا خیال ہے۔"

عورت کی آنکھوں میں اداسی کی جھلک دکھائی دی۔ اس وقت وہ کچھ کھوئی کھوئی سی نظر آ رہی تھی۔ موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے حسین چہرے کے خد و خال کا بغور جائزہ لینے لگا..... کیا وہ میری خاطر اداس تھی؟ ایک لمحے کے لیے ہی سہی!— کاش! مجھے بھی ایسی ہی موہنی بیوی مل جائے۔

کہتے ہیں کہ عورت مرد کے دلی جذبات کو بہت جلد پہچان لیتی ہے۔ عورت نے نظریں جھکا لیں اور پھر قدرے تامل کے بعد نہ معلوم کیوں— بڑی بچی کی جانب اشارہ کر کے مسکرا کر بولی۔ ''یہ میری بیٹی ہے۔''

''آؤ بیٹی! میرے قریب آؤ.....'' میں نے ہاتھ پھیلائے۔ وہ مارے شرم کے آگے نہیں بڑھی تو میں نے خود ہی بڑھ کر اسے گود میں بٹھا لیا۔ ''آہا ہا..... بڑی اچھی ہے ہماری بے بی..... اچھا تو تم پڑھتی ہو کیا؟''

لیکن وہ بڑے اہتمام کے ساتھ شرماتی رہی۔

عورت بولی ''بتاؤ نا بے بی! تم سے کے مرتبہ کہا ہے کہ یوں ہی مت شرمایا کرو۔''

میں نے سوچا کس قدر مہذب ہے یہ عورت۔ اس کی بات چیت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ پڑھی لکھی اور خاصی سلجھی ہوئی ہے۔

ماں کے سرزنش کرنے پر بیٹی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کیا پڑھا ہے بھئی ہمیں بھی سناؤ..... تم تو بہت اچھی بے بی ہو۔ تمھیں تو پڑھا لکھا یاد ہوگا سارا، بولو یاد ہے؟''

''ہاں جی۔'' بے بی نے بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر بھرپور نظروں سے میری جانب دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس بات کا اقبال کرنے میں اسے بہت فخر محسوس ہو رہا ہے۔

''اچھا بھئی پھر سناؤ نا! کیا پڑھا ہے تم نے؟''

''اے، بی، سی، وائی، زیڈ''

اس پر ہم دونوں قہقہہ مار کر ہنسے۔ میں اور وہ عورت۔ ہم دونوں جو ایک

دوسرے سے بہت دور تھے۔ لیکن قہقہوں کی ملی جلی آواز سے یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی فلم کے ہیرو اور ہیروئن کوئی سحر انگیز ڈوئیٹ گا رہے ہیں۔

عورت نے بہ مشکل ہنسی روکتے ہوئے کہا۔'' اری بے بی! تجھے اے، بی، سی، ابھی تک یاد نہیں ہوئی۔ سی کے بعد ایک دم وائی زیڈ؟''

اب ہماری ملاقات قابلِ اطمینان درجے تک آن پہنچی تھی۔ اب بیش تر خدشات دور ہو چکے تھے۔ ہم دو بہت اچھے واقف کاروں بلکہ دوستوں کی طرح گفتگو کرنے لگے۔

بیس یا پچیس منٹ کے سفر میں زیادہ باتیں نہیں ہو سکتی تھیں، لیکن اگر احساسات کو لیجیے تو لمحہ بھر میں کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ ایک میٹھی نظر تھی کہ زندگی کے ان لمحوں کو رنگین بناتی چلی گئی۔ اس کی آواز میں ایسا لوچ اور رسیلا پن تھا کہ مدتوں کانوں میں شہد سا گھلتا رہا۔

اِدھر اُدھر کی باتوں میں ہم اس قدر محو تھے کہ اردگرد کی کچھ خبر نہیں رہی تھی—— جب میں نے جنگل میں شیر کے فرضی شکار کی کہانی سنائی اور جھوٹوں ہی کہہ دیا کہ میں نے شیر کے سامنے کھڑے ہو کر اس پر گولی چلائی تھی تو عورت کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ حیرت سے بولی۔

'' لیکن میں نے تو سنا ہے کہ شیر کا شکار مچان پر بیٹھ کر کیا جاتا ہے۔''

'' جی ہاں۔'' میں نے بے پروائی سے سگریٹ کا بجھا ہوا ٹکڑا ہوا میں پھینکتے ہوئے جواب دیا'' لیکن کہنہ مشق شکاری مچان پر کبھی نہیں بیٹھتے ہیں۔''

وہ سچ مچ میری بات پر ایمان لے آئی۔ باتوں باتوں میں مجھے خیال آیا کہ مرد کے دل میں عورت کی کشش کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عورت کے سامنے وہ دل کھول کر جھوٹ بول سکتا ہے اور عورت بھی ہر دم جھوٹ سننے کے لیے تیار رہتی ہے۔ ہوشیار سے ہوشیار عورت بھی بالآخر اسی مرد کو پسند کرتی ہے جس کے جھوٹ پر وہ اعتبار کر سکے۔

عورت طفلانہ انداز سے کئی بات پوچھتی رہی اور میں بڑی توجہ سے ان کے

جواب دیتا رہا— گناہ و ثواب، پیار، محبت، عشق و حسن اور شرافت و خباثت کی گھلی ملی سی یہ ملاقات کس قدر دل کش اور جان لیوا تھی— اس سہانی صبح کو دو اجنبی مسافروں کی مختصری ملاقات، تاریخِ عالم کا کس قدر اہم واقعہ!!

بے بی ابھی تک میری گود میں بیٹھی تھی۔ دفعتاً مجھے محسوس ہوا کہ کام نکل جانے کے بعد بے بی کو تو میں بھول ہی گیا تھا۔ میں نے مجوب ہو کر بے بی کی بغلوں کو گدگدایا" ارے بے بی! تم تو کوئی بات ہی نہیں کرتیں...... کیا تم ہم سے خفا ہو۔

وہ چپ رہی۔

" بولو— بی بی۔"

" لاہیں۔" بے بی نے انکار کے طور پر سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

" اچھا تو بتاؤ تمہارا نام کیا ہے؟"

" میرا لام؟"

" ہاں۔"

" سول تاناں۔"

" سلطانہ۔" عورت نے کہا۔

مجھے پہلی مرتبہ اس بات کا علم ہوا کہ وہ مسلمان ہیں۔ سلطانہ کی بغلوں کو گدگداتے ہوئے میرے ہاتھ رک گئے۔ میں نے قدرے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔

" کیا آپ مسلمان ہیں؟"

" جی۔" یہ کہہ کر عورت نے میری طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

" نہیں کچھ نہیں۔" میں ہنس دیا— " مجھے ہوا کیوں کہ بظاہر......"

پھر قدرے بھدی سی خاموشی طاری ہوگئی۔

بات کچھ بھی نہیں تھی...... میں نے سکوت توڑتے ہوئے پوچھا۔

" فساد کے دنوں میں آپ دہلی ہی میں تھیں؟"

"جی ہاں ہم سب یہیں تھے۔"

میرے دل کو نہ معلوم کیا ہونے لگا۔ میں نے رکی رکی آواز میں پوچھا۔" آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوتی؟"

عورت نے قدرے سکوت کیا۔" بس کچھ نہ پوچھئے۔ مالی نقصان بہت ہوا، جانیں بچ گئیں۔ یہی غنیمت سمجھئے۔ کناٹ پلیس میں ہماری دکان لٹ گئی۔ مکان میں فسادی گھس آئے...... لیکن پیش تر اس کے کہ کوئی نقصان ہوتا پولس آ گئی......"

میرا سر جھک گیا...... ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

اسٹینڈ پر پہنچ کر بس رک گئی۔

اس خیال سے کہ عورت تنہا ہے اور بچے دو، شاید اسے میری مدد کی ضرورت ہو، میں نے اپنی سیٹ سے اٹھنے میں تامل کیا لیکن عورت کے ہلکے پن سے روشن ہوا کہ میری مدد درکار نہیں ہے۔ چناں چہ میں شریف مرد کی طرح اٹھ کر چل دیا۔

چند قدم چلنے کے بعد میں نے یوں ہی گھوم کر دیکھا کہ وہ عورت اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھ رہی ہے، لیکن اس کے قدم اکھڑے اکھڑے دکھائی دیتے تھے۔ وہ قدرے لنگڑا کر چل رہی تھی۔

میں سوچنے لگا کہ اگر اس کی ٹانگ میں یہ نقص نہ ہوتا تو وہ قدم قدم پر فتنے جگاتی ایسی حسین عورت اور یہ عیب!

دفعتاً ہماری نظریں ملیں ـــ غالباً وہ سمجھے بیٹھی تھی میں چلا گیا ہوں۔ مجھے ایک مرتبہ پھر اپنے سامنے پا کر وہ پریشان سی ہو گئی جیسے کہہ رہی ہو۔" آخر تم نے مجھے لنگڑا کر چلتے ہوئے دیکھ لیا نا؟"

محجوب ہو کر اس نے اپنا گلابی ہوتا ہوا چہرہ جیسے جھکا لیا اور پھر جیسے روٹھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

میں اسے منانے کے لیے آگے بڑھا اور اس کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اس کے

چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔ "معزز خاتون! تم بہت حسین ہو، تم حسن کی تتلی ہو، تم کیا جانو میں ان چند دل فریب لمحوں کے لیے تمہارا کس قدر شکر گزار ہوں۔"...... اور پھر میں قدرے بلند آواز میں کہا۔ "معاف کیجئے گا — آپ کچھ پریشان سی نظر آتی ہیں، کیا آپ کو کہیں آگے جانا ہے۔ تانگہ لاؤں؟...... یا آپ کو کسی کا انتظار ہے؟"

اس نے سر پر دوپٹہ سنوارتے ہوئے جواب دیا۔ "جی جانا تو قریب ہی ہے...... وہ نہیں آئے...... ملازم کو تو بھیج دیتے، ملازم کو تو آنا ہی چاہئے تھا......"

میں نے آگے بڑھ کر لڑکی کو گود میں اٹھا لیا اور بولا۔ "چلیے میں آپ کو چھوڑ آؤں۔"

وہ بغیر کچھ کہے میرے ساتھ ہولی۔

ابھی ہم پندرہ بیس قدم ہی چلے ہوں گے کہ وہ بول اٹھی۔ "لیجئے، وہ لڑکا ہمارا نوکر چلا آرہا ہے۔"

ہم رک گئے۔ میں نے جھجکتے ہوئے ٹانگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "کیا پیدائشی نقص ہے؟"

اس نے قدرے تامل کیا۔ پھر اپنی آنکھیں میری آنکھوں میں ڈالتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ "جی نہیں...... جب فسادیوں نے ہمارے مکان پر حملہ کیا تو ایک دریر نے لاٹھی گھما کر ماری تھی......"

میرا دل بیٹھنے لگا۔ لرزتے ہوئے ہاتھوں سے میں نے بچی کو نوکر کی طرف بڑھایا...... میری پیشانی پر ٹھنڈے پسینے کی بوندیں پھوٹ پڑیں۔ کانپتے ہوئے ہاتھ سے جیب میں رومال ٹٹولنے لگا۔

رخصت کے موقع پر کچھ کہنا چاہا لیکن ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ چناں چہ میں کچھ اس انداز سے دو قدم پیچھے ہٹا جیسے وہ قدیم بابلیوں کی حسین شہزادی ہو۔ میری

آنکھیں جھک کر اس کے قدموں پر جم گئیں۔ میں نے تصور ہی تصور میں اس کے پاؤں پر سر رکھ دیا۔

پھر اچٹتی ہوئی نظروں سے اس کی جانب دیکھا تو معلوم ہوا کہ اب ان آنکھوں میں وہ روکھا پن نہ تھا نہ سختی اور پھر مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ مہربان ہوتی ہوئی کسی خود سر ملکہ کی طرح کہہ رہی ہے۔" مابدولت خوش ہوئے..... مابدولت نے نہ صرف تمہیں بلکہ تمہاری ساری قوم کو معاف کیا—"

ایک مرتبہ پھر ہم نے ایک دوسرے کی جانب شکر گزار نظروں سے دیکھا— اور پھر ہم ایک دوسرے سے دور ہونے لگے۔ یہاں تک کہ بالآخر ایک دوسرے کی نظروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو گئے۔

یہ افسانہ افسانوی مجموعہ 'پہلا پتھر' میں شامل ہے۔

ویہلے 38

شہر کا وہ حصہ جسے پہلے واقعی شہر کا حصہ کہا جاسکتا تھا۔ اب بری طرح برباد ہو چکا تھا، ٹوٹے پھوٹے مکانات دور سے دیکھنے والوں کو بالکل غیر آباد کھنڈر دکھائی دیتے تھے۔ اور اگر ان خستہ حال گلیوں میں مغربی پنجاب سے آئے ہوئے شرنارتھیوں کی چہل پہل نہ ہوتی تو شاید دن کے وقت بھی انسان کو وہاں جاتے ہوئے ڈر محسوس ہوتا۔

کچھ مدت پہلے یہاں کے اصل باشندوں یعنی مسلمانوں کو بے پناہ مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا جو کیفیت ان پر گزری تھی۔ اس کی داستان ان کھنڈروں کی زبانی سنی جاسکتی تھی۔ فسادات کے بعد جب کہ اصل باشندے ہجرت کر گئے تھے اور ابھی شرنارتھی آن کر بسے نہیں تھے اس بستی پر عجب کس مپرسی کی حالت طاری تھی۔ مکان گرائے گئے تھے، جلائے گئے تھے، الغرض ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی تھی۔ مکانوں کے بغیر دروازوں کی چوکھٹیں گویا حیرت سے منہ کھولے کبھی واپس نہ آنے والے مکینوں کی راہ تک رہی تھیں۔ گرد آلود آسمان میں گدھ منڈلاتے تھے۔ بھوک کے مارے ہوئے کتے کونے کھترے سونگھتے پھرتے تھے اور بھولی بھٹکی گائیں اینٹوں کے ڈھیر میں ٹھوکریں کھاتی پھرتی تھیں۔

اس عالمگیر بربادی میں اگر ایک طرف ایک قوم کے مکانات کو نا قابلِ تلافی

نقصان پہنچا تھا تو دوسری جانب دوسری اقوام کے اِکا دُکا مکانات صحیح و سالم کھڑے تھے۔ انہیں مکانوں میں سے ایک سردار بدھ سنگھ کا مکان بھی تھا۔

اس قدر اچھے نام والے حضرت بڑے بے تکے ذیل ڈول کے مالک تھے۔ پست قد، گنجا سا سر، چھوٹی چھوٹی متجسس آنکھیں، فربہ بدن، طویل لہراتی ہوئی داڑھی — صبح و شام پاٹھ کرتے، مالا جپتے، یوں تو مالا ہر وقت کلائی سے لپٹی رہتی لیکن علی الصبح جب وہ سکھ متی صاحب کا طویل پاٹھ کرنے لگتے تو گھر کے افراد کی نیند اکھڑ جاتی۔ آپ گوردوارے میں بھی پاٹھ کرواتے رہتے تھے۔ دوسروں کو بھی پاٹھ کی تلقین کرتے تھے۔

فسادات کے زمانے کے قصے بڑے دردناک لہجے میں دہراتے تھے، کہتے ہیں یہ ساری آبادی مسلمانوں کی تھی۔ اس آبادی کے ایک سرے پر ہم لوگوں کے مکانات تھے۔ اسی لیے ان دنوں انہیں اپنا مکان چھوڑ کر ہندو محلے میں جانا پڑا۔ شہر میں ان کے کئی اور مکانات بھی تھے۔ لیکن وہ سب کرائے پر اٹھے ہوئے تھے۔ چناں چہ ان دنوں انہیں خاصی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔

ادھر جب پانسہ پلٹا تو انہوں نے خوف کے مارے بھاگتے ہوئے مسلمانوں کی ہزاروں کی جائدادیں کوڑیوں کے مول خرید لیں اور پھر دولت مند شرنارتھیوں کے ہاتھ زیادہ سے زیادہ داموں پر بیچ کر جی کھول کر منافع کمایا۔ پاٹھوں کی شدت اور بڑھی اور ان کا چہرہ نورِ معرفت سے دمک اٹھا۔

دور تک پھیلے ہوئے کھنڈروں کے ایک سرے پر کھڑے ہوئے چند صحیح و سالم مکانات عجب مضحکہ خیز منظر پیش کرتے تھے۔ ان میں سب سے اچھا مکان بدھ سنگھ کا تھا۔ دو منزلے مکان کا نچلا حصہ انہوں نے کرائے پر اٹھا دیا تھا اوپر والی منزل پر ان کی اپنی رہائش تھی۔ ان کے گھر کے قریب ہی ریلوے لائن تھی۔ شب و روز ریل کی گاڑیاں ادھر سے گزرا کرتی تھیں۔ ایسے موقعوں پر انجن کی سیٹیوں اور گاڑی کی گڑگڑاہٹ کا شور اس قدر شدید ہوتا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

شرنارتھیوں نے گھبراہٹ میں جو کام سامنے آیا شروع کر دیا۔ پے در پے مصائب جھیلنے کے باعث ان کے حواس قائم نہیں رہے تھے۔ بعض لوگوں کے عزیز

مرکھپ گئے تھے، بعض یتیم یا بے سہارا رہ گئے تھے۔ اس قسم کے بے شمار خاندانوں میں سے ایک خاندان بسا کھا سنگھ کا بھی تھا۔

بسا کھا سنگھ مغربی پنجاب کے ضلع لائل پور کا ایک معمولی زمین دار تھا۔ اس کے دو لڑکے تھے اور تین لڑکیاں۔ وہ خود سیاہی مائل گندمی رنگ کا دراز قد اور مضبوط انسان تھا۔ اس کے ہاتھ ہیچ بچ ہل کی ہتھی تھامنے کے لیے بنے تھے۔ اس کی شادی چھوٹی عمر ہی میں ہو گئی تھی۔ چناں چہ وہ ابھی سینتیس برس کا تھا اور اس کا بڑا لڑکا انیس برس کا ہو چکا تھا۔ اس سے چھوٹا لڑکا سترہ برس کا۔ لڑکیوں میں سب سے بڑی پندرہ کی تھی۔ چھوٹی بہنیں بھی چار پانچ برس تک جوان ہوا چاہتی تھیں۔

پہلے پہل اپنے گھروں سے نکل کر انہیں کیمپ میں دبکے رہنا پڑا۔ نہ کچھ کھانے کو نہ پینے کو، نہ تن ڈھانپنے کو کپڑا اور نہ سر چھپانے کو کٹیا اس پر طرہ یہ کہ ہر دم جان کا خوف دامن گیر رہتا تھا۔ زندگی پل پل گزارنا بے حد تکلیف دہ ثابت ہو رہا تھا۔ یہ قافلہ عجب بے سروسامانی کی حالت میں مشرقی پنجاب کی جانب روانہ ہوا۔ بچے، بوڑھے، عورتیں اور مرد تکان زدہ قدموں کے ساتھ بھوکے پیاسے تھکے ہارے جانیں ہتھیلی پر دھرے منزل کی جانب بڑھ رہے تھے۔ راستے میں فسادیوں کی ہجوم بڑھ بڑھ کر حملے کرتے تھے۔ قافلے میں کئی بہادر آدمی بھی تھے جو موقع پڑنے پر بڑی بے جگری سے لڑتے تھے لیکن بھوک اور پیاس کے مارے ہوؤں کا لڑنا بھڑنا بھی کیا تھا۔ بعض اوقات تاریک راتوں کو روکھی سوکھی کھا کر لوگ کھیتوں کی مینڈھوں پر ہی کروٹ بدل کر لوٹنے لگتے۔ جا بجا سلگتی ہوئی آگ میں سے چنگاریوں کی پھلجھڑیاں چھوٹنے لگتیں۔ کوئی آنکھوں سے اندھی بڑھیا پوپلے منہ سے لرزتی ہوئے بے سری آواز میں شبد گانے لگتی تو دفعتاً شور وغوغا بلند ہوتا۔ فسادی شب خون مارتے۔ وہ بلا کھٹکے ڈیرے کے اندر در آتے۔ تاروں کی مدھم روشنی میں تیزی سے بڑھتے اور اچکتے ہوئے سائے دکھائی دیتے۔ افراتفری مچ جاتی۔ جب حملہ آور بچی کھچی گٹھڑیاں اور پوٹلیاں چھین لینے کی کوشش کرتے تو بعض

عورتوں کی آہ و بکا سے آسمان گونج اٹھتا لیکن تارے چپ چاپ آنکھیں جھپکا جھپکا کر تماشا دیکھا کرتے۔ مذہبی نعروں، مارو مارو کا شور اور پہرے دار اور سپاہیوں کی بندوقوں کی تڑاتڑ کی صدائیں رفتہ رفتہ مدھم پڑ جاتیں۔ مجبور و معذور کراہتی ہوئی عورتیں اور زخمی انسانوں کے ستے ہوئے چہرے باقی رہ جاتے۔ یہ قافلہ پکے ہوئے پھوڑے کی مانند تھا جسے بار بار چر کے دیے جاتے تھے اور جو سدا رستا رہتا تھا۔

بساکھا سنگھ نے خود بھی موقع پڑنے پر لڑنے بھڑنے سے گریز نہیں کیا۔ اسے اور اس کے دونوں لڑکوں کو بھی متعدد زخم آچکے تھے۔ بالآخر جب وہ یونین کے حدود میں داخل ہوئے تو ان کے دم میں دم آیا۔ وہاں انہیں دودھ اور جلیبیاں کھانے کو ملیں۔ آلو کچوریوں سے بھی تواضع ہوئی۔ اس وقت انہیں اس امر کی بے حد خوشی تھی کہ اب وہ آرام کی نیند سو سکیں گے۔ اب ان کا کوئی دشمن شب خون نہیں مارے گا۔ اب ان کی بہو بیٹیوں کی عزت و عفت کوئی نہیں لوٹے گا۔ اب ان کی جان و مال کی پوری پوری حفاظت کی جائے گی۔

ہند یونین کے حدود کے اندر داخل ہوتے ہی قافلہ تسبیح کے دانوں کی مانند بکھرنے لگا۔ کچھ لوگ راستے میں جو شہر پڑتے وہاں رک جاتے۔ فرار شدہ مسلمانوں کے مکانوں پر قبضے ہونے لگے۔ بساکھا سنگھ نے بھی بدھ سنگھ کے پڑوس میں ایک بے حد بوسیدہ مکان میں ڈیرا جما دیا۔ یہ مکان دراصل اس قدر بری حالت میں تھا کہ اس وقت تک کسی کو اس پر قبضہ جمانے کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ چوں کہ اور کوئی مکان خالی نہیں تھا اس لیے بساکھا سنگھ نے اسے غنیمت جانا۔

یہ عجیب قسم کی بستی تھی۔ لٹے ہوئے بدنصیب لوگوں کے ترک کردہ مکانوں میں تباہ حال، بدنصیب اور بے خانماں انسان آباد ہو رہے تھے۔ تاریخ عالم میں انسانوں کے دو گروہوں نے ایک دوسرے سے اس قدر خوف ناک مذاق کبھی نہیں کیا ہوگا۔

انسانی جسم کی ہڈیوں کا ڈھانچہ ہیبت ناک اور عبرت ناک شے ہے لیکن جلی پنکی

برباد شدہ بستی کا منظر بھی کچھ کم دہشت ناک اور عبرت انگیز نہیں ہے۔

اونچی نیچی : ہموار غلیظ گلیوں میں ستے ہوئے چہروں والے نحیف و لاچار انسان حیران و ششدر دربدر گھوما کرتے تھے۔ یہ بستی دن کے کسی لمحے میں بھی دل خوش کن منظر پیش نہیں کرتی تھی۔ رات کی خواب ناک روشنی میں وہ ایک طویل و عریض قبرستان کے مانند دکھائی دیتی تھی۔ صبح کے وقت جب سورج کی تیز روشنی تاریکی کی چادر چاک کر دیتی تو یہ بستی زبانِ حال سے عبرت! عبرت! پکارنے لگتی تھی۔ سارا سارا دن بھکے بھکے لوگ ادھر اُدھر گھوما کرتے، کتے بھونکتے، مریل بلیاں ہڈیاں بھنبھوڑتیں اور مکھیاں بھنبھنایا کرتیں۔ شام کے وقت تنور اور چولھے روشن ہو جاتے۔ پہلے تو دھوئیں کی پتلی پتلی لکیریں اوپر کو اٹھنے لگتیں اور پھر دھوئیں کے ستون بن بن کر بوجھل بادلوں کے مانند آسمان کے اس سرے سے اس سرے تک پھیل جاتے۔ اس پھیلی پھیلی سیاہی تلے وہ بستی اور بھی حقیر اور بے کیف نظر آنے لگتی۔

پہلے پہل بساکھا سنگھ نے واہگورو کا ہزار ہزار شکر ادا کیا۔ آخر یہ اکال پرکھ کی عنایت ہی تو تھی کہ وہ اپنے سارے کنبے سمیت ساری مشکلات میں سے بخیر و عافیت نکل آیا تھا۔۔۔ رفتہ رفتہ روزی کی فکر دامن گیر ہوئی۔ کنبے کا پیٹ پالنے کا سوال پیش نظر رہنے لگا۔ یوں تو ہر شخص کے لیے جما جمایا کام چھوٹ جانے کے بعد نئے سرے سے کام شروع کرنا بہت ہی مشکل مسئلہ تھا لیکن بساکھا سنگھ ایسے انسانوں کے لیے جو پہلے کھیتی باڑی کرتے تھے اور جو کسی بھی دوسرے ہنر سے واقف نہیں تھے۔ یہ مسئلہ قریب قریب نا قابلِ حل ہو کر رہ گیا تھا اور پھر بغیر پونجی کے تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہاں تک کہ نوبت مزدوری تک آن پہنچی۔ اس کے باوجود گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے تھے۔ جان پہچان والوں کے سامنے اس قسم کا کام کرنے میں اور بھی ہیٹی ہوتی تھی۔ کیوں کہ پہلے وہ ان کے رو برو خاصی عزت اور آبرو کی زندگی بسر کیا کرتا تھا۔ القصہ اس طرح زندگی کی گاڑی چرخ چوں کرتی ہوئی گھسٹتی چلی جا رہی تھی۔

بستی میں پہنچتے ہی گوردوارے میں سردار سنگھ سے اس کی ملاقات ہوئی۔ یوں ہی بدھ سنگھ کو اس کی باتوں میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔ شام کے وقت بساکھا سنگھ ان کے ہاں چلا جاتا اور انہیں ان مصائب کے قصے سناتا جو انہیں راستے میں جھیلنے پڑتے تھے۔ بساکھا سنگھ کے دل میں ایک موہوم سی امید تھی کہ بدھ سنگھ سے ضرور اسے کچھ نہ کچھ فیض پہنچے گا۔ اسی لیے اس نے اس کے ہاں آمد و رفت جاری رکھی۔

بساکھا سنگھ کے دل میں بدھ سنگھ کے لیے بڑا احترام تھا۔ ایک تو بدھ سنگھ صورت ہی سے بڑا گورکھ دکھائی دیتا تھا۔ اس کی وہ چوڑی پیشانی، روشن آنکھیں، پرنور لانبی داڑھی جس کے بیش تر بال سفید ہو چکے تھے، پریم رس میں ڈوبی ہوئی اس کی وہ میٹھی میٹھی باتیں اور اس پر طرۂ یہ کہ صبح و شام پاٹھ کیا کرتا تھا۔ بظاہر یوں معلوم ہوتا تھا کہ اسے دنیا کے موہ مایا کے جال سے مطلقاً کوئی سروکار نہیں ہے۔ وہ بساکھا سنگھ کے مصائب کا حال بڑے دھیان سے سنتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان پر کیے گئے مظالم کا حال سن کر اس کا دل موم کے مانند پگھلا جارہا ہے۔ اس پر بساکھا سنگھ کا دل بھر آتا اور وہ گلوگیر آواز میں اپنے لہلہاتے ہوئے کھیتوں کا ذکر کرتا۔ جہاں ہر سال لکھوکھا سنہری بالیاں ہوا میں جھوما کرتی تھیں۔ وہ گندم کے ان ذخیروں کا ذکر کرتا جو اس کے مکان کے اندر بھڑولوں' میں ٹھساٹھس بھرے رہتے تھے۔ اپنے بیلوں' اپنی بھوری اور کالی بھینسوں، اپنے مکان غرض ہر شے کی کہانی سناتا۔ بظاہر بدھ سنگھ بہت متاثر نظر آتا تھا۔ وہ شخص جس کی بابت کہا جاتا تھا کہ اس کے پاس لاکھوں روپیہ نقد موجود ہے مکان ہیں، کارخانے ہیں، لیکن بساکھا سنگھ کی باتیں سننے کے بعد وہ بڑی متین صورت بنا کر سر ہلاتا اور کہتا۔ ''بساکھا سنگھ جی پاٹھ کیا کرو۔''

چناں چہ بساکھا سنگھ نے خوب پاٹھ کرنے شروع کر دیئے۔ خود بھی کیے اور بیوی بچوں سے بھی کروائے۔ لیکن جب ان کا کچھ نتیجہ نہ نکلا تو بساکھا سنگھ کہتا۔ ''سردار صاحب جی! دیکھیے جوان لڑکیوں کا بھی دل پر کس قدر بوجھ ہوتا ہے۔ سنتو بڑی ہوگئی

ہے۔ اوپر سے کلجگ کا خیال کیجئے۔ میرے پاس تین چار سو روپیہ بھی ہو تو میں کسی نہ کسی طرح بڑی لڑکی کے بوجھ سے سبکدوش ہو جاؤں۔"

"واہگورو! واہگورو!" بدھ سنگھ جواب دیتا۔ "بساکھا سنگھ جی نام جپا کرو نام۔ نام میں بڑی شکتی ہے۔"

بساکھا سنگھ نے نام جپنا شروع کر دیا۔ خوب جی بھر کر نام جپا۔ یہاں تک کہ ایک مالا بھی خرید ڈالی۔ ہر وقت انگلیوں میں منکے گھومتے رہتے تھے۔ ایک پہر رات باقی ہوتی کہ وہ جاگ اٹھتا، اشنان کرتا اور پھر ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر مالا جپنے لگتا۔۔۔ سارا دن کام کاج کی تلاش میں مارا مارا پھرتا۔ بیٹے الگ خوار ہوتے تھے۔ لیکن نتیجہ وہی صفر کا صفر۔

بساکھا سنگھ کہتا۔ "مہاراج جی! اگر میرے پاس کہیں سے پانچ سو روپیہ بھی آ جائے تو کوئی چھوٹی موٹی دکان ہی کھول ڈالوں۔"

جواب ملتا۔ "بساکھا سنگھ جی! گوردوارے جایا کرو۔ سارے پریوار کو لے کر جایا کرو۔ گورو کے گھر میں کیا نہیں ہے جو مانگو سو ملے گا۔ گورو کے گھر میں کسی شے کی کمی نہیں ہے خالصہ جی!...... لیکن شردھا شرط ہے۔ بغیر شردھا کے کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اجی بابا اٹکیکھ سنگھ جی کہہ گئے ہیں کہ شردھا ضرور پھل لاتی ہے۔ خواہ یہ پھل دو، چار، دس، بیس، پچاس برس کے بعد ہی کیوں نہ ملے...... لیکن سردھا کا پھل ملنا ضرور ہے......"

چناں چہ اب گوردوارے کا طواف ہونے لگا۔ اس کی بیوی اس کی ان حرکات سے پریشان ہو گئی۔ ایک روز بساکھا سنگھ نے آنکھیں موند کر بڑے پریم سے کہا۔ "سنتو کی ماں! شردھا کا پھل ضرور ملتا ہے۔ خواہ دو، چار، دس، بیس یا پچاس برس کے بعد ہی ملے......"

یہ سن کر دکھوں کی ماری عورت نے دفعتاً اپنی میلی میلی آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ پہلے

چند لمحوں تک تو اس کی زبان سے ایک لفظ تک نہیں نکل سکا۔ پھر بہ مشکل رک رک کر گلوگیر آواز میں بولی...... " دس، بیس، پچاس برس؟ "...... اور پھر اس کی کانپتی ہوئی آواز بند ہوگئی۔ سر میں جنبش پیدا ہوئی اور اس کے ہونٹ لرز کر اور نتھنے پھڑک کر رہ گئے......

اس کے بعد کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ کیا سنتو اور اس کی بہنیں چالیس پچاس برس تک شردھا کے پھل کا انتظار کر سکتی تھیں۔ کیا اس کے نوخیز لڑکے شردھا کے پھل کے انتظار میں بوڑھے نہ ہوجائیں گے۔ کیا دنیا کے کسی انسان کی اتنی بساط بھی ہے کہ وہ دس، بیس، چالیس......

بساکھا سنگھ کے دماغ میں کھلبلی سی مچ گئی۔

اس رات چراغ کی مدھم روشنی میں وہ ٹانگیں سمیٹے، دونوں گھٹنوں کو بازوؤں کے کلونچے میں لیے دیوار سے پیٹھ لگائے اپنے خیالات میں دیر تک گم رہا۔ اسی کی گھنی بھنوؤں تلے سیاہ پتلیاں بڑے تجسس سے اردگرد کا جائزہ لے رہی تھیں۔ چراغ کی تھرتھراتی لو میں گھر کے افراد متحرک سایوں کے مانند دکھائی دیتے تھے۔ تا حدِ نگاہ رات کی دھواں دھواں سی فضا میں ٹوٹے پھوٹے مکانات کے سلسلے عجب ہیبت ناک منظر پیش کر رہے تھے۔ جس مکان میں وہ خود مقیم تھا اس کا بیش تر حصہ گر چکا تھا۔ غالبًا فسادیوں نے ہی اسے آگ لگائی ہوگی۔ دیواریں اور چھت کی کڑیاں کچھ جل جانے کے باعث اور کچھ دھواں لگنے کی وجہ سے بالکل سیاہ پڑ گئی تھیں کہ مکینوں کو ہر وقت ان کے گر جانے کا خطرہ لاحق رہتا۔ اس روز آٹے کی عدم موجودگی میں کھچڑی پکائی گئی تھی اور گھر کے سب لوگ اسی پر اکتفا کرنے پر مجبور تھے۔ اس کی اوپر تلے کی تین لڑکیاں، وہ انہیں ٹکٹکی باندھ کر کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے اس نے انہیں پہلے کبھی نہ دیکھا ہو — یہ صورتیں کیسی ہیں، کون ہیں، کہاں سے آئیں اور سب سے اہم سوال یہ تھا کہ وہ جائیں گی کہاں۔ اس کے دونوں بیٹے ننگے سر بیٹھے کھچڑی کھا رہے تھے، بار بار نوالے کے لیے منہ پھاڑتے تھے۔ ان کے جوڑوں میں سے نکل کر اوپر کو لہراتے ہوئے بالوں کے گچھے

مرغ کی کلغی کے مانند دکھائی دیتے تھے۔ وہ مسلسل منہ ہلائے جارہے تھے۔ بساکھا سنگھ پر عجب بے حسی طاری تھی جیسے اس کا اس ماحول سے کوئی تعلق نہ ہو، جیسے وہ سب سے ارفع اور الگ بیٹھا اس دنیا کے کھیل دیکھ رہا ہو لیکن وہ زیادہ دیر تک اس خواب ناک کیفیت میں گم نہیں رہ سکا۔ اسے جلد ہی اس امر کا احساس ہوگیا کہ یہ سب کچھ خواب نہیں تھا اور نہ وہ ان سے الگ تھا۔ کس قدر عجیب بات تھی کہ کالے کوسوں تک پھیلی ہوئی زمین پر گیہوں کے سنہرے خوشوں سے لدے ہوئے پودے کھڑے تھے۔ وسیع آسمان تلے واہگورو اکال پرکھ کی وسیع زمین موجود تھی، لیکن اس کے بندوں کو نہ کھانے کو اناج ملتا تھا اور نہ سر چھپانے کو جگہ میسر آتی تھی—— تعجب! بدھ سنگھ کے پاس اس قدر روپیہ ہے، مکان ہیں، کارخانے ہیں، بے فکری ہے، آنند ہے......

دوسرے روز شام کے وقت بساکھا سنگھ بستی میں بے مہار گھومتا پھر رہا تھا۔ اس کا ذہن عجب مخمصے میں گرفتار تھا۔ گھریلو پریشانیاں روز بروز بڑھتی جارہی تھیں۔ ان کا کوئی حل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ فسادات سے پہلے اسے کبھی گہرا غور اور فکر کرنے کی ضرورت محسوس ہی نہیں ہوئی تھی۔ اسے یاد تھا کہ وہ دو بھائی تھے اور ایک بہن۔ ان کے باپ کو ان سب سے بڑی محبت تھی۔ لڑکپن اور آغازِ جوانی کا زمانہ اس نے بڑی بے فکری سے گزارا تھا۔ کھیل کود، گیت اور الغوزوں اور عشق و محبت کے سوا اس نے اور کسی چیز کے متعلق سوچا ہی نہ تھا۔

جب وہ جوان ہوگیا تو بے فکری کے باعث جب اور کچھ نہ سوجھا تو اس نے چوروں اور ڈاکوؤں سے یارانہ گانٹھا۔ دو تین برس اسی قسم کے مشاغل میں گزر گئے۔ جنب باپ نے دیکھا کہ بیٹا سیدھے راستے سے بھٹک کر اپنی زندگی خراب کرنے پر تلا ہوا ہے تو اس نے اس کی شادی کردی۔ ازدواجی زندگی کے بندھن کچھ ایسے مضبوط ثابت ہوئے کہ ذمہ دار انسانوں کی سی زندگی بسر کرنے لگا۔

شادی کے بعد بال بچے بھی ہوئے۔ جیون کے دشوار گزار اتار چڑھاؤ سے ہو کر

بھی گزرنا پڑا۔ لیکن اسے آج تک ایسا تلخ تجربہ حاصل نہیں ہوا تھا کہ انسان پیٹ کی روٹی اور تن کے کپڑے کے لیے ایمان داری سے کام کرنا چاہے تو اسے کام ہی نہ ملے۔ جدید معاشی پے چیدگیاں اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آتی تھیں۔ اسے یہ سب چیزیں قطعاً غیر فطری دکھائی دیتی تھیں۔ لیکن اس کا ذہن ان مسائل کا خاطر خواہ حل پیش کرنے سے قاصر تھا۔

وہ کوچہ بہ کوچہ گھومتا پھرا۔ گندی گندی گلیاں جہاں رُکے ہوئے پانی کی نالیوں میں ایسی سخت بدبو اڑتی تھی کہ دماغ پھٹا جاتا تھا۔ جا بجا گلی سڑی سبزیوں، پیاز کے چھلکوں اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر دکھائی دیتے تھے۔ اونچی نیچی گلیوں میں جا بجا ٹوٹے پھوٹے مکانوں کی اینٹیں، مٹی، چونا اور روڑی پھیلی ہوئی تھی۔ مٹیالے رنگ کی بھدی اور گندی دیواریں طبیعت کو اور زیادہ پراگندہ کر دیتی تھیں۔ پھٹے پرانے چیتھڑے لٹکائے چھوٹے بڑے بچے چیختے اور چلاتے ہوئے ایک دوسرے سے آگے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ مکانوں میں زیادہ تعداد ایسے مکانوں کی تھی جن کے باہر کے دروازے تک جل گئے تھے۔ ان کے اندر صحن کے مناظر صاف دکھائی دیتے تھے۔ ڈھیلی رسیوں والی چارپائیاں، ان پر بیٹھی ہوئی میلے کچیلے دو پٹوں کے آنچل اڑاتی ہوئی عورتیں اور ان کے بھوک سے بلکتے ہوئے بچے جو چیخ چیخ کر ماؤں کی چھاتیوں کو ٹٹولتے تھے، حالانکہ ان چھاتیوں میں اب دودھ کہاں رہ گیا تھا۔ بعض جگہ ہلکی ہلکی آنچ پر تین تین دنوں کی باسی روٹیاں ابالی جارہی تھیں۔

گھوم پھر کر بسا کھا بدھ سنگھ کے مکان کے آگے پہنچ کر رک گیا۔ شام کے وقت بدھ سنگھ کے درشن کرنا — اس کے معمول میں داخل تھا۔ بدھ سنگھ کو (جسے گھر میں بڑے سردار جی کے نام سے پکارا جاتا تھا) گوربانی کی باتیں کرنے اور دیا کھیان دینے کا بڑا چسکا تھا۔ چناں چہ وہ اس قسم کے لوگوں سے بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتا تھا جو اس کی روحانیت کے قائل ہو کر اس کی باتیں انہماک سے سننا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ گرنتھ صاحب

میں سے شلوک پڑھے جاتے اور گیان اور معرفت کے دریا بہائے جاتے تھے۔

اس نے ڈیوڑھی میں سے اوپر کو جاتی ہوئی کشادہ اور صاف ستھری سیڑھیوں کی جانب دیکھا جو ابھی ابھی دھوئی گئی تھیں۔ سیڑھیوں کے اوپر والے دروازے میں سے افق میں چمکتے ہوئے سورج کی تیز روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ نور کا دریا تھا کہ نچلی سیڑھیوں تک بہتا چلا آ رہا تھا۔

یہ منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔

ملازم کی زبانی معلوم ہوا کہ بڑے سردار جی گھر ہی میں ہیں۔ وہ قدم بہ قدم سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ اوپر کے دروازے کے دائیں جانب سارا خاندان رہتا تھا اور بائیں طرف کا حصہ جو دو کمروں اور ایک صحن پر مشتمل تھا بڑے سردار صاحب کے لیے مخصوص تھا۔ بڑے حصے سے چھوٹے حصے تک ایک چوڑا راستہ تھا جس کے دونوں جانب پھولوں کے گملے دھرے تھے۔

بساکھا سنگھ اوپر پہنچا تو اس وقت سردار صاحب صحن میں چبوترے پر آسن بچھائے براجمان تھے۔ قریب ہی چوکی پر پانی کا لوٹا اور انگوچھا دھرا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی پاٹھ سے فارغ ہوئے ہیں— سورج افق تک پہنچا ہوا تھا اور بادل کا ایک ٹکڑا اسے اپنے دامن میں چھپا لینے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ آگے بڑھا تو سردار صاحب نے پاؤں کی آہٹ پا کر پیچھے کی جانب گھوم کر دیکھا۔ اس نے ست سری اکال کا نعرہ بلند کیا۔ سردار صاحب کی مونچھوں تلے ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ ’’آیئے آیئے بساکھا سنگھ جی، کہیے کیا حال ہے۔‘‘

’’کرپا ہے— اپنی کہیے۔‘‘

بڑے سردار صاحب نے سر پر لپٹی ہوئی چھوٹی دستار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ابھی ابھی رہ راس کا پاٹھ کیا ہے...... ذرا سامنے کے منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

منظر؟

بسا کھا سنگھ نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ اسے کوئی ایسا منظر دکھائی نہیں دیا۔ جس سے وہ بھی لطف اندوز ہوسکتا۔ گرد آلود فضا میں خستہ حال جلے بھنے مکانوں کے سلسلہ اور ان کی نیم تاریک غلیظ گلیوں میں حقیر کیڑوں کے مانند رینگنے والے دکھی انسانوں میں سے کوئی بھی ایسا منظر پیش نہیں کرتا تھا جس سے لطف اٹھایا جاسکے—— سچ مچ بڑوں کی باتیں بھی بڑی ہوتی ہیں۔

وہ اور قریب پہنچا تو سردار صاحب نے کمال مہربانی سے چوکی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کڑوی اور انگوچھا منڈیر پر رکھ کر چوکی پر بیٹھ جایئے۔''

بسا کھا سنگھ نے حکم کی تعمیل کی۔

اس نے اپنے گرد سے اٹے ہوئے بوسیدہ جوتوں کی جانب چھپی نظروں سے دیکھا اور گرد آلود ٹخنوں کو تہبند کے پلوؤں سے ڈھانپتے ہوئے پاؤں سمیٹ لیے۔

''واہگورو! واہگورو!!'' سردار صاحب کی گھنی مونچھوں میں سے آواز نکلی۔ ''دیکھیے سردار صاحب! کرتار کی لیلا بھی کیسی نیاری ہے...... میں دن رات سوچا کرتا ہوں کہ آخر یہ جگ مایا ہی تو ہے۔ یہ مکان، یہ زمین، یہ آرام بھوگنے کے سب سامان ایک روز دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ دھنیہ ہیں وہ لوگ جو روکھی سوکھی کھا کر بھی واہگورو کے نام کا سمرن کرتے ہیں۔ سورگ بھی تو اکال پرکھ نے ایسے ہی لوگوں کے لیے بنایا ہے۔ ہم لوگ تو گنہگار ہیں، پاپی ہیں۔ ہے واہگورو ہے واہگورو......''

اس کے بعد انہوں نے ایک گورو بھگت کی کتھا سنائی۔ وہ سادھو تھا۔ رام نام کا پیاسا۔ اس کا جی چاہا کہ کھیر کھائے۔ عقل نے کہا کہ مورکھ! تو سادھو ہے، سنیاسی ہے، تجھے ان چیزوں سے کیا تعلق؟ من نہیں مانا تو اس نے اپنی پریمی کے گھر جا کر کھیر کھائی۔ اتنی کھائی اتنی کھائی کہ من بس بس پکار اٹھا، لیکن اب بس کہاں۔ سادھو تو من کو سبق سکھانا چاہتا تھا۔

یہ کتھا سنا کر بڑے سردار صاحب نے مسکین صورت بنائی اور آنکھیں مٹکا کر

آسمان کی جانب دیکھا جو اس وقت خون کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔

پہلے جب بساکھا سنگھ ان کی یہ باتیں سنتا تو اس پر وجد طاری ہو جاتا تھا لیکن آج اسے یہ باتیں بڑی عجیب سی معلوم ہو رہی تھیں اور پھر سردار صاحب کی زبانی وہ اور بھی انوکھی معلوم ہوتی تھیں۔ بساکھا سنگھ پر یہ راز تو اب کھلا تھا کہ خالی پیٹ طویل پاٹھ کرنا تو رہا ایک طرف، انسان کے منہ سے ایک شبد' واگورو' تک نکلنا ناممکن ہے۔ اسے خیال آیا کہ اس شخص کے ماحول کے اجلے پن میں ہزارہا غریبوں کی تمناؤں کے خون کی سرخی بڑی چابک دستی سے چھپا دی گئی ہے۔

بڑے سردار کی باتوں کا سلسلہ جاری تھا۔

دھوئیں کے ستون بستی سے اوپر اٹھنا شروع ہو گئے تھے۔ وہ یکجا ہو کر بوجھل بادلوں کی صورت اختیار کر رہے تھے۔ کان کے بڑے حصے کی جانب سے سفید اور اجلی دیواروں کے سلسلوں میں سے ہنستے، کھیلتے، بولتے، چہکتے بچوں اور عورتوں کی نقرئی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

دفعتاً سردار صاحب بولے۔ " آیئے بساکھا سنگھ جی اندر چلیں۔ سردی بڑھتی جارہی ہے۔"

سردار جی کمرے کی طرف بڑھے۔ ان کے پیچھے چلتے ہوئے بساکھا سنگھ نے گھوم کر دیکھا کہ افق پر غروب ہوتے سورج کے سر پر بدلیوں کے چند ٹکڑے جل رہے ہیں اور خون سے لتھڑی ہوئے سنگین کی طرح آفتاب کی ایک طویل کرن مٹیالے آسمان کے سینے کے پار ہو گئی ہے۔

دو کمروں میں سے ایک میں گرو گرنتھ صاحب کا پرکاش کیا گیا تھا۔ اس کمرے میں موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ گورو گرنتھ صاحب اونچے چبوترے پر رنگین رومالوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ ان کے آگے دری پر بچھے ہوئے رومال کے دامن میں چند رنگین پھول دکھائی دے رہے تھے۔ مکھیاں جھلنے کی چوری کے سفید بال گھوڑے کی ایال کی طرح

ایک جانب کو لٹکے ہوئے تھے۔ دائیں بائیں چھوٹے چھوٹے گل دان اور ان میں باسی گھاس میں چند پھول اڑ سے دکھائی دے رہے تھے۔ چوں کہ بجلی ابھی وہاں نہیں آئی تھی۔ اس لیے ایک چھوٹا سا خوب صورت لیمپ چوکی پر دھرا تھا۔

بڑے سردار صاحب کا کمرا بھی بڑا تھا۔ فرش پر دری اور دری پر دو چھوٹے چھوٹے پرانے غالیچے بچھے تھے۔ سردار صاحب اجلے بستر پر بیٹھ گئے۔ سرہانے کے قریب رکھی ہوئی تپائی پر ایک بہت بڑا اور خوب صورت تیل کا لیمپ روشن تھا۔

بساکھا سنگھ کے لیے وہی جانا پہچانا ماحول تھا۔ ایک طرف دیوار پر گورو نانک صاحب کی بڑی سی تصویر تھی۔ جس میں وہ نام جپتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ آنکھیں بھگتی رس میں ڈوبی ہوئیں، ہاتھ میں مالا، نام خماری نانکا چڑھی رہے دن رین۔" انہوں نے لوگوں کی گاڑھی کمائی کا روپیہ نہیں کھایا تھا بلکہ انہوں نے سچا سودا کیا تھا جس پر باپ نے انہیں بری طرح پیٹا تھا۔ مذہبی واقعات کے متعلق اور بھی کئی تصاویر لٹکی تھیں۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ ڈریسنگ ٹیبل رکھا تھا جس پر کنگھے برش تیل کی شیشیاں بے ترتیبی سے دھری تھیں غالباً بچے انہیں وہاں بھول گئے تھے۔

سردار جی نے گاؤ تکیہ بغل میں دبایا اور قریب کی الماری میں سے سبز رنگ کی جلد والی ایک موٹی سی کتاب نکالی۔ اس میں مختلف بھگتوں کا کلام مع تشریح کے درج تھا۔ سردار جی نے بڑے انہماک سے کلام سنانا شروع کیا۔ بساکھا سنگھ کرسی پر بھونڈے انداز میں بیٹھا بظاہر سن رہا تھا لیکن درحقیقت اس کا ان چیزوں میں دھیان نہیں تھا بلکہ بعض اوقات خود سردار صاحب بھی پڑوس کے کمہار کے گھوڑوں کی ہنہناہٹ میں سطر بھول کر کہیں اور جا پڑے تھے۔

بالآخر یہ پروگرام ختم ہوگیا تو سردار صاحب نے کتاب بند کر کے تپائی پر رکھ دی۔ آسمان پر اکا دکا تارے جھلملانے لگے تھے۔

دفعتاً سردار صاحب بولے۔" آج میں نے ایک پستول خریدا ہے......"

"پستول؟" بساکھا سنگھ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"ہاں۔" یہ کہہ کر سردار صاحب الماری کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"وہ کیوں؟" بساکھا سنگھ نے تعجب سے پوچھا۔

سردار صاحب نے قدرے تامل کیا اور پھر ایک چپٹا ڈبہ نکال کر لائے۔ دیکھیے نا آج کل زمانہ بڑا خراب ہے۔ دنیا میں کسی کا کوئی دھرم ایمان ہی نہیں رہا۔ ہم یہاں رہتے تو ہیں لیکن ہمیشہ خوف دامن گیر رہتا ہے کہ کہیں اِدھر اُدھر کے اچکّوں میں سے کوئی گھر میں گھس آئے تو کیا ہو۔ واہگورو...... واہگورو...... آج کل تو لوگ خواہ مخواہ ہاتھا پائی پر اتر آتے ہیں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے پستول کی جھلک دکھائی۔ بساکھا سنگھ نے دیسی ساخت کے پستول تو دیکھے تھے لیکن اس قدر اچھا پستول دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔

سردار صاحب کہنے لگے۔ "یہ ویبلے کمپنی کا بنا ہوا ہے۔ بہت اچھی کمپنی ہے۔ اسٹینڈرڈ چیز ہے...... آٹو میٹک ہے...... اڑتیس بور ہے۔

بساکھا سنگھ چپ چاپ پستول کی جانب دیکھ رہا تھا۔

" آپ جانتے ہی ہیں آج کل زمانہ خراب ہے، کبھی وقت بے وقت اِدھر اُدھر آنا جانا پڑتا ہے۔ رات کو بھی اسے تکیے کے نیچے رکھ کر سویا جائے تو خاصی بے فکری سی محسوس ہوتی ہے۔"

بساکھا سنگھ نے گردن قدرے آگے بڑھا کر پوچھا۔ "کیوں جی اس کی قیمت کیا ہوگی؟"

سردار صاحب نے لاپرواہی سے کہا۔ "یہ تو سستا ہی مل گیا۔ ابی آج کل یہ چیز بالکل نایاب ہوگئی ہے۔ مجھے تو چودہ سو روپے میں مل گیا ہے۔"

"چودہ سو؟...... یعنی ایک ہزار چار سو میں......" یہ کہتے کہتے بساکھا سنگھ کا حلق خشک ہوگیا۔ اور اس کی آواز بھی پھنس کر رہ گئی۔

" یہ دیکھیے...... ادھر سے کارتوسوں کی میگزین اندر داخل کی جاتی ہے۔ آٹھ کارتوس ہوتے ہیں ایک میگزین میں۔ یکے بعد دیگرے آٹھ گولیاں چل سکتی ہیں۔"

بساکھا سنگھ نے دیکھنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ سردار صاحب نے پستول اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔" خیال رہے بھرا ہوا ہے۔ گھوڑا دبانے کی کسر ہے...... انگلی لبلبی سے دور ہی رہے......"

اس لوہے کے سرد ہتھیار کو پکڑتے وقت پہلے تو بساکھا سنگھ کا ہاتھ کپکپایا اور پھر اس نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اسے اِدھر اُدھر گھما کر دیکھا۔ پھر دستہ مٹھی میں لے کر انگلی لبلبی پر رکھ دی۔

سردار صاحب نے اک دم ہاتھ آگے بڑھایا۔" ارے چل نہ جائے......"

بساکھا سنگھ نے پستول والا ہاتھ فوراً پیچھے ہٹا لیا اور پھر اس نے دھیرے دھیرے سر اوپر اٹھایا۔ اس کے ہونٹوں پر موہوم سی مسکراہٹ پیدا ہو کر رفتہ رفتہ معدوم ہوگئی۔ اس کی آنکھیں راکھ کی طرح سیاہ اور بے کیف دکھائی دے رہی تھیں۔

سردار صاحب پیچھے ہٹ گئے۔ ان کے سر پر چھوٹی ململ کی زرد سی دستار لپٹی ہوئی تھی۔ داڑھی لٹک رہی تھی۔ آنکھوں سے سمجھ میں نہ آنے والی کیفیت ہویدا تھی۔ انہوں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ خاموش کیوں ہو، کیا تم سوچ رہے ہو کہ اگر اس وقت تمہارے دشمن تمہارے سامنے ہوں تو تم انہیں چنوں کی طرح بھون ڈالو؟"

" کون دشمن؟" بساکھا سنگھ نے بے رس آواز میں پوچھا اور پھر وہ سمجھ گیا کہ سردار صاحب کے اس اشارے کا کیا مطلب ہے۔

وہ اٹھ کر کرسی سے الگ کھڑا ہوگیا۔ اس نے بھاری آواز میں کہنا شروع کیا۔ صبح سے شام تک اپنی پیشانی سے ایڑی تک پسینہ بہانے والا کوئی شخص بھی میرا دشمن نہیں ہوسکتا۔ اب مذہب صرف دورہ گئے ہیں۔ ایک دوسروں کا خون چوسنے اور انہیں لوٹنے والوں کا مذہب اور دوسرا اپنا خون دینے والوں اور لٹنے والوں کا مذہب۔ اس کے علاوہ

اور کوئی مذہب نہیں ہے۔ آپ سمجھے...... آپ نہ معلوم کون سے گیان دھیان کی باتیں کرتے ہیں...... وہ باتیں میری سمجھ میں بالکل نہیں آتیں...... شاید اس لیے کہ میں بھوکا ہوں، میرے بچے بھوکے ہیں، میری بیوی بھوکی ہے...... میں زندگی کی چھوٹی چھوٹی ضرورت کے لیے ترستا ہوں......"

پھر وہ ایک دم چپ ہوگیا۔ اس نے دوبارہ چودہ سو روپے والے پستول کی طرف دیکھا اور نظریں سردار جی کی نظروں سے ملائیں۔

سردار جی ہڑ بڑا کر چار پائی سے اٹھ بیٹھے۔ تپائی کو دھکا لگا تو لیمپ نیچے گر پڑا...... تیل بہہ نکلا اور غالیچے کو آگ لگ گئی۔

بڑے سردار صاحب کے لیے باہر جانے کا راستہ بالکل بند تھا۔ راستے میں لمبا تڑنگا بسا کھا سنگھ کھڑا تھا، اس کے چوڑے شانے، مضبوط ٹانگیں، مچھلیوں والے بھرپور بازو، تنی ہوئی گردن، چوڑے چکلے ہاتھ...... یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس کے بدن میں نسوں کے بجائے فولاد کی تاریں کھینچ دی گئی ہیں...... مضبوط، مغرور، اٹل—— بڑے سردار صاحب دیوار سے چپکے کھڑے تھے۔ رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ سانس تیزی سے چل رہی تھی، پلپلا پیٹ نیچے اوپر ہو رہا تھا۔ پیشانی پر پسینے کی بوندیں پھوٹ پڑی تھیں۔ وہ اس قدر دہشت زدہ ہو چکے تھے کہ حلق میں سے کوئی آواز تک نہیں نکل پاتی تھی۔۔وہ بلٹ بنے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اجڈ کسان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

دفعتاً شور سا بپا ہوگیا۔ کمہاروں کے گدھے زور زور سے ہنہنانے لگے۔ ادھر سے ریل گاڑی گڑگڑاہٹ کا شور مچاتی پل پر سے گزر رہی تھی اور ادھر انجن اپنے پھٹکے ہوئے سینے سے مہیب چیخوں کی صدائیں فضا میں بکھیر رہا تھا......

غالیچے کو لگی ہوئی آگ لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی......

یہ افسانہ افسانوی مجموعہ 'پہلا پتھر' میں شامل ہے۔

بازگشت

4/ جون 1923 کی شام کو طوفان میل تپتی ہوئی پٹریوں پر اندھا دھند گجرات کی جانب چلی جا رہی تھی۔

منیر احمد انٹر کلاس کے ڈبے میں خاموش اور بے حس بیٹھا تھا۔ گرد، کوئلے کے ذروں اور لو سے بچنے کے لیے اس نے سامنے کی کھڑکی کا موٹا شیشہ اوپر کو چڑھا دیا تھا۔ شیشے میں سے پیلا آسمان، پھیلے ہوئے کھیت اور درختوں کے جھنڈ گھومتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

ڈبے میں بہت کم لوگ تھے۔ کچھ لوگ باتیں کر رہے تھے۔ بیشتر دھوتی کے پلو یا کسی اخبار سے پنکھا جھلتے ہوئے اونگھ رہے تھے۔ ان کی کن پٹیوں اور ٹھوڑیوں پر پسینے کی بوندیں جھلک رہی تھیں۔

منیر احمد ایک منحنی سا پستہ قامت شخص تھا۔ اس کے چہرے کی بناوٹ چھوہارے کی مانند تھی۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور چمک سے خالی۔ ہاتھ پر چوہے کے پنجوں کی طرح بالکل ہلکے پھلکے، انگلیاں پتلی پتلی، ہاتھوں کے پیچھے کی رگیں ابھری ہوئیں۔ وہ صورت سے ایک سادہ لوح اور کمزور طبیعت شخص نظر آتا تھا۔ چہرے سے کسی قسم کے شدید جذبات کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ زندگی میں جو کچھ اسے پیش آ چکا تھا وہ اس سے اب ایک

قسم کا سمجھوتہ کرچکا تھا۔

1912 میں ڈاکٹری پاس کرنے کے بعد اس نے لاہور میں پریکٹس شروع کردی تھی۔ لیکن ان میں اسے ذرہ برابر بھی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس پیشہ میں انسان کی شخصیت اور اس کی چرب زبانی ہی سے لوگ زیادہ تر متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن منیر احمد نہ صرف اپنے فن میں کچھ کچا تھا بلکہ اس کی زبان پر بھی تالہ پڑا ہوتا تھا۔ مریض کو دیکھ کر وہ گھبرا جاتا تھا اور مریض اس کی گھبراہٹ دیکھ کر پریشان ہوجاتا تھا...... وہ مریض کی کلائی ہاتھ میں لے کر اس قدر احمقانہ انداز سے آنکھیں جھپکاتا کہ مریض کو پورا یقین ہوجاتا کہ ڈاکٹر کو مرض کا پتہ نہیں چلا۔ اس کی شخصیت تو کچھ بھی نہیں تھی۔ یہ بھی کس قدر عجیب بات ہیکہ لوگ موٹے تازے ڈکٹر کو دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ وہ واقعی قابل ہے اور اگر کہیں منیر احمد جیسے شخص کو دیکھ پائیں تو بس یہی سمجھتے ہیں کہ یہ ڈاکٹر تو خود ہی زندہ درگور ہے۔ ہمارا علاج کیا کرے گا۔

گاؤں میں اس کے بوڑھے والدین رہتے تھے۔ جنہوں نے عمر بھر کی کمائی اس کی تعلیم پر صرف کردی تھی اور وہ اس پر خوش تھے۔ اگرچہ نقد روپیہ بیٹے کی تعلیم پر خرچ کر چکے تھے۔ لیکن ان کی کچھ آبائی زمین بھی تھی۔ ایک مربہٹ تھا۔ کچی اینٹوں کا ایک مکان تھا۔ پھر ان کا لڑکا ڈاکٹر بن کر روپیہ بھی کما رہا تھا۔ ہر چند منیر احمد کی پریکٹس سو روپیہ ماہوار سے کبھی تجاوز نہیں کرتی تھی اور لاہور جیسے شہر میں اتنی کم پریکٹس کچھ بڑی حوصلہ افزا نہیں تھی۔ لیکن اس کے والدین کو کوئی شکایت نہ تھی۔ وہ ہر مہینے ایک روز کے لیے اپنے گاؤں چلا جاتا اور ساٹھ ستر روپیہ نقد اپنے باپ کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ اس کی ماں اس دن پھولی نہ سماتی۔ ہنس ہنس کر پڑوسنوں سے باتیں کرتی۔ اس کا باپ اپنا روپیہ لوہے کی ایک الماری میں رکھا کرتا تھا۔ منیر چاہتا تھا کہ کل رقم بنک میں جمع رہے۔ لیکن چونکہ اس کا باپ پرانے خیال کا آدمی تھا۔ اسی لیے وہ اپنے باپ کا دل نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ گاؤں والے اس بات سے بالکل بے خبر تھے کہ منیر احمد ساٹھ روپیہ ماہوار گھر والوں کو لا کر دیتا ہے کیونکہ جب کبھی منیر احمد گاؤں میں آتا تو کوٹ پتلون پہنے اور ٹائی لگائے ہوتا۔ ان دنوں ہیٹ اور انگریزی کپڑے کبھی کبھار ہی دیکھنے میں آتے تھے۔ اس

لیے کھیتوں میں کام کرنے والے ناواقف لوگ اسے کوئی بڑا افسر سمجھ کر سلام بھی کردیا کرتے تھے۔

منیر احمد کے اخراجات بہت کم تھے۔ آٹا، گھی، شکر اور ستو وغیرہ تو گھر ہی سے لے جاتا تھا۔ دیگر اخراجات کی میزان چالیس روپے ماہوار سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ البتہ کوٹ اور پتلون وہ ضرور پہنتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر وہ انگریزی کپڑے پہننا بھی ترک کردے تو لوگ اسے بالکل نٹ پونجیا ہی سمجھنے لگیں گے۔

1914 میں جنگ شروع ہوگئی۔ 1915 میں وہ دوستوں کے کہنے سننے سے فوج میں ملازم ہوگیا۔ ڈاکٹری پاس نوجوانوں کی فوج میں اشد ضرورت تھی اور پھر منیر احمد کا تین سالہ عملی تجربہ بھی اس کی قابلیت کا ایک بین ثبوت تھا۔ فوج میں نوکر ہونے کے بعد جب وہ وردی پہن کر گاؤں میں پہنچا تو اس کا باپ بھونچکا سا رہ گیا۔ اس نے سمجھا کہ بیٹا کوتوال بن گیا ہے۔ منیر احمد نے ہر ممکن طریقہ سے باپ کو اپنا رینک سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن باپ نے اس کی باتوں کی طرف کچھ دھیان ہی نہیں کیا۔ اسے یقین تھا کہ چونکہ اس کے بیٹے کے اختیارات اب بہت وسیع ہوگئے ہیں۔ اس لیے گاؤں کے لوگ ان سے دب کر رہیں گے۔

وہ فروری میں بھرتی ہوا اور مئی میں اسے سمندر پار جانے کا حکم ملا۔ اس کی ماں تو رو رو کر ہلکان ہوگئی۔ یہاں تک کہ اس کے چلے جانے کے بعد جلد ہی مرگئی اس کی شادی کو بھی زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا۔ 1915 کے اخیر میں اپنے باپ کی ایک چٹھی فرانس میں ملی کہ اس کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی اور اس کی بیوی جانبر نہ ہوسکی۔

صوبے دار میجر منیر احمد چپ چاپ بیٹھا، کھڑکی کے شیشے میں سے چکر کھاتے ہوئے کھیتوں اور بجلی کے کھمبوں پر بیٹھے ہوئے گدھوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شام ہوچکی تھی۔ وہ وزیر آباد سے آگے نکل آئے تھے۔ معاً اس کے ابرو ملنے لگے۔ اب گاڑی ایسے

مقامات کے قریب سے ہو کر گزر رہی تھی۔ جن سے وہ بخوبی واقف تھا۔ وہ ان بل کھاتی ہوئی نہروں پر نہانے کے لیے جایا کرتا تھا۔ کسی پیر صاحب کا ٹوٹا پھوٹا مقبرہ بھی نظر آرہا تھا۔ اس کے قریب ایک مسجد بھی تھی۔

گاڑی منڈی ڈھگران کے اسٹیشن پر رکے بغیر ہی آگے بڑھ گئی۔ اس چھوٹے سے اسٹیشن سے ان کا گاؤں ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ پہلے جب وہ لاہور سے آیا کرتا تو پسنجر ٹرین اسے اسی اسٹیشن پر اتار دیتی تھی۔ اس وقت بھی ببول کے درختوں میں سے مکانات کا مدھم سا خاکہ نظر آرہا تھا۔ اسٹیشن سے نصف میل کے فاصلے پر ان کا اپنا رہٹ تھا۔ اپنے رہٹ پر نگاہ پڑتے ہی وہ بے چین سا ہو گیا۔ وہ دور ہی سے ان مقامات کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ وہ اپنے رہٹ سے اس قدر اچھی طرح واقف تھا کہ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اسے معلوم ہو گیا کہ کون سا درخت کٹ چکا ہے۔ کون سی دیوار گرا دی گئی ہے اور کون سی نئی دیوار تعمیر کر دی گئی ہے۔ اس طرف گنے پیلنے کا بیلن تھا۔ زمین میں گڑے ہوئے بیلن کے قریب ایک طرف کو بڑھی ہوئی چھوٹی سی دیوار تھی۔ اسی دیوار کے قریب اس نے پہلی مرتبہ اپنی ہونے والی بیوی کا منہ چوما تھا۔

جب وہ لاہور میں پریکٹس کرتا تھا تو ایک مرتبہ گاؤں میں ایک عزیز کی شادی کے موقع پر اسے زیادہ دنوں کے لیے دکان بند کر کے گاؤں جانا پڑا اور جب وہ گھر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ان کے ہاں ایک خوبصورت جوان لڑکی بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ اسے پہچان نہ سکا۔

اس کی ماں کہنے لگی۔ ''ارے بیٹا! '' تو ڈاکٹر ہو گیا ہے اور پھر اسے نہیں پہچانتا۔''

منیر احمد کو بعض اوقات ماں کی باتیں بڑی بے تکی معلوم ہونے لگتی تھیں۔ اس کی ماں نے اس پر بس نہیں کی بلکہ وہ باتیں بناتی ہی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ وہ لڑکی ہنسنے لگی۔ منیر پہلے ہی کھسیانہ ہو رہا تھا اور پھر اس کی ماں...... اس نے لڑکی کی طرف دیکھا تو اس کی ہنسی بند ہو گئی۔ اس نے اپنے دونوں ہونٹ خوب اچھی طرح بھینچ لیے شاید لڑکی پر اس کی ٹائی کا رعب جم گیا تھا۔

وہ اس کے حقیقی پھوپھا کی لڑکی بیگماں تھی۔

بیگماں قد آور اور مضبوط ہاتھ پاؤں کی لڑکی تھی۔ اس کا جسم اچھی صحت کی وجہ سے ذرا بھاری ضرور تھا۔ لیکن بے ڈول اور ڈھیلا ڈھالا نہ تھا۔ اپنے گھر کا سارا کام کاج وہی کرتی تھی۔ آٹا پیسنا، چرخہ کاتنا، روئی دھنکنا، گائے بھینس کے لیے سانی کرنا، کھیتوں پر بھائیوں کے لیے کھانا لے جانا، رہٹ سے پانی کی تین تین گاگریں ایک ساتھ بھر کر لانا اور اس پر اچھی غذا اور کھلی ہوا۔ نتیجہ یہ تھا کہ وہ شہر کی زرد رو نازک بدن، پتلی سینہ سپاٹ لڑکیوں کے برعکس خوب بھرے ہوئے جسم کی گل رخ اور تنومند لڑکی تھی..... کم از کم منیر احمد کو وہ بہت پسند تھی۔ لیکن ایسی لڑکی سے محبت کا سوال لازماً پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔

پہلے دن بیگماں ہی نے اسے کھانا کھلایا۔ وہ چارپائی پر سر جھکائے بیٹھا کھاتا رہا۔ پھر بیگماں اس کی طرف دیکھ کر مسکراتی تھی اور وہ خفت مٹانے کے لیے دیکھتا تھا۔

جب وہ اکیلا ہوتا اور بیاہ والے گھر سے لڑکیوں کے ڈھولک بجانے اور گیت گانے کی آوازیں سنائی دیتیں تو بیگماں، نہ معلوم کہاں سے آن پہنچتی۔ گھر میں اس طرح گھومتی جیسے کوئی چیز ڈھونڈ رہی ہو۔ کبھی کھونٹی سے نئی رنگی ہوئی چادریا اتار کر سر پر ڈال لیتی۔ کبھی لکڑی کی چوکی پر بیٹھ کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر پاؤں دھونے لگتی۔ کبھی کبھی چپہ بھر روٹی نمکین چھاچھ کے ساتھ کھا لیتی غرض کسی نہ کسی بہانے سے گھر پر ضرور آتی اور کسی نہ کسی حیلے سے اس سے بات بھی ضرور کرتی......

ایک روز رات کے وقت جب کہ صحن میں دیا جل رہا تھا۔ سب لوگ کھانا وانا کھا کر بیاہ والے گھر جانے کو تیار تھے۔ منیر احمد جھک کر جوتا پہن رہا تھا کہ اس کی پیٹھ پر ایک کنکر آن لگا۔ اس نے گھوم کر دیکھا تو بیگماں نے شرارت سے مسکراتے ہوئے منہ دوسری طرف کر لیا تھا۔

اسی طرح بے تکلفی ہو گئی۔ ایک دوسرے پر کنکر پھینکے جانے لگے۔

ایک شام کے وقت وہ اپنے رہٹ پر گیا۔ اس کا باپ بیاہ والوں کے کام میں

پھنسا ہوا تھا۔ یہ شام کا وقت تھا۔ رہٹ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ وہ تہمد باندھے سیاہ پمپ شو پہنے رہٹ کی گدی پر بیٹھا تھا اور دل ہی دل میں اپنے اس عشق پر غور کر رہا تھا اور آخر بیگماں کی ان شرارتوں اور ہنسی مذاق کی تہہ میں کیا راز تھا۔ شاید یہ سب معصوم شرارتیں ہوں۔ بچاری سیدھے سادھے مزاج کی ہنسوڑ لڑکی ہے۔ یونہی دل بہلاوے کے لیے چہل کرنے لگتی ہوگی۔ وہ کس قدر مضبوط قد آور اور حسین لڑکی تھی۔ اس کے مقابلے میں وہ پست قامت دبلا پتلا اور بدصورت نہ سہی تو خوب صورت تو ہرگز نہیں ہے۔ اس نے سنا تھا کہ گاؤں کی لڑکیاں سیدھے سادے مزاج کی ہوتی ہیں۔ ظاہری ٹیپ ٹاپ پر ریجھ جاتی ہیں۔ ممکن ہے بیگماں کو اس سے محبت ہوگئی ہو...... اس کا دل دھڑکنے لگا...... بیگماں کے جسم کے لمس کا تصور ہی کس قدر سرور آفریں تھا جب کبھی وہ اس سے چھو جاتا تو اس کے جسم میں سر سے پیروں تک سنسناہٹ پھیل جاتی...... بیگماں کا جسم شراب کے ایک لبریز پیمانے کی طرح چھلکا جاتا تھا۔

اتنے میں اسے ایک کنکر آن کر لگا۔

اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس نے گھوم کر دیکھا کوئی بھی صورت نظر نہ آئی۔ اس نے مسکرا کر منہ پھیر لیا۔ وہ حیران تھا کہ بیگماں اتنی دور کیسے چلی آئی...... معاً دوبارہ کنکر لگا۔ اس نے فوراً سر گھما کر دیکھا اور کچی دیوار کی آڑ میں اسے چوڑیوں والی کلائی کی جھلک دکھائی دی۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا۔ اتنے میں ادھر سے تیسرا کنکر مارنے کے لیے ہاتھ اٹھا...... بیگماں نے نشانہ باندھنے کے لیے جھانک کر دیکھا اور ایک دم سامنے دیکھ کر اس نے مسرت کی ایک چیخ ماری اور بھاگ کر دور جا کھڑی ہوئی۔ رہٹ کے اردگرد وہ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے پھرے۔ بیگماں چیخ چیخ کر ہنس رہی تھی۔ طویلے کی ایک دیوار ذرا آگے کو بڑھی ہوئی تھی۔ بیگماں منیر کو چکر دے کر اس دیوار کے پیچھے چھپ گئی۔ منیر دبے پاؤں بڑھا تو بیگماں اس کی جانب سے بے خبر دیوار کی دوسری طرف تاک لگائے کھڑی تھی۔ اس کی چندریا کندھوں پر گری ہوئی تھی۔ پیٹھ دیوار

سے لگی تھی اور دونوں ہاتھ دیوار پر ٹکے ہوئے تھے۔ گھنے بالوں کے ساتھ بندھا ہوا لمبا چٹلا پنڈلیوں کے اوپر جھول رہا تھا۔ اس کا دم پھولا ہوا تھا۔ چھاتیاں نیچے اوپر ہو رہی تھیں...... منیر چپکے سے قدم ناپتا ہوا پہنچا اور ایک دم اس نے اپنے دونوں ہاتھ بیگاں کے دونوں طرف دیوار پر ٹیک دیئے اور اسے گھیرے میں لے لیا...... وہ چونک کر چیخی اور پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ اس وقت وہ کس قدر خوش تھی۔ رہٹ کے اس خاموش گوشے میں دیوار کے ساتھ لگی ہوئی بیگاں...... اس کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ گال تمتمائے ہوئے تھے۔ آنکھیں چمک رہی تھیں۔ نہ معلوم اس وقت منیر احمد نے اس کی طرف کن نظروں سے دیکھا کہ اس کی شوخی شرم میں تبدیل ہو گئی اور وہ آنکھیں جھکا کر زمین کی طرف دیکھنے لگی۔

ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ صرف پیپل کے گھنے درخت کی کھوکھ میں طوطے پھڑپھڑا رہے تھے۔

شدت جذبات سے منیر احمد کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ "بیگاں!.........." اس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔

بیگاں نے آہستہ سے اوڑھنی کو سنوار کر سر ڈھانپتے ہوئے ایک اچٹتی سی نگاہ منیر پر ڈالی۔ تو اس کے رخسار شفق زدہ ہو گئے۔ وہ زمین کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ "مجھے جانے دیجئے۔"

منیر احمد اپنی دونوں ہتھیلیاں دیوار پر ٹکائے کھڑا تھا۔ بیگاں نے حرکت کی۔ لیکن منیر کی پتلی پتلی بانہیں اسے گھیرے میں لیے ہوئے تھیں۔ وہ ان کی طرف ایسے دیکھنے لگی جیسے یہ لوہے کے حلقے ہوں جنہیں ہٹا دینا اس کی طاقت سے باہر تھا۔

منیر نے بڑی نرمی سے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور بڑی بے تابی سے اس کا رخسار چوما...... بیگاں زمین کی طرف دیکھتی رہی۔ اس نے اپنا منہ چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے رخسار خون کی حدت سے اور بھی گرم ہو گئے۔ منیر نے چند ٹوٹے پھوٹے کلمے کہے اور بار بار اس کے ہونٹ چومنے لگا۔ بیگاں نے جسم ڈھیلا چھوڑ

دیا...... کتنی زندگی تھی۔ اس جسم میں، کس قدر انوکھا سرور تھا...... وہ اسی طرح ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر نہ معلوم کتنی دیر تک کھڑے رہے۔

انجن سیٹیاں دیتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اس کے رہٹ کا وہ منظر آنکھوں سے اوجھل ہوتا جا رہا تھا...... محبت کے اس آغاز کا انجام بھی اچھا ہوا۔ ان دونوں کی شادی ہوگئی ابھی وہ آٹھ ماہ کے قریب ہی ایک ساتھ رہ چکے تھے کہ اسے ہندوستان سے باہر جانا پڑا۔ اسے ایک ٹانگ جنگ کے دیوتا کی بھینٹ کرنی پڑی...... اس کے چلے جانے کے بعد اسے اپنی بیوی کی ایک چٹھی موصول ہوئی جس میں اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں لکھا تھا۔ وہ اس کے بغیر بہت اداس رہتی ہے۔ خواب میں اس کی صورت دیکھتی ہے...... لڑکی پیدا ہوئی تو اس کی بیوی مرگئی۔ جب اسے اس بات کی اطلاع ملی تو وہ رو پڑا اور اس پر اس کا اس قدر شدید اثر پڑا کہ اس کے اعصاب کمزور ہوگئے اور وہ زندگی سے اس قدر بیزار ہوگیا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد بھی واپس آنے کو اس کا جی نہ چاہتا تھا۔ اس نے باپ کو لکھ دیا کہ اپنی پوتی کا خیال رکھے۔ دو سال پہلے جب وہ قاہرہ میں تھا تو معلوم ہوا کہ اس کا باپ بھی فوت ہوگیا ہے۔ اس کے بعد عزیزوں کے پے در پے خطوط آنے لگے کہ اس کا چچا اس کی زمین کی ساری آمدنی بٹور رہا ہے۔ اس کی بچی کی پرورش بھی بے پروائی سے ہو رہی ہے۔

آخر کار اس نے وطن کا رخ کیا۔

اس کی زندگی میں بے کراں مسرت چھپر پھاڑ کر داخل ہوئی تھی۔ کیا وہ خواب میں بھی خیال کرسکتا تھا کہ وہ اس قدر خوب صورت اور محبت کرنے والی بیوی کا شوہر بنے گا۔ وہ اس سرور اور لذت کو جو اسے اپنی بیوی سے حاصل ہوئی تھی۔ مرتے دم تک نہیں بھلا سکتا تھا۔ یہ اس کی خوش بختی کی دلیل ہی تو تھی کہ ایسی سرور انگیز اور البیلی بیوی اسے حاصل ہوئی۔ لیکن ابھی اس نے جام لبوں سے لگایا ہی تھا کہ ہاتھ سے چھوٹ کر ریزہ ریزہ ہوگیا۔ اب اس کی زندگی اس قدر بے کیف بلکہ تلخ ہوگئی تھی کہ اگر اسے اپنی

ننھی بچی کا خیال نہ ہوتا تو وہ کبھی کا خودکشی کر لیتا...... باقی زندگی اب وہ اس بے پایاں مسرت اور سراپا نازکی یاد ہی میں بسر کر سکتا تھا۔ وہ ایک ٹانگ سے لنگڑا بھی ہو چکا تھا۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ وہ دوسری شادی کر لے۔ لیکن اب اسے کوئی خوب صورت لڑکی پسند نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے شکست قبول کر لی تھی۔ اب وہ اپنی زندگی اسی طرح بسر کرنے پر مطمئن تھا۔ اس کا خیال تھا کہ آبائی زمین بیچ کر وہ دنیا سے الگ تھلگ کسی پر سکون گوشہ میں پڑ رہے زندگی کی گہما گہمی سے اسے کچھ بھی دلچسپی باقی نہ رہی تھی۔

ڈبے میں ہلچل پیدا ہوگئی۔ گاڑی گجرات کے نزدیک پہنچ رہی تھی۔ شہر کے نواح میں اسے وہ سب مکانات اور درخت اور چھوٹی موٹی دکانیں یاد تھیں۔ ایک عرصہ دراز کے بعد وہ واپس آ رہا تھا۔ ہر چیز پہلے ہی کی طرح تھی۔ مگر اس کے باوجود اس کی اپنی زندگی میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو چکا تھا۔ ایک سرے سے نقشہ ہی بدل چکا تھا۔

گاڑی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پلیٹ فارم پر رک گئی۔ باہر کے لوگوں نے اندر کی طرف ہلہ بول دیا اور گاڑی کے اندر کے لوگ باہر کی طرف لپکے۔ خیر اس کے ڈبے میں افراتفری نہیں پیدا ہوئی تھی۔ باہر سے دو قلی آئے۔ اسے وردی پوش دیکھ کر اس کا سامان اٹھایا اور وہ بغلوں میں بیساکھیاں دبائے باہر نکلا اور قلیوں کے ساتھ جب پھاٹک سے باہر آیا تو اس نے گاؤں کو جانے والے کسی تانگے کے لیے نگاہ ادھر اُدھر دوڑائی۔ ایک شخص کی زبانی معلوم ہوا کہ تانگہ ابھی واپس نہیں گیا، بازار سے آنے ہی والا ہے۔

منیر احمد نے سامان ایک دکان پر رکھا اور دکاندار سے کہہ دیا کہ جب تانگہ آئے تو اس کا سامان اس میں رکھوا دے۔ پھر وہ بازار کی طرف چلا گیا۔ اس نے سوچا کہ تھوڑی دیر سیر ہی کر لے۔ شہر اسٹیشن سے کافی فاصلے پر تھا۔ راستے میں ہر شے سے وہ مانوس تھا۔ بازار میں وہی پرانی دکانیں اور چہل پہل تھی۔ جا بجا کمہاروں کی دکانیں خوب صورت صراحیاں، گھڑے، پیالے، ہانڈیاں، کوزے، کونڈے...... ہر چیز جانی پہچانی ہوئی تھی۔ وہی اجڈ لوگ، وہی غلیظ بازار، ہر طرف گرد و غبار، لمبے لمبے پٹوں والے

جوان۔ وہ تانگے سے اتر کر دونوں بیساکھیوں کے سہارے بازار کے کنارے پر کھڑا ہوگیا۔ اس کے خشک ہونٹوں پر ایک موہوم سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ جب اس نے چنوں کا خوانچہ دیکھا تو دامنِ صبر ہاتھ سے جاتا رہا۔ مسالے میں لت پت چنوں سے لبریز پرات بیچ بیچ میں ہری مرچیں، پیاز کے قتلے ٹھسے ہوئے اس نے دو پیسے کے چنے لیے اور ان پر لیموں نچوڑ کر پتے کے چمچے سے انہیں کھانے لگا۔

اس کے بعد وہ ادھر اُدھر گھومتا رہا۔ اسے کپڑوں کے چند ٹکڑے پسند آئے تو اس نے اپنی بچی کے لیے خرید لیے۔ چچا کے بچوں کے لیے ریوڑیاں اور چڑ وے لیے اور پھر تانگہ پر سوار ہو کر جب اسٹیشن پر پہنچا تو ان کے گاؤں کا تانگہ جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

کھیتوں کے بیچ میں سے ہو کر تانگہ ناہموار کچی سڑک پر ہچکولے کھاتا ہوا چلا جارہا تھا۔ منیر احمد اپنے خیالات میں غلطاں تھا۔ دل پر اداسی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔

اسی طرح سوچتے سوچتے اسے اپنی بچی کا خیال آیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اپنے ذہن میں اس کا کیسا تصور باندھے۔ شاید لڑکی اپنی ماں کی طرح خوب صورت ہو یا خود اس کی طرح کمزور، بے ڈول اور معمولی صورت والی۔ راستے میں دوسری سواریوں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ سواریاں اگلے گاؤں کی تھیں اور تانگہ والا ایک نوجوان لڑکا تھا۔ جو اس سے واقف نہیں تھا۔

آخر تانگہ اس کے چھوٹے سے گاؤں تک جا ہی پہنچا۔ اس نے تانگہ والے کو پیسے دیئے تو گاؤں کے باہر موچیوں کے لڑکے اس کے گرد جمع ہوگئے۔ چند بڑے بوڑھے بھی ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ چماروں کے لڑکوں میں سے ایک نے اس کا سامان اٹھایا اور وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ قاہرہ کے عظیم الشان اور بارونق قہوہ خانوں کے بعد یہ تنگ گلیاں کچھ عجیب سی معلوم ہو رہی تھیں۔

اپنی گلی میں پہنچ کر اس نے اپنے مکان کے دروازے پر نگاہ ڈالی۔ دروازہ بند

تھا۔ غالباً جب سے اس کا باپ مرا تھا۔ تبھی سے بند ہوگا۔ دروازے کے آگے کچے چبوترے پر کچھ ٹھیکریاں اور سوکھے ہوئے پتے گرے پڑے تھے۔

ساتھ والا مکان اس کے چچا کا تھا۔ اس نے اندر داخل ہو کر آواز دی۔ اس کا چچا حقہ اٹھائے ہوئے باہر آیا۔ پہلے چند لمحوں تک تو اس نے اسے پہچانا ہی نہیں۔ ایک تو تفکرات کی وجہ سے منیر کی صورت بدل گئی تھی، دوسرے اب وہ ایک ٹانگ سے لنگڑا بھی ہو چکا تھا لیکن اس نے اپنے چچا کو پہچان لیا تھا۔ اس کا چچا قد آور سرخی مائل، سیاہ رنگ کا ایک گرانڈیل شخص تھا۔ اس نے کہا۔ "چچا! میں منیر احمد ہوں۔ پہچانا نہیں کیا۔"

چچا کے ہاتھ سے حقہ چھوٹ گیا۔ دونوں بغل گیر ہو گئے۔ چچا اس کا ہمدرد اور خیر خواہ تھا۔ لیکن اس کی چچی بڑی زمانہ ساز عورت تھی۔ وہ بھی آواز سن کر آ گئی اور دعائیں دے دے کر وہی حسب معمول ادھر اُدھر کی باتیں بنانے لگی۔ پھر وہ گڑ کا شربت بنانے کے لیے اندر چلی گئی۔ منیر زیادہ دیر تک ضبط نہ کر سکا۔ اس نے فوراً اپنی بچی کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ چچا نے کہا کہ بچے باہر کھیلنے گئے ہوئے ہیں دیکھتا ہوں شاید وہ گھر ہی میں ہو۔

تھوڑی دیر بعد چچا کی آواز آنے لگی۔ "چلو بیٹا! تمہارے ...آئے ہیں۔"

وہ آگے بڑھا اور پھر رک گیا ــــ دروازے میں ایک میلی کچیلی، دبلی پتلی، بکھرے ہوئے بالوں والی زرد رو خوب صورت بچی کھڑی تھی۔ منیر احمد نے ایک لمحہ کے لیے سکوت کیا۔ وہ اس کی بچی تھی ــــ اس کی آنکھیں بڑی تھیں۔ بھنویں نہایت حسین خم کھائے ہوئے، گالوں کی ہڈیاں کمزوری کی وجہ سے کچھ ابھر آئی تھیں۔ بچی اسے دیکھ کر خوش نہیں ہوئی، بلکہ وہ اداس، بے حرکت اور چپ چاپ کھڑی رہی۔

منیر احمد بیساکھیاں ٹیکتا ہوا آگے بڑھا۔ چچا نے لڑکی کو اٹھا کر اس کے بازوؤں میں دے دیا۔ منیر احمد نے اپنی بچی کو گلے لگا کر ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ دیے۔ چچا شربت لینے کے لیے اندر چلا گیا، اور وہ اسے اسی طرح گلے سے لپٹائے کھڑا رہا۔

"میری بچی...... میری بچی!"

اس کے جسم کی تکان دور ہوگئی۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے دم کر کے اس کے تمام دکھ جسم سے باہر کھینچ لیے ہوں۔ خوشی اور اطمینان کی لہر اسے اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے ناخنوں تک محسوس ہوئی۔ وہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے بچی کی طرف دیکھا۔ بچی کی آنکھوں میں مسکراہٹ کھیل رہی تھی...... ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گھر میں اسے پیار کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ نہ معلوم گھر والوں کا اس کے ساتھ کیسا سلوک تھا۔ بچی کی آنکھوں کے تلے گڑھوں کی گہرائیوں میں ایک ایسی اداسی تھی جسے بھانپ کر منیر احمد کا دل بھر آیا۔

اس کے دل میں چچا کے خلاف ایک شکایت تھی لیکن وہ اسے زبان پر نہ لایا۔ چچا نے شربت کا لوٹا اور گلاس ایک اسٹول پر رکھ دیا...... اتنے میں گلی کے لوگ بھی جمع ہوگئے۔ وہ لوگ جو پہلے اس کے بے تکلف دوست تھے اسے جھک جھک کر سلام کرنے لگے۔ ان میں سے بہتوں نے اسے پہچانا ہی نہیں۔ وہ اسے پولیس کا کوئی افسر سمجھ بیٹھے۔ اِدھر اُدھر کے بچے بھی جمع ہوگئے اور جب انہوں نے آشاں کو ایک باوردی آدمی کی گود میں بیٹھے ہوئے دیکھا تو وہ بہت مرعوب ہوئے اور ننھی بچی کو بھی اس بات کا احساس ہوگیا کہ اب وہ اپنے باپ کی گود میں ہے۔

جب منیر احمد کو شربت کا گلاس دیا گیا تو اس نے پہلے بچی کے منہ سے لگا دیا۔ بچی نے اس کے گلے میں حمائل کردہ بازوؤں کی گرفت کو اور بھی تنگ کرتے ہوئے انکار کے طور پر سر ہلا دیا۔ اس کا منشا تھا کہ پہلے اس کا باپ شربت پی لے۔ وہ ایک ذہین بچی تھی۔ منیر نے پچکار کر کہا۔ "نہیں بیٹا پیو...... شاباش، شاباش......

تھوڑی دیر کے بعد چچا کے بچے بھی آگئے۔ منیر نے ریوڑیوں اور لڈوؤں کی ٹوکری ان کے حوالے کردی۔ تھوڑی دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے اپنے گھر کی چابیاں طلب کی اور اپنی بچی کو گود میں اٹھائے ہوئے گھر کی طرف گیا۔ باہر

کا تالا کھولا اور ڈیوڑھی میں داخل ہوا اور دو قدم بڑھ کر ٹھٹکا اور پھر ایک منظر بجلی کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے کوند گیا— جب اسے ہندوستان سے باہر جانے کا حکم ملا تو چونکہ مہلت بہت کم ملی تھی۔ اس لیے وہ بھاگم بھاگ گھر والوں سے ملنے کے لیے ایک ہی دن کے لیے آیا تھا۔ سارا دن ضروری سامان باندھنے میں لگے رہے۔ پھر گئی رات تک آپس میں باتیں ہوتی رہیں۔ اس کی ماں ساری رات روتی رہی— بیوی سے کھل کر باتیں کرنے کے لیے وقت ہی نہ ملا۔

دوسرے دن روانہ ہونے سے پہلے اس کا سامان تانگہ پر رکھ دیا گیا۔ وہ اسی ڈیوڑھی میں بیٹھا تھا۔ قریب ہی اس کی ماں بیٹھی روئے جارہی تھی۔ اس نے اسے تسکین دینے کی کوشش کی۔ لیکن اس بڑھیا کے تو حواس ہی قائم نہ رہے تھے۔ پھر نہ معلوم وہ کس کام سے اٹھ کر گلی کی طرف چلی گئی۔ اتنے میں بائیں ہاتھ والے دروازے سے اس کی بیوی اندر داخل ہوئی۔ وہ منظر اس کے ذہن میں نقش ہو کر رہ گیا۔

اس وقت اس کی محبوب بیوی کی سرگیں آنکھوں کے گوشوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ وہ باریک ململ کی سیاہ رنگ کی قمیص پہنے ہوئے تھی۔ قمیص کے نیچے جالی دار بنیائن تھی۔ اس کی چنچل لچک دار کمر کے دونوں خطوط جوں جوں اوپر اٹھتے تھے توں توں کشادہ ہوتے جارہے تھے۔ اس کا انگیا کی ضرورت سے بے نیاز سینہ کس قدر دل فریب تھا۔ سر ڈھانپنے کے لیے جب اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے تو اس کی بنیان اوپر کو سرک گئی اور تنی ہوئی چکنی جلد پر اس کی کوزی کی طرح دلکش ناف دکھائی دینے لگی۔ پیٹ کے موہوم سے دل فریب ابھار پر ایک نہایت دل نشیں گہرائی..... وہ اس جسم کا بھوکا تھا۔ وہ اس بدن کی پرستش کرتا تھا وہ تنے ہوئے چکنے— گوشت سے پر کولھوں پر فدا تھا۔ جس جسم کی لچک دار جلد کی حدت اور نمی کو محسوس کر کے اس پر بے ہوشی سی طاری ہونے لگتی تھی..... وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ آگے بڑھا۔ وہ محض جانتا تھا کہ جس جسم میں نشہ آور شراب لہریں مارتی تھی۔ اس سے لطف اندوز ہونے سے بڑھ کر دنیا میں اور کیا

شے ہوسکتی تھی...... قریب تھا کہ وہ اسے اپنے بازوؤں میں لے لے کہ اتنے میں اس کی ماں اندر داخل ہوئی۔ اس کے قدم رک گئے۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں رخصت چاہی۔ اس نے نظروں ہی نظروں میں بیوی کو تسلی دی کہ وہ جلد ہی لوٹ آئے گا۔

ڈیوڑھی میں کھڑے کھڑے آج کئی برس بعد وہی پرانا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے پھر رہا تھا۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اسے یوں معلوم ہوا جیسے اس مرتبہ اس پر پھر کمزوری اعصاب کا حملہ ہوگا۔ اس نے دیوار کا سہارا لیا اور بہ مشکل اپنی بچی کو سنبھالے رکھا۔

تھوڑی دیر بعد اس کا سامان بھی آ گیا۔ اپنے ویران گھر کے بیچوں بیچ اس نے چارپائی ڈال کر بستر بچھا دیا۔ پھر وہ اپنی بچی سے باتیں کرنے لگا۔ اس کے لیے کھلونے پھل اور کپڑے نکالے۔ بچی بہت خوش ہوئی۔ سرسوں کے چراغ کی روشنی میں اس کی لڑکی گئی رات تک اس سے باتیں کرتی رہی اور پھر باپ کے گلے سے لپٹ کر سو گئی۔ منیر احمد کو نیند نہ آئی۔ وہ ایک ہاتھ سے بچی کو پنکھا جھلتا رہا اور دوسرا ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر آسمان کی طرف تکتا رہا۔ اب یہ گھر اسے کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ اگر اسے یہیں رہنا پڑے تو وہ پاگل ہوجائے۔

دوسرے دن اس نے چچا سے زمین بیچ دینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لڑائی ختم ہوچکی تھی۔ زمینوں کی قیمتیں نسبتاً گر چکی تھیں۔ لیکن جنگ میں لوگوں نے کمایا بھی خوب تھا۔ اس لیے اس کی زمین کے کئی گاہک نکل آئے اور کسی قدر کش مکش اور سودا بازی کے بعد اس نے کل زمین اور مکان تیرہ ہزار روپے میں بیچ ڈالا۔

یہ سب کام آٹھ دس دن کے اندر ختم ہوگیا۔ جب اس کے گھر کا ساز و سامان چھکڑوں پر لدنے لگا تو گاؤں کے لوگ اور اس کے دور و نزدیک کے رشتہ دار جمع ہوگئے اور سب اس کے اس ارادہ پر اظہار افسوس کرنے لگے۔ اس کے ان دوستوں نے جو بچپن ہی سے اس کے ساتھی تھے۔ اسے تاکید کی کہ وہ اپنے آبائی گاؤں میں ضرور آتا رہے۔

منیر احمد نے کانگڑے کی وادی میں ایک چھوٹے سے قصبے میں پریکٹس شروع کر دی۔

یہ ایک پہاڑی مقام تھا۔ اس وادی میں ہرے بھرے سبزہ زار اور اونچے اونچے درختوں کے جنگل تھے۔ پہاڑوں سے آنے والی آڑی ترچھی برساتی ندیاں تھیں جو یا تو برسات کے دنوں میں بہتی تھیں، یا جب پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف پگھلنے لگتی اور چاروں طرف پروقار پہاڑ رعونت کے ساتھ کھڑے نظر آتے تھے۔

لڑائی سے پہلے یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ لیکن لڑائی کے دنوں میں اسے بہت فروغ حاصل ہوا۔ یہاں کے جنگلوں سے لکڑی حاصل کی جاتی تھی۔ لڑائی کے دنوں ہی میں یہاں ماچس بنانے اور ریشم کے تیار کرنے کے دو کارخانے بھی قائم ہو گئے پہلے یہ لوگ کشمیر میں کام کیا کرتے تھے لیکن چونکہ وہ جگہ بہت دور تھی، اس لیے اس جگہ کا انتخاب کیا گیا۔ گورنمنٹ نے بھی تختے اور لکڑی کی پیٹیاں بنانے کے کارخانے قائم کر دیے تھے۔ اس طرح بہت سے سرکاری اور غیر سرکاری لوگ بھی اس جگہ آن بسے تھے۔ بہت سے لوگوں کو یہ مقام اس قدر پسند آیا کہ انہوں نے زمینیں خرید کر مکان بنوا لیے اور مستقل طور پر اسی جگہ رہنے لگے۔

قصبہ سے باہر بڑی تعداد میں بنگلہ نما مکان بنے ہوئے تھے۔ یہاں زیادہ تر عیسائی رہتے تھے یا بچارے غریب اینگلو انڈین۔ اس جگہ رہنے والے وہ لوگ تھے جن کی مالی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی لیکن سفید پوشی بھی لازمی تھی جو لوگ در اصل امیر تھے وہ سول لائنز میں رہتے تھے۔

ہر مکان کے ارد گرد کچھ زمین چھوڑ دی گئی تھی۔ سبھی مکان تقریباً ایک ہی ڈیزائن کے بنے ہوئے تھے۔ ہر ایک میں تین تین کمرے۔ ان کے علاوہ باتھ روم، اسٹور روم برآمدے، علاحدہ باورچی خانہ، صحن وغیرہ۔

جو زمین باہر بچی ہوئی تھی اس میں مکان کے سامنے والے حصہ میں پھولوں کی

کیاریاں بنائی جاسکتی اور پچھلی جانب سبزیاں اگائی جاسکتی تھیں۔ بعض لوگوں نے بیڈمنٹن کورٹ بھی بنا رکھے تھے۔

ان مکانوں کے درمیان ہری بھری قد آدم باڑیں تھیں۔ ان باڑوں کی پتیاں گہرے سبز رنگ کی تھیں۔ برسات کے دنوں میں ان میں ہلکے نیلے رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول کھلتے تھے اور بارش میں دھلے دھلائے پھولوں کے غنچے آنکھوں کو بہت ہی بھلے معلوم ہوتے تھے۔

مکان میں داخل ہونے سے پہلے اس کی خوب اچھی طرح سے صفائی کروائی گئی۔ دیواروں پر سفیدی، دروازوں پر نیا پالش، باقی تھوڑی بہت مرمت ہوجانے کے بعد سارا سامان مکان میں رکھ دیا گیا۔ تین کمروں میں سے ایک ڈرائنگ روم بنا دیا تھا اور ایک بڑا کمرہ اس نے اپنے لیے مخصوص کرلیا اور اپنے نام کی لکڑی کی چھوٹی سی تختی پھاٹک پر لٹکا دی۔

منیر احمد نے اپنے ہمسایوں کی طرح مکانوں کے سامنے کے حصے میں کیاریاں بنوائیں۔ پچھلے حصہ میں سبزیاں لگائیں، صرف ایک کونے میں جنگلی گلاب کے لیے پیڑ رہنے دیے۔ ان کی اوٹ میں لوہے کے ایک بڑی سی بنچ پڑی تھی۔ یہاں چیڑ کے اونچے اونچے درختوں کا سایہ بھی تھا۔ بعد میں مکان کی پچھلی طرف بیڈمنٹن کھیلنے کا کورٹ بھی بنا لیا گیا۔

باہر کے برآمدے میں لوہے کے تاروں کے بنے ہوئے گملے لٹکا دیے گئے۔ ان میں سے رنگ برنگ کے پھولوں کی بیلیں نیچے لٹکی رہتی تھیں۔ کمرے اپنی حیثیت کے مطابق اس نے سجا لیے۔

رہنے کا ٹھکانہ بنا لینے کے بعد منیر احمد نے آشاں (عائشہ) کو ایک مقامی اسکول میں داخل کرا دیا۔ یہ ایک مشن اسکول تھا جہاں انگریزی میں تعلیم دی جاتی تھی۔

باپ کے ساتھ چند ہی دن رہنے کے بعد آشاں کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا اس کے اعضا میں پھرتی اور آنکھوں میں بچپن کی شوخی عود کر آئی۔ اسکول میں جونیئر کلاسوں تک مخلوط طریقہ تعلیم رائج تھا۔ اس لیے آشاں کی لڑکیوں کے علاوہ لڑکوں سے بھی دوستی قائم ہوگئی۔ جب کبھی منیر احمد اپنے مکان کے برآمدے میں جھولنے والی کرسی پر بیٹھا کوئی کتاب دیکھ رہا ہوتا تو آشاں کے دوست اور سہیلیاں آتیں اور خوش نوا پرندوں کی طرح چہچہا کر کہتیں "گڈ ایوننگ" انکل با"

منیر نے دوسری لڑکیوں کی طرح آشاں کے سر کے بال بھی کتروا ڈالے۔ اس خیال سے کہ جب وہ بڑی ہوجائے گی تو اس کے بال چھوڑ دیئے جائیں گے۔

آشاں کی سب سے گہری سہیلی ان کے پڑوسی ہندوستانی پادری مسیح پال سنگھ کی لڑکی تھی۔ مسیح پال سنگھ پہلے سکھ تھا۔ پھر عیسائی ہوگیا۔ وہ بہت ہی حلیم الطبع شخص تھا۔ اگرچہ اس کے ہاتھ پاؤں کی بناوٹ اور جسم کا ڈھانچہ پنجاب کے سکھوں کی طرح خوب مضبوط تھا لیکن اس کے صفاچٹ چہرے سے ہیبت اور خشونت کے وہ آثار ہویدا نہ تھے جو بعض سکھوں کی صورت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کی آنکھوں سے محبت اور اطمینان چھن چھن کر نکلتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی شادی ایک اینگلو انڈین عورت سے ہوئی تھی۔ دونوں کی عمر میں بہت تفاوت تھا۔ وہ تقریباً بیالیس برس کی عمر کا تھا اور بیوی ستائیس اٹھائیس سال کی۔ ان کے دو بچے تھے۔ ایک شیر خوار لڑکا اور ایک آشاں کی ہم عمر لڑکی مارتھا۔ مارتھا بھی آشا کے مشن اسکول ہی میں پڑھتی تھی۔ ان دونوں کی خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ ان کی محبت کی وجہ سے منیر احمد کی ان کے ہاں بھی آمد و رفت تھی۔

منیر احمد کی مسیح پال سنگھ سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی تھی۔ جب آشاں نے اپنی منہ بولی بہن مارتھا کو بطور تحفہ ایک گڑیا نذر کی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد مسیح پال سنگھ گڑیا ہاتھ میں لیے ان کے پھاٹک میں داخل ہوا۔ منیر نے دور ہی سے اسے پہچان لیا۔ اگرچہ پہلے کبھی ان کی آپس میں گفتگو نہ ہوئی تھی۔ لیکن وہ اس کی صورت سے آشنا تھا۔

اس نے بارہا اسے اپنے باغ کی کیاریوں میں غلائی کرتے یا چیڑھ کے درختوں کے تلے انجیل پڑھتے دیکھا تھا۔ جب وہ قریب آیا تو سلام دعا کے بعد مسیح پال سنگھ نے گڑیا دکھاتے ہوئے اپنی مخصوص نرم آواز میں پوچھا۔ ''ڈاکٹر صاحب! یہ گڑیا میری لڑکی آپ کے ہاں سے لے گئی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ آپ کی بچی نے اسے بطور تحفہ نذر کی ہے۔''

منیر احمد نے کرسی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''جی ہاں یہ درست ہے۔ مارتھا آشاں کی منہ بولی بہن ہے۔ آشاں مجھ سے کہہ رہی تھی کہ وہ اپنی دو گڑیوں میں سے ایک مارتھا کو دے دینا چاہتی ہے۔''

مسیح پال سنگھ دل فریب انداز میں مسکرا دیا۔ '' مجھے یونہی شک گزرا...... مارتھا باہر گئی ہوئی ہے۔ میں نے سوچا آپ سے دریافت کرلوں۔ اب مجھے مارتھا سے اس غلط فہمی کے لیے معافی مانگنی ہوگی۔''

منیر احمد نے اسے یقین دلایا کہ مارتھا بہت ہی نیک اور ایماندار بچی ہے۔

اس کے بعد وہ پندرہ بیس منٹ تک ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔

اس طرح ان کی ایک دوسرے کے ہاں آمد و رفت شروع ہوئی۔

اس مقام پر سدا بہار ہی کا موسم رہتا تھا۔ جب وہ آشاں کو اچھے اچھے کپڑے پہنا کر باہر لے جاتا تو قدرت کے حسین مناظر، ڈھلوانوں کی شادابی، پہاڑیوں کی شادابی، پہاڑوں کی متانت اور اس کی بچی کی مینا کی سی باتوں سے اس کے دل کو بڑی تسکین حاصل ہوتی تھی...... کبھی کبھی وہ دور نکل جاتے تو بعض اوقات اُنہیں وہ پہاڑی لڑکے دکھائی دیتے جو ندی کے کنارے دم سادھے بیٹھے رہتے تھے۔ در اصل وہ مچھلیاں پکڑنے کی دھن میں ہوتے تھے ایک بڑے سے کٹورے میں گندھے ہوئے آٹے کی گولی رکھ کر وہ اس کے اوپر ایک مضبوط کپڑا باندھ دیتے تھے اور کپڑے کے بیچوں بیچ ایک سوراخ کردیتے۔ پانی کی رو میں مچھلیاں بہتی ہوئی آتیں اور ان میں سے پندرہ بیس اس سوراخ میں داخل ہوجاتیں۔ گم صم بیٹھے ہوئے وہ پہاڑی لڑکے ایک دم سادھی

سے چونک پڑتے اور کٹورا پانی سے باہر نکال کر رکھ دیتے تھے اور جلدی سے کپڑا ہٹا کر تڑپتی ہوئی مچھلیاں تھالی میں الٹ دیتے۔

سب سے ظالم تو کیکڑے پکڑنے والے ہوتے تھے۔ یہ لوگ برسات کے دنوں میں نہروں یا ندیوں کے کنارے کنارے دور دور تک پاؤں کے بل اکڑوں بیٹھے نظر آتے تھے۔ ڈیڑھ ہاتھ لمبی لکڑی کے ایک سرے پر پندرہ بیس کینچوے بندھے ہوتے تھے۔ کیکڑا کینچوؤں کی طرف لپک کر آتا۔ جونہی وہ کینچوؤں کو اپنی گرفت میں لیتا شکاری جھٹ لاٹھی اچک کر اسے ایک جھٹکے کے ساتھ کنارے پر پھینک دیتے۔ کیکڑا سراسیمگی میں بے ڈھنگی سی چال سے پانی کی طرف لپکتا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ وہ پانی کے قریب پہنچنے پائے شکاری اس کی ایک ٹانگ لاٹھی سے دبا کر توڑ ڈالتا۔ کیکڑا درد کی شدت میں پاگلوں کی طرح ادھر اُدھر بھاگ جانے کی کوشش کرتا۔ لیکن یکے بعد دیگرے اس کی سب ٹانگیں اور بازو توڑ کر پرے پھینک دیئے جاتے۔ اس وقت مارے اذیت کے اس کی آنکھیں باہر کو ابل آتی تھیں۔ لیکن وہ تھیلے میں اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح بے بس پڑا رہتا تھا۔ آشاں جب یہ منظر دیکھتی تو اس کا دل کانپ اٹھتا۔ وہ پوچھتی۔ "ابا! وہ ان کا کیا کریں گے۔"

اس وقت شکاری ننھی لڑکی کی بات سن کر کہتا۔ " بی بی! اسے بنگالی بابو کھایا کرتے ہیں۔"

...... وہاں بنگالی بابوؤں کی بھی کمی نہ تھی۔ اس لیے ان لوگوں کا یہ بیوپار بھی خوب چل رہا تھا۔"

آشاں بڑی ذہین لڑکی ثابت ہوئی۔ وہ اسکول کی بہت اچھی طالبات میں سے سمجھی جاتی تھی۔ اسکول میں چھوٹے چھوٹے ڈرامے بھی کھیلے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ آشاں کو اس فاختہ کا پارٹ دیا گیا جس کا بھائی دانہ چگنے گیا اور وہاں وہ ایک چیل کے گھونسلے میں جا پھنسا اوپر سے چیل آگئی اور اپنے بچوں کو پروں میں چھپا کر بیٹھ گئی۔

ادھر اس کی بہن فاختہ یعنی آشاں بہت پریشان تھی۔ وہ اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس جگہ پہنچی اور بڑی مشکل سے اپنے بھائی کو رہائی دلائی۔

وہ کئی ایک کھیل بھی کھیل لیتی تھی۔ اسے رسی پھاندنے میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی۔ اس بات میں اسکول کی صرف دو لڑکیاں اس کا مقابلہ کرسکتی تھیں۔ باقی بچاری تو منہ دیکھتی ہی رہ جاتی تھیں۔ وہ بچاری شہری لڑکیاں تھیں، ان کی رگوں میں خون کہاں جو آشاں کی نس نس میں دوڑ رہا تھا۔

اس کے علاوہ اسے گیند کھیلنا بھی خوب آتا تھا۔ وہ ربڑ کے گیند کو ایک مرتبہ فرش پر دے مارتی اور پھر گیند اچھالے ہی جاتی اور اسے کبھی زمین پر گرنے نہ دیتی اس کھیل میں اسکول کی کوئی ہوشیار سے ہوشیار لڑکی بھی اس کا مقابلہ نہ کرسکتی تھی۔

دن گزرتے گئے۔

منیر احمد کی مصروفیتیں بڑھتی گئیں۔ اب اس کا مطب بھی چل نکلا تھا۔ چار گھنٹے صبح اور چار گھنٹہ شام کے وقت وہ مطلب ہی میں گزارتا تھا صرف اتوار کے دن کی چھٹی کرتا یعنی شام کے وقت مطب میں نہ جاتا۔ اس نے اپنے مکان ہی پر پریکٹس شروع کردی تھی۔ صرف اتنا اضافہ ضرور کیا تھا کہ مالک مکان سے کہہ کر اپنے کمرے کے آگے والے حصہ کے سامنے ایک سائبان کھڑا کروا لیا تھا۔ اس سائبان کے اندر لکڑی کی بنچیں بچھی ہوئی تھیں۔ مریض آتے اور ان پر بیٹھے اپنی باری کا انتظار کرتے تھے۔

ڈاکٹری کے علاوہ اس کا دوسرا شغل مرغی خانہ تھا۔ اس نے مکان کی پچھلی جانب بڑے اہتمام کے ساتھ ایک مرغی خانہ بنوا لیا تھا۔ مرغیاں پالنے کے فن پر اس نے بہت سی کتابیں منگوائیں۔ کتابوں میں لکھی ہوئی ہدایتوں کے مطابق ایک بہت بڑی جالی مرغی خانہ کے چاروں طرف لگوادی۔ جال کے اندر اینٹوں کے چھوٹے چھوٹے خانے بنوا دیئے تاکہ مرغ اور مرغیاں، سردی گری سے بچ سکیں اور مرغیاں انڈے دے سکیں۔ اس

نے اعلیٰ نسل کی انگریزی مرغیاں اور مرغے خرید کر پالے۔ چند ہی سال بعد ان کی تعداد اس قدر زیادہ ہوگئی کہ اگر وہ چاہتا تو اچھی خاصی تجارت شروع کرسکتا تھا۔ لیکن اس نے سوچا کون یہ نیا جھنجٹ مول لے۔ اس کا وقت خاصہ گذر جاتا تھا۔ دسترخوان پر بلا ناغہ انڈے کھانے کو ملنے لگے تھے اور پھر چوزے بھی تعداد میں اس قدر زیادہ تھے کہ ہر روز کھائے جاتے تو ختم نہ ہوتے۔

باغبانی بھی اس کا ایک دلچسپ مشغلہ تھا۔ اب اسے پھولوں کی قسم سے بھی کافی واقفیت ہوگئی تھی۔ وہ اپنے ہاتھ سے کیاریاں بنا کر پھولوں کے پودے لگاتا۔ پھولوں کے ساتھ وہ سبزیوں کو بھی نظر انداز نہ کرتا تھا۔ ہر موسم کی سبزی ترکاری اس کے چھوٹے سے باغ سے مل سکتی تھی۔

ان مشاغل کے بعد جو وقت ملتا وہ پادری صاحب کی صحبت میں گزار دیتا۔ آشاں عموماً اپنی سہیلیوں میں مصروف رہتی اور وہ اپنے دوست مسیح پال سنگھ کے ساتھ باتیں کرتا۔ دینیات میں مسیح پال سنگھ کا علم بہت وسیع تھا اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ محض انجیل پڑھ لینا یا مسیح کے گن گا لینا ہی اس کا مذہب نہ تھا بلکہ وہ عملی زندگی میں بھی مذہب کی اعلا تعلیمات کو مدنظر رکھتا۔ وہ ایک عالم باعمل تھا اور شاید اسی وجہ سے اس کے چہرے سے ایک ابدی مسرت اور اطمینان کا نور جھلکتا تھا۔ اس کی آواز دھیمی ہوتی تھی۔ اس کی گفتگو میں تیزی وطرّاری کا شائبہ تک نہ تھا۔ منیر احمد کو اس کی یہ ادا بہت پسند تھی کہ وہ دوسروں کی بات کان دھر کر سنتا تھا۔ اسے اپنی بات کہنے کی جلدی نہ ہوتی تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے مسکرا مسکرا کر دوسروں کی باتیں سنتا۔ خواہ وہ باتیں کتنی بھی خشک کیوں نہ ہوتیں یا کہنے والا کتنی بھی غلط بیانی سے کام کیوں نہ لیتا۔ اس کی پیشانی پر بل تک نہ آتا۔

اس کی صحبت میں منیراحمد کو ہمیشہ ہی انتہا درجے کی خوشی کا احساس ہوتا تھا۔ مسیح پال سنگھ کے مکان کے اردگرد ان کی بہ نسبت وگنی زمین خالی پڑی تھی۔ شاید زمین کے

مالک کا اس جگہ ایک اور مکان بنوانے کا خیال ہو جو کسی مصلحت سے بنوایا نہیں گیا۔ خیر سرِ دست وہ ساری جگہ مسیح پال سنگھ کے تصرف میں تھی۔ مسیح پال سنگھ نے کوئی باغ نہیں لگوایا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اس کا مذاق اسٹیونسن کی طرح تھا۔

اسے زمین کا سادہ ٹکڑا بہت پسند تھا۔ اسی طرح اپنے احاطے میں چیڑھ کے درختوں تلے بیٹھنا اسے بہت مرغوب تھا۔

شام کے وقت منیر احمد بھی درختوں کے اس جھنڈ تلے جا بیٹھتا تھا۔ منیر احمد کو مذہب یا فلسفے کی باریکیوں سے زیادہ دلچسپی نہ تھی اور نہ وہ انہیں سمجھتا ہی تھا۔ لیکن وہ اس کی تقریر میں سے کام کی کوئی نہ کوئی بات پا ہی لیتا تھا۔ مثلاً جب وہ کہتا۔ ''ابتدا میں کلمہ تھا۔ کلمہ خدا کے ساتھ تھا۔ کلمہ خدا تھا۔'' ...... اور پھر وہ اس کی تشریح کرتا تو منیر احمد کچھ نہ سمجھنے کے باوجود اس کی عظمت اور قابلیت کا قائل ہو جاتا۔ اسے یقین تھا کہ اگر کوئی بڑے سے بڑا عالم بھی آ کر اس کی یہ گفتگو سنے تو اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ ان زیادہ گہری باتوں کے بجائے اسے حضرت مسیح کے سیدھے سادے اقوال زیادہ پسند تھے اور پھر بائبل کی وہ دلچسپ کہانیاں بڑے غور سے سنتا۔ بھولے ہوئے بیٹے کی کہانی۔ سات کنواریوں کا قصہ بیج بونے والے کا افسانہ وغیرہ اسے واقعی بہت پسند تھے۔ وہ یہ کہانیاں آشاں کو بھی سنایا کرتا۔ گئی رات تک آسمان سے باتیں کرنے والے چیڑھ کے درختوں تلے مسیح پال سنگھ، اس کی بیوی اور منیر احمد باتیں کیا کرتے تھے۔ مسیح پال سنگھ کی آواز میں بڑی شیرینی تھی۔ جب وہ باتیں کرتے وقت اپنے ہاتھوں کو بھی ایک خاص انداز سے حرکت دیتا تو سننے والے پر سرور سا طاری ہو جاتا۔ جب کبھی منیر احمد کو ماضی کی یاد ستاتی تو مسیح پال سنگھ کی آواز ہی سن کر اسے اپنے دکھ دور ہوتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔

ہفتہ میں ایک مرتبہ وہ سب لوگ بائیسکوپ دیکھنے چلے جاتے تھے۔ ان دنوں وہاں خاموش تصویریں آتی تھیں۔ ان میں بعض مذہبی کھیل بھی ہوتے تھے جنہیں دیکھ کر

مسٹ پال سنگھ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔

اردگرد پہاڑوں میں بہت سے تفریح کے مقامات بھی تھے۔ کبھی وہ سب مل کر پکنک پر بھی چلے جاتے۔ سارا دن ہنسی مذاق، گھومنے پھرنے اور نہانے دھونے میں گزر جاتا تھا۔

رفتہ رفتہ منیر احمد بڑھاپے کی طرف قدم بڑھاتا گیا اور اس کی بچی شباب کی جانب۔

آشاں جب پندرھویں برس میں پہنچی تو اس کی جوانی کے سامنے اس کی ماں کا شباب بھی پھیکا پڑ گیا۔ یہ صحت ور اور متناسب الاعضا لڑکی ہزاروں میں ایک تھی۔ اس کا رنگ گورا نہ سہی، لیکن خون کی حدت سے اس کے رخسار گلنار تھے۔ ہونٹ رس بھری قاشیں جیسے ابھی ان میں سے شہید ٹپک پڑے گا۔ وہ روایت کہ بعض صورتیں خدا فرصت میں آرام سے بیٹھ کر پوری توجہ سے بناتا ہے اسی پر صادق آتی تھی۔ لیکن وہ اس وقت اپنے حسن و شباب سے اس قدر بے خبر تھی جیسے ایک چھ برس کی بچی — وہی دوڑ بھاگ، کود پھاند، چھین جھپٹ — جب منیر احمد پلنگ پر بیٹھا کوئی کتاب پڑھنے میں منہمک ہوتا تو وہ بچوں کی طرح مٹکتی ہوئی آتی اور پلنگ پر لیٹ کر باپ کا ہاتھ اپنے رخسار کے ساتھ ملنے لگتی۔ وہ سمجھ جاتا کہ اس وقت اس کی بیٹی کوئی فرمائش لائی ہے۔ وہ اچک کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیتا اور پوچھتا۔ "آشو! آج لاڈلی بیٹی کی کیا فرمائش ہے۔"

اس پر وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگتی۔ "ابا! آپ کو میرے دل کا حال کیوں کر معلوم ہو جاتا ہے۔ کیا آپ غیب دان ہیں۔"

وہ آشاں کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتا۔ ہاں آشو! میں غیب دان ہوں۔ کم از کم تمہارے دل کی باتیں مجھ سے چھپی نہیں رہ سکتیں۔"

اس کے بعد کچھ پر لطف باتیں ہوتیں اور اکی فرمائش منظور ہوجانے پر وہ اپنے کمرے میں چلی جاتی۔

آشاں ابھی تک اس قدر الھڑ تھی کہ منیر احمد کو یہی خیال آتا کہ اس کے لاڈ پیار کی وجہ سے اس لڑکی کو دنیاداری کی ہوا تک نہیں لگنے پائی۔ ابھی تک وہ ننھی بچی ہی ہے۔ اس نے بارہا آشاں کو مارتھا کے ساتھ کمرے میں رقص کرتے دیکھا تھا۔ وہ دونوں ایک ساتھ قدم اٹھاتیں۔ جسم کے ہر عضو کی حرکتوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرتیں اور بڑے انہماک سے باریک آواز میں کوئی گیت شروع کردیتیں۔

منیر احمد نے بیٹی کو اسکول سے ہٹا لیا۔ البتہ استانی اسے گھر پر پڑھانے کے لیے آتی تھیں۔ اس کے بال کٹوانے بھی اب بند کردیئے تھے اور وہ بڑھ کر بڑے گھنے اور لمبے ہوگئے تھے — آشاں کی مارتھا کے سوا کسی اور کے گھر زیادہ آمد و رفت نہیں تھی۔ اس نے انگریزی طریقہ پر تعلیم پائی تھی۔ برقعے کی حد تک پردہ کی پابندی کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

تین چار برس اور گذر گئے۔

آشاں نے وہ جوبن نکالا کہ اگر وہ گاؤں میں ہوتی تو علاقہ بھر میں ایک شور سا مچ جاتا اور کئی دل پھینک نوجوانوں کے سر پھٹ گئے ہوتے لیکن دنیا کے اس خاموش گوشہ میں ایک جنگلی پھول کی طرح کھل کر رہ گئی تھی اور اس کا جسم گرمئی شباب سے پھنک رہا تھا۔ آنکھوں میں وہ طراوت پیدا ہوگئی تھی جو صرف بھرپور شباب ہی کا نتیجہ ہوسکتی تھی۔ ہونٹوں پر ایک ایسی نم دار چکنائی نمودار ہوگئی تھی جس پر بھونرے منڈلاتے رہیں۔ وہ پلنگ پر پڑی پڑی انگڑائیاں لیتی اس کے جسم کا جوڑ جوڑ ٹوٹتا۔ جسم کے اعضا میں میٹھی میٹھی خلش محسوس ہوتی۔ وہ بیٹھے بیٹھے گہرے سانس لے کر سینہ تان لیتی اور وزدیدہ دزدیدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتی اور پھر راستہ بھولی ہوئی ہرنی کی طرح متوحش نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگتی۔ وہ گھنٹوں چارپائی پر پڑی پڑی بے چینی سے کروٹیں لے لے کر اپنے جسم کو ادھر اُدھر پٹختی۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ اتوار کا دن اور دوپہر کا وقت۔ منیر احمد اخبار دیکھ رہا تھا۔ اس پر غنودگی سی طاری تھی اور پھر اسے پتہ بھی نہیں چلا کہ کب نیند نے اسے آ دبایا اور پھر یکایک جو آنکھ کھلی تو اسے پسینہ آ رہا تھا۔ اس نے بجلی کا پنکھا چلا دیا۔ پانی کا لوٹا لے کر غسل خانے میں گیا۔ منہ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیئے۔ وہ اپنے ہاتھوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اب اس کے ہاتھ کی جلد پر سلوٹیں پڑ رہی تھیں۔ جسم کی رنگت بھی پھیکی پڑ گئی تھیں۔ وہ بدن میں بھی پہلے کی بہ نسبت کچھ نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ اب وہ بوڑھا ہو رہا ہے۔

وہ بیساکھیاں بغلوں میں دبائے باہر کھلی ہوا میں نکل آیا۔ ہوا بند تھی لیکن آسمان کے ایک گوشے سے سرمئی رنگ کے بادل پھیل کر سورج کو اپنے دامن میں چھپا لینا چاہتے تھے۔ گھٹا کے آگے آگے چیلیں پرواز کر رہی تھیں۔ جس کا مطلب تھا کہ بارش ہوگی۔

وہ کیاریوں میں سے ہوتا ہوا جنگلی گلاب کے پیڑوں کے جھنڈ کی طرف چلا گیا۔ اس جگہ دو تین چیڑھ کے درخت بھی موجود تھے۔ اسے خیال آیا کہ ایک عرصہ سے لوہے کی بنچ گلاب کے جھنڈ کے پیچھے پڑی ہے۔ اگر اسے جھنڈ کے اس طرف درخت تلے رکھ دیا جائے تو جس دن بادل چھائے ہوئے ہوں۔ وہ صبح و شام اس پر بیٹھ کر باغ کا نظارہ کر سکتا ہے۔

ابھی خیالات میں غلطاں وہ آگے بڑھا ہی تھا کہ کنج میں بچھی ہوئی بنچ پر..... آشاں کسی اجنبی نوجوان کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی۔

منیر احمد دم بخود رہ گیا۔۔۔ کس قدر ناقابل یقین..... آشاں بدمست شرابیوں کی طرح نوجوان کے شانے پر گری پڑی تھی۔ ڈھیلے ڈھالے بال بے احتیاطی سے ادھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے، اس کی آنکھیں بند تھیں، منہ ذرا کھلا تھا اور دانت موتیوں کی طرح چمک رہے تھے، نتھنے پھڑک رہے۔ دوپٹہ سینے پر سے کھسک چکا تھا اور ایک گول گورا۔ شانہ عریاں تھا۔ بچے گریبان میں سے اس کی داہنی چھاتی کا ابھار صاف نظر آ رہا تھا اور

وہ اجنبی اس کے شانوں، گردن، ہونٹوں اور آنکھوں پر پے در پے بوسے دیئے جا رہا تھا۔ اس وقت آشاں اپنے ماحول سے اس قدر بے خبر تھی کہ اسے اپنے تن بدن کا کچھ ہوش ہی نہ تھا۔ وہ کسی پکے ہوئے پھل کی طرح ٹہنی سے ٹوٹنا ہی چاہتی تھی۔

یہ ہوش شربا نظارہ اس قدر خلاف امید تھا اور پھر اس قدر اچانک اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا کہ وہ بت بنا کھڑا رہ گیا۔ اسے یہ بھی خیال نہیں آیا کہ اسے ایسے موقعہ پر ٹل جانا چاہئے۔ پہلے حیرت اور غضب کے مارے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس کا ایک پاؤں زمین میں گڑ گیا۔

دفعتہً اجنبی کی نگاہ اس پر پڑی۔ بجلی کے ایک جھٹکے کے ساتھ وہ آشاں کو پرے دھکیل کر کھڑا ہوگیا۔ دوسرے لمحہ میں آشاں پرے ہٹی...... منیر احمد نے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ اپنا نیم عریاں سینہ ڈھانپتی اوڑھنی سنبھالتی ہوئی گھر کی طرف بھاگ گئی اور اجنبی نوجوان نے لحظہ بھر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اور پھر اچک کر باڑ میں سے باہر نکل گیا۔

چند لمحوں تک اس کے اعصاب کی قوت بالکل ہی سلب ہوگئی۔ وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکا۔ بغلوں میں دبی ہوئی بیساکھیاں لرزتی رہیں۔ پھر جب غیظ کی پہلی لہر چڑھ کر اتر گئی اور وہ اس قابل ہوا کہ حرکت کر سکے تو وہ بڑی تیزی سے بیساکھیاں ٹیکتا ہوا ادھر اُدھر دیکھتا ہوا گھر کی جانب بڑھا۔ ڈرائنگ روم سے نکل کر جب سونے کے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ سامنے آشاں پلنگ پر اوندھے منہ پڑی سسکیاں لے رہی ہے۔

وہ ایک لمحہ کے لیے رکا۔ اس کی گزشتہ زندگی بھر کا غیظ ایک شعلے کی طرح بھڑک اٹھا۔ اس کی آنکھیں ایسی تھیں۔ جیسے خون ٹپکنے کو ہو۔ اس کا سکڑا ہوا چہرہ پتھر کی طرح بے حس تھا اور چہرے کے ٹیڑھے میڑھے خطوط کسی مصری ممی کی طرح وحشت ناک نظر آ رہے تھے۔ آشاں نے باپ کو ایسی غضب ناک حالت میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ باپ اپنی آنکھیں اس پر گاڑے ہوئے تھا۔ اس کی باچھوں میں سے درندوں کی

طرح دانت نکل کر چمک رہے تھے۔ وہ اسے دیکھ کر خوف زدہ ہوگئی۔ بھاگ نکلنے کے لیے اٹھنے لگی۔ لیکن ہاتھ پاؤں پھول چکے تھے۔ وہ بے بس ہو کر رحم طلب نظروں سے باپ کی طرف دیکھنے لگی۔ لیکن اس کے باپ کا چہرہ لاش کی طرح سفید اور بے حس تھا اور وہ لمحہ بھر کے سکوت کے بعد آگے کو بڑھا آرہا تھا۔

آشاں کی آنکھیں حیرت انگیز طور پھٹ گئیں۔ اس کی کن پٹیاں جل اٹھیں۔ اس نے انتہائی دہشت کے زیر اثر چیخنے کی کوشش کی لیکن اس کے حلق سے آواز ہی نہ نکل سکی۔ ادھر اس کا باپ آگے بڑھتا چلا آرہا تھا۔ ادھر اس کا سر لٹو کے طور پر حرکت کر رہا تھا۔ اس کے خشک ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ تک اٹھانے کی سکت باقی نہ رہی۔ باپ نے نزدیک پہنچ کر پوری قوت سے اس کے گال پر طمانچہ رسید کیا۔

"حرام زادی!...... بے حیا!! بے شرم!...... ذلیل......؟"

اس کے حلق سے گالیاں ایسی انوکھی اور مہیب آواز میں نکل رہی تھیں جیسے اس کے جسم کے اندر کوئی حیوان بیٹھا بول رہا ہو۔ آشاں تھپڑ کھا کر فرش پر گر پڑی۔ باپ بیساکھیاں پرے پھینک کر اس پر بھیڑیے کی طرح جھپٹ پڑا۔ گھونسے پہ گھونسہ تھپڑ پہ تھپڑ، پاگل کتے کی طرح،اس نے اس کے بال نوچ ڈالے۔ جوں جوں وہ اسے مارتا تھا۔ توں توں اس کی وحشت بڑھتی جارہی تھی۔ آشاں کی قمیص تار تار ہوگئی۔ مسوڑھوں سے لہو بہنے لگا۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں چوپائے کی طرح گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل چلتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔ پیشتر اس کے کہ وہ باپ کے ہاتھوں کی زد سے باہر نکل جائے۔ اس کے سر پر بیساکھی کی چوٹ اس زور سے پڑی کہ وہ بے ہوش ہوگئی۔

اس وقت منیر احمد نے کھڑکی میں سے دیکھا کہ ان کی باورچن دوپہر کی چھٹی کرنے کے بعد واپس آرہی ہے۔ وہ پھاٹک ہی پر تھی کہ منیر احمد نے فوراً سونے کے کمرے کا دروازہ بند کیا اور ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ باورچن سیدھی کچن میں پہنچی اور

وہاں سے برتنوں کے ہلانے جلانے کی آوازیں آنے لگیں۔
منیر احمد کمرے میں کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی دہشت کم ہو رہی تھی۔ وہ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے اعصاب کی تشنجی کیفیت دور ہوچکی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کا دل پریشان ہونے لگا۔ ایک نا معلوم سا خوف اس کے ذہن پر چھانے لگا۔ پھر وہ بے چین ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ جلدی جلدی ٹہلنے کے بعد وہ ایک دم رکا اور روئی، پانی اور دواؤں کا بکس لے کر وہ بھاگ کر سونے کے کمرے میں پہنچا۔ اس نے آشاں کی طرف دیکھا۔ آشاں خون میں لت پت بے ہوش پڑی تھی۔ اس نے اسے اٹھا کر بستر پر لٹا دیا۔ جلدی سے اس کے سر کا زخم دھویا۔ اس کی انگلیاں بڑی پھرتی سے اپنا کام کر رہی تھیں۔ زخموں پر پٹی باندھ دینے کے بعد اس نے اس کے جسم کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھنا شروع کیا۔ اس نے اس کی ٹانگیں ہلا جلا کر دیکھیں۔ اس کے بازو، کلائیاں، گھٹنے، گردن سب کو بڑی نرمی سے ہلایا جلایا اور اسے یک گونہ تسکین محسوس ہوئی۔ پھر اس نے اسٹیتھسکوپ لگا کر دل کی حرکت اور سانس کی آمد و رفت کا جائزہ لیا۔ اسے کسی قسم کی شدید چوٹ نہ آئی تھی۔ سر کا زخم بھی معمولی تھا۔

اس نے کھڑکی کھول دی اور دروازہ مقفل کر کے کچن کی طرف گیا۔ باورچن سے کہا کہ آج آشاں اپنی ایک سہیلی کے ہاں دعوت پر گئی ہے اور وہ آج کھانا نہیں کھائے گا۔ چوزے کا سوپ ہی پی لے گا۔ باورچن دل میں خوش ہوئی کہ جان چھوٹی۔
باورچن کے چلے جانے کے بعد منیر احمد دیر تک برآمدے میں ٹہلتا رہا۔ آشاں ابھی تک بے ہوش تھی۔ لیکن اسے اس بات پر اطمینان تھا کہ اس کی زندگی کو کوئی خطرہ درپیش نہیں تھا۔

باہر پورا چاند چیڑھ کے درختوں کی نازک شاخوں میں الجھا ہوا نظر آرہا تھا۔
منیر احمد عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ دور جھینگر بول رہے تھے۔ وہ رات کی

تاریکی میں بیسا کھیاں ٹیکتا ہوا باڑ میں سے نکل کر مسیح پال سنگھ کے مکان کی طرف بڑھا۔ وہ کمرے میں بیٹھا نظر آرہا تھا لیکن وہ اکیلا نہ تھا۔ مارتھا اس کے پاس بیٹھی تھی۔ یہ چوروں کی طرح کھڑکی کے قریب کھڑا ہوگیا۔ دل میں ڈر رہا تھا کہ اگر اسے کوئی اس حالت میں دیکھ لے تو نہ معلوم کیا سمجھے۔ بارے مارتھا دوسرے کمرے میں گئی تو اس نے مسیح پال سنگھ کو آواز دی۔ مسیح پال نے اسے اندر بلا لیا۔ لیکن اس نے کہا کہ وہ اس سے تنہائی میں بات چیت کرنا چاہتا ہے۔

مسیح پال سنگھ گھبرایا ہوا ننگے سر ہی باہر نکل آیا۔ چیڑھ کے درختوں تلے پہنچ کر وہ دونوں ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ منیر احمد نے ساری بات کہہ سنائی۔ مسیح پال سنگھ نے کل واقعہ سننے کے بعد کہا۔ ''یہ بالکل معمولی بات ہے۔ جوانی کی عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔ اس قسم کی باتوں پر آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہئے بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ آپ لڑکی کی شادی کردیں بلکہ آپ کو چاہئے تھا کہ یہاں تک نوبت پہنچنے سے پہلے اس کی شادی کردیتے۔''

اس کے بعد مسیح پال سنگھ نے اپنے مخصوص لب و لہجہ میں ایک بڑی لمبی چوڑی تقریر کی۔

منیر احمد کے دل کو بڑی تسکین حاصل ہوئی' باتیں کرنے سے اس کے جی کا بوجھ ہلکا ہوگیا۔ پھر جب وہ رخصت ہونے کے لیے اٹھا تو محجوب سا ہو کر بولا۔ ''افسوس تو اس امر کا ہے کہ میں نے بچاری کو پیٹ ڈالا۔''

زندگی میں ایک مرتبہ پھر سکھوں کے خاص انداز میں بے باک قہقہہ لگا کر مسیح پال سنگھ کہنے لگا۔ ''مسٹر منیر احمد آپ سے چار انگلی بلند قامت اور مضبوط تر جسم والی نوجوان لڑکی کا آپ کے گھونسوں سے کچھ نہیں بگڑ سکتا۔''

جب منیر احمد واپس آیا تو اس نے دروازہ کھول کر دیکھا کہ آشاں اب بھی بے ہوش پڑی ہے۔ بڑی کھڑکی میں پورے چاند کی دودھ کی سی سفید روشنی اندر داخل ہو رہی

تھی۔ وہ اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ آشاں کی قمیص کے چیتھڑے ہو کر لٹک رہے تھے۔ ان چیتھڑوں پر بھدے رنگ کے خون کے دھبے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ اس نظارے کی تاب نہ لا سکا۔ اس نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اس کی قمیص اتاری اور جلدی سے منہ پھیر کر اسے آتشدان میں پھینک ماچس دکھادی۔

کمرے میں مکمل خاموشی طاری تھی۔ صرف کلاک کی ٹک ٹک سنائی دے رہی تھی۔ اس کے دل پر ایک غبار سا چھا رہا تھا۔ اس کی ٹانگ لڑکھڑا رہی تھی۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں سے دھلی ہوئی قمیص نکالی اور بڑی احتیاط سے نظریں زمین پر گاڑے ہوئے وہ آشاں کے پلنگ کی طرف قدم بقدم بڑھ رہا تھا...... دفعتہً اس کی آنکھیں اوپر اٹھ گئیں......

سفید چاندنی میں اُجلے بستر پر نور کے سانچے میں ڈھلا ہوا بے داغ اور بے عیب جسم ایسے پڑا تھا جیسے سیپ میں موتی..........

یہ افسانہ السانوی مجموعہ پہلا پتھر میں شامل ہے۔

تعمیر

بوسیدہ صوفے میں دھنسے دھنسے اس نے سگرٹ کا ایک طویل کش لینے کے بعد منہ کھولا تو گہرے سرمئی رنگ کے دھوئیں کا کلبلاتا اور بل کھاتا ہوا بادل باہر نکل کر فضا میں پھیلنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس کی مندی ہوئی آنکھوں کے آگے سے دھوئیں کا پردہ ہٹ گیا اور دیوار پر لٹکی ہوئی بڑے سائز اور پرانے ڈھنگ کی رنگین تصویر صاف نظر آنے لگی۔

آج کل اس قسم کی تصویروں کا رواج نہیں تھا لیکن لالہ جی کے گمنام ہوٹل کے سنسان کمرے میں اور کس چیز کی توقع کی جاسکتی تھی؟ تصویر میں پرانے زمانے کے کسی مہاراجہ کے رنگ محل کا اندرونی منظر دکھایا گیا تھا۔ نوجوان رانی سکھیوں کے ہمراہ نیلے پانی کے تالاب کے کنارے کھڑی تھی۔

ہائے کس قدر دل گداز منظر تھا یہ!

وہ مہ وش رانی جس پر بھولے سے نگاہ ڈالنے والے شخص کی آنکھیں نکلوا دی جاتی ہوں گی— اور پھر اس دل ربا کے محل کا یہ حصہ جہاں بلا اجازت شاید کوئی پرندہ بھی پر مارنے کی جرأت نہیں کرتا ہوگا— ان سب پر طرہ یہ کہ عین غسل کا سماں...... ایک سے ایک بڑھ کر مہ جبین...... ان میں سے مکمل طور پر عریاں ابھی کوئی بھی نہیں تھی۔ کپڑے اتارنے کے سارے مراحل ابھی طے نہیں ہونے پائے تھے......

آ گئی؟

وہ چونکا۔۔۔ نہیں یونہی کھٹکا ہوا تھا۔

کوئی نہیں، کوئی نہیں۔۔۔ دل زار اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔

صاف چاندنی رات تھی۔ انہیں اس وقت تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ خیر! شراب کا خمار ابھی باقی تھا۔ اس لیے وہ اپنے ذہن کو بے خیالی کے عالم میں ڈگمگانے کی اجازت دے سکتا تھا۔

تصویر والے تالاب میں گہرے سبز رنگ کی کائی کے تودے پانی میں ہچکولے لے رہے تھے۔ ان تودوں میں سے گذرتے ہوئے ہنس ادھر اُدھر تیرتے پھرتے تھے۔ عورتیں چکنے اور نم دار فرش پر اس انداز سے کھڑی تھیں جیسے لمحہ بھر میں وہ اپنے بچے کھچے کپڑے بھی اتار پھینکیں گی اور پھر خوش رنگ نیلے پانی کی تہوں میں سے لو دیتے ہوئے ان کے جگمگاتے بدن کیا ہی حسین سماں پیدا کریں گے۔

آ گئی؟

اس نے پھر گھوم کر دیکھا۔

"جی ہاں۔"

ملازم کی زبانی یہ جواب سن کر اس نے خاص بے چینی کا اظہار نہیں کیا۔ البتہ سگریٹ کا کش لیتے ہوئے نگاہ دروازے پر گاڑ دی۔

لڑکی اندر داخل ہوئی۔ اس کا لباس بھڑک دار ضرور تھا لیکن اس میں کوئی کشش نہیں تھی، نہ اس کی وجہ سے لڑکی کے حسن میں اضافہ ہوا تھا۔ لڑکی کا رنگ سانولا خد و خال معمولی، لیکن بحیثیت مجموعی صورت دل کش اور بدن نوخیز و عطر بیز تھا۔

نو وارد چھوکری دیدہ دانستہ اس انداز سے کھڑی ہوگئی کہ سر سے پاؤں تک بخوبی اس کو دیکھا جا سکے۔ گاہک نے بظاہر نیم وا آنکھوں لیکن حقیقتاً متجسس نگاہوں سے لڑکی کی صورت کا جائزہ لیا۔ سنولائے ہوئے رنگ پر نوخیز خون نے عجب نکھار پیدا کر دیا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی ہموار اور تنی ہوئی جلد دیکھ کر وہ بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ اندر سے کیسی ہوگی۔

چنانچہ اس نے لڑکی سے نگاہ ہٹا کر اس کے ہمراہ کھڑے ہوئے مرد کی جانب دیکھا۔ پھر اس سے بھی نگاہیں پھیرلیں اور کھڑکی میں سے نظر آنے والے آسمان میں روئی کے گالوں کے مانند بادلوں کی ٹکڑیوں پر نظر جمادی۔ وہ ٹکڑیاں یوں دکھائی دیتی تھیں جیسے بے کنار سمندر میں برف کے تودے اٹھکیلیاں کر رہے ہوں۔

قدرے تامل کے بعد اس نے سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور لڑکی کے ساتھی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''رات بھر رہنا ہوگا۔''

لڑکی کے ساتھی کی مونچھیں گھوم کر اس کے بھینچے ہوئے لبوں میں گھسی ہوئی تھیں۔ اس نے بات کا جواب دینے کے لیے منہ کھولا تو مونچھیں ہوا کے زور سے متحرک ہوگئیں جیسے کنکھجورا رینگنے کو ہو۔ لیکن گاہک نے یہ تماشہ نہیں دیکھا۔ اس کی نظریں آسمان پر جمی تھیں۔

اثبات میں جواب پاکر اس نے گردن گھمائے بغیر دریافت کیا۔ ''ریٹ کیا ہے؟''

''ریٹ تو— خیر پچاس روپے پر معاملہ طے ہوجائے گا۔''

''پچیس''

اس نے قدرے تامل کیا— ''یہ بہت کم ہے......''

''نہیں— بس ٹھیک ہے— تم زیادہ طلب کرتے ہو۔''

''اجی واہ...... لوگ رات بھر کا دو دو سو بھی خرچ کر ڈالتے ہیں۔''

''مال مال کی قیمت ہے۔''

لڑکی نڈھال سی ہوگئی تھی— اس نے لڑکھڑا کر دیوار کا سہارا لیا۔

''تم بیٹھ جاؤ۔'' ساتھی بولا۔

''چاہو تو جاسکتے ہو تم لوگ۔'' گاہک نے کہا۔

لڑکی کرسی پر بیٹھ چکی تھی لیکن اٹھنے کے لیے پر بھی تول رہی تھی۔

اس کا ساتھی عجیب کشمکش و پیچ میں پڑ گیا تھا۔ دیر تک بے تکی سی خاموشی طاری

رہی۔ آخر اس نے غیر مستحکم آواز میں کہا۔ "آپ ہمیں کچھ زیادہ دے دیجئے۔ ہم لوگ شریف ہیں...... لیکن رفیوجی ہیں...... کیا کریں کیا نہ کریں۔"

"میں بھی رفیوجی ہوں۔"

اب لڑکی کا ساتھی بالکل "دم بخود" ہو کر رہ گیا۔

ادھر سگریٹ کے تیز تیز کش لگائے گئے۔ پھر اس کی ڈبی پھینک دی گئی۔ آواز گونجی۔ "بتیس دے سکوں گا۔ بس۔ اب تم — یا تم دونوں جاسکتے ہو۔"

گاہک کی فیصلہ کن بات سن کر مرد نے لڑکی کی جانب دیکھا لیکن دونوں کی نظریں مل نہیں سکیں۔ کیونکہ لڑکی کے چہرے بلکہ سارے بدن پر بے حسی طاری تھی۔ اس کے پپوٹے جھکے ہوئے تھے۔ یوں ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ اپنی خوش وضع چھوٹی چھوٹی چھاتیوں کے ابھار بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہی ہے۔

بالآخر ساتھی نے بے کیف آواز میں کہا۔ "اچھا میں چلا جاتا ہوں۔"

دس دس کے تین نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیئے گئے اور وہ اپنے پیچھے دروازے کو بھیڑتا ہوا سست قدموں سے روانہ ہو گیا۔

وہاں اب وہ دونوں رہ گئے تھے۔

مرد نے نیا سگریٹ سلگایا اور لڑکی کی جانب متوجہ ہوئے بغیر بڑے انہماک سے کش پر کش لینے لگا۔ سودے بازی کے معاملوں سے اسے خاص کوفت محسوس ہوتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کوفت کا غبار اس کے دل سے دور ہو جائے تو وہ لڑکی کی جانب متوجہ ہو۔

کمرے میں مکمل سناٹا تھا۔

دفعتہً عجیب شور بلند ہوا — مہر سکوت ٹوٹ گئی — اور چند لمحوں کے بعد اسے اس بات کا احساس ہوا کہ لڑکی نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت تک وہ کسی نہ دب سکنے والے درد کو بزور دبائے بیٹھی رہی تھی لیکن بالآخر لاوا بہہ نکلا۔

لڑکی کی اس حرکت سے اسے سخت کوفت ہوئی لیکن وہ منہ سے کچھ نہیں بولا بلکہ اطمینان سے سگریٹ پیتا رہا۔ ایک ختم ہوتا تو وہ اسی سے دوسرا سلگا لیتا۔

لڑکی پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی جیسے وہ اپنا کلیجہ پگھلا کر آنسوؤں کے ذریعہ سے بہا دے گی۔ بالآخر رونے کی شدت میں کمی ہونے لگی...... اور پھر — رفتہ رفتہ رونا دھونا ختم ہوگیا۔ اب صرف ہچکیاں باقی رہ گئی تھیں۔

وہ کرسی سے اٹھا۔ اس اثنا میں لڑکی کمرے کے ایک گوشے میں کھڑی ہوگئی تھی اور اپنی ہچکیوں میں دبی ہوئی تھی۔ مرد ٹانگیں لٹکا کر پلنگ پر نیم دراز ہوگیا۔ سر کے نیچے پروں والا تکیہ ڈال لیا۔ دھواں کبھی منہ سے اور کبھی نتھنوں سے نکالنے میں مشغول رہا...... اور خواب ناک نظروں سے سانولی سلونی لونڈیا کو دیکھتا رہا۔ اب وہ تھوڑے تھوڑے سے وقفے کے بعد ہچکیاں لیتی تھی لیکن اس قدر گہری اور جھنجھوڑ دینے والی کہ ہر ہچکی پر وہ سر سے پاؤں تک لرز جاتی تھی۔

اس نے لڑکی کی دھلی دھلائی آنکھوں، نمی سے بوجھل پلکوں اور لو دیتے ہوئے ہونٹوں کی جانب دیکھا — ان دونوں کو یوں محسوس ہوا کہ اس سکوت میں گفتگو کیے بغیر وہ بھی ایک دوسرے سے واقف اور مانوس ہوگئے ہیں...... لڑکی کے گالوں پر آنسو ٹپ ٹپ کر کے اس کے لباس پر بھی گرتے رہے تھے۔

مرد نے باتھ روم میں پڑے ایک تولیے کی گیند بنا کر لڑکی کی جانب پھینکی اور غیر جذباتی آواز میں کہا "لو آنسو پونچھ ڈالو...... لباس بھی خراب کر لیا ہے تم نے ...... گالوں پر پھیلے ہوئے آنسوؤں کو تھپتھپا کر خشک کر ڈالو۔ پوڈر بالکل صاف ہو جائے...... یقیناً یہ دیکھ کر مجھے بے حد مسرت حاصل ہوئی کہ تم نے پوڈر منہ پر تھوپنے کی کوشش نہیں کی۔ اس سے تمہارے ذوق کی پاکیزگی کا ثبوت ملتا ہے۔

حالانکہ آدمی کی آواز قطعاً غیر جذباتی تھی لیکن نہ معلوم اس میں کیا کشش تھی کہ لڑکی نے جلدی سے اس کی ہدایت کے مطابق چہرہ صاف کر ڈالا۔

آنسو پونچھ لینے کے بعد اس نے مرد کی جانب یوں دیکھا جیسے جاننا چاہتی ہو کہ اب میں کیسی دکھائی دیتی ہوں۔ لیکن مرد بے حس و حرکت اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بھڑک دار اور بے ہودہ لباس کے باوجود اس کے بدن کی رعنائی عیاں تھی۔ ہاتھ پاؤں مضبوط، کشیدہ قامت، لمبی اور لچک دار گردن اور پھر سانولا رنگ عجب بہار دکھا رہا تھا۔

"تمہاری عمر کیا ہے؟" مرد نے بات شروع کی۔

"سترہ برس۔"

"کیا تم گاؤں کی رہنے والی ہو؟"

"جی ہاں لیکن شہر میں پڑھتی رہی ہوں۔"

"آخر تم پڑھی لکھی بھی ہو؟"

"جی۔"

"کہاں تک؟"

"دسویں میں تھی کہ......"

"فسادات شروع ہو گئے۔"

"نہیں۔۔۔ شادی ہو گئی تھی۔"

"اچھا تو پھر تم اپنے شوہر کے ساتھ رہنے لگیں۔"

"یہی تین چار مہینے۔۔۔ پھر فساد شروع ہو گئے۔"

"اور تمہارے بچے......"

"مارے گئے...... سب مارے گئے...... صرف میں بچ گئی یا بچا لی گئی۔ وہاں میری عزت کئی بار خراب کی گئی۔ بالآخر ادھر لائی گئی لیکن جن کا سہارا لیا انہوں نے پیشہ کروانے پر مجبور کر دیا۔"

قدرے سکوت کے بعد مرد نے کہنا شروع کیا۔" میری عمر تیس برس کی ہے۔ تقسیم سے پہلے میں سیالکوٹ میں کاروبار کرتا تھا۔ میں کوئی خاندانی رئیس نہیں تھا

لیکن اچھا خاصہ گذارا ہو رہا تھا۔ بیوی اور دو بچے بھی تھے — اب کوئی نہیں اور نہ آمدنی کا کوئی معقول ذریعہ ہے۔ جب کبھی بمشکل بیس تیس روپے جمع ہوجاتے ہیں تو عورت کی شکل دیکھنی نصیب ہوتی ہے۔ میری صورت کی بابت تمہارا کیا خیال ہے..... میرے بال بہت ملائم ہیں لیکن جب صبح برش کرتا ہوں تو کنپٹیوں سے چند بال نکل آتے ہیں۔ میرا رنگ صاف تھا لیکن اب چہرے پر سرمئی سا غبار چھایا رہتا ہے۔ آنکھیں بڑی تو نہیں تھیں لیکن ان میں وہ چمک بھی باقی نہیں رہی۔ تم جانتی ہی ہو کہ تفکرات اور بے قاعدہ رہن سہن سے انسان کی صحت پر بہت برا اثر پڑتا ہے.....''

''ہاں — لیکن آپ اچھے آدمی ہیں۔'' لڑکی نے طفلانہ انداز سے کہا۔

''اچھا آدمی؟ — بس؟ ارے دوسری عورتیں تو میری تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتی تھیں اور تم مجھے محض اچھا آدمی ہی کہتی ہو۔''

اسے لڑکی اس وقت بہت بھلی دکھائی دی۔ جب وہ اس سوال کے جواب میں اس کی جانب دیکھے بغیر دل کش انداز میں قدرے ہنستے ہوئے سر کو جنبش دے کر صرف لمبی سی مترنم ''ہوں'' کر کے رہ گئی۔

مرد نے لیٹے لیٹے پوچھا۔ ''یہ دھندا کب سے کر رہی ہو اور..... میرا مطلب ہے کہ کب سے کروایا جارہا ہے.....''

اس پر لڑکی کا منہ پھولنے لگا۔ پھر سے اس کے رونے کے امکانات پیدا ہونے لگے..... بولی۔ ''ایک مہینے سے'' اور پھر جیسے اس کی آواز بھرا کر رہ گئی۔

مرد نے عجلت سے کہا۔ ''دیکھو بھئی! باوجودیکہ تم یہاں — دھندے کے سلسلے میں آئی ہو یا لائی گئی ہو..... اور میں حیوانی جذبے کے تحت آیا ہوں..... یا لایا گیا ہوں..... تاہم ہمیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ ہم شریف لوگ ہیں.....''

یوں معلوم ہوتا تھا کہ اب ہنسی لڑکی کے لبوں سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئی ہے۔ وہ جھنجلا کر بولی۔ ''لیکن اب میں بے حد تنگ آگئی ہوں۔ ہر روز جب میری بابت

سودے بازی ہوتی ہے..... تو میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ میں اس قدر گہرے کھڈ میں گر چکی ہوں یا گرادی گئی ہوں کہ اب میرا یہاں سے نکلنا ناممکن ہے۔ آپ..... آپ پھر بھی شریف ہیں لیکن عورت کی حیثیت سے.....''

''نہیں..... کیا نام ہے تمہارا..... میں تم سے زیادہ شریف نہیں ہوں۔ اگر ہوتا تو تمہیں اور تم ایسی لاکھوں لڑکیوں کو یہ پیشہ اختیار کرنا نہ پڑتا۔''

یہ کہہ کر اس نے کمرے میں ادھر اُدھر بے چینی سے ٹہلنا شروع کر دیا۔ اس وقت لڑکی کرسی پر بیٹھی تھی۔

وہ ٹہلتا رہا۔ چند منٹ کے بعد اس نے پھر لڑکی کی جانب دیکھا کہ وہ سر جھوڑائے نظریں فرش پر گاڑے ہے اور عمیق غور و فکر میں ڈوبی ہوئی ہے۔

''تم کیا سوچ رہی ہو؟''

وہ چپ رہی۔

''تم چپ کیوں ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' لڑکی نے بے کیف آواز میں جواب دیا۔ ''یونہی۔ بیتے دنوں کو یاد کر رہی ہوں۔ اپنی زندگی کا وہ آغاز اور یہ انجام دیکھ کر دل ڈوبا جاتا ہے۔''

''..... اور شاید اسی سلسلے میں تم یہ بھی سوچ رہی ہو کہ یہ سب قتل و غارت اس لیے ہوا کیونکہ سب کے سروں پر شیطان کا سایہ مسلط تھا۔''

''جی ہاں۔''

''لیکن یہ غلط ہے۔''

لڑکی نے قدرے متعجب ہو کر اس کی جانب دیکھا۔

چندے تامل کے بعد مرد نے پھر سلسلۂ کلام جاری کیا۔ ''درحقیقت یہ سب کچھ نیکی کی خاطر پیش آیا ہے۔ مرنے والے نیکی کی راہ میں مرے ہیں اور مارنے والوں نے اللہ ہو اکبر، بم بم بھولے اور ست سری اکال کے نعروں کے شور میں قتل کیے ہیں۔ مجھے

تو اس میں ناپاکی کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ یہ درست ہے کہ قتل ہوتے وقت مرنے والوں کو تکلیف ضرور ہوئی ہوگی۔ لیکن اب...... اب تو وہ لوگ یقیناً بہشت میں حور و غلمان سے دل بہلا رہے ہوں گے یا سورگ میں گوکل کے کنھیا کی بنسری کی لے پر مسرور و شاداں ہوتے ہوں گے۔ یا ان کی روحیں ننھے منے رنگین پرندوں کے روپ میں سورگ کے سرسبز و شاداب درختوں کے پانی کے چشموں پر جھکی ہوئی نازک شاخوں پر جھولنا جھولتی ہوں گی...... سمجھیں۔"

لڑکی نے انکار کے طور پر سر ہلا دیا۔

مرد نے پھر تامل کیا...... اور کہا۔" بات سیدھی سادی ہے۔ قاتلوں اور لٹیروں کی نیتیں صاف تھیں۔ طرفین نے ایک دوسرے کو انسان نہیں شیطان سمجھ کر قتل کیا ہے۔ یعنی کسی مسلمان نے کسی بھی ہندو یا سکھ کو خدا کا نیک بندہ سمجھ کر قتل نہیں کیا۔ کیونکہ خدا کے کسی بھی نیک بندے کو جان سے مارنے کے لیے برے سے برا مسلمان بھی راضی نہیں ہوسکتا اور یہی بات ادھر بھی صادق آتی ہے۔ تم کو یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ ہم لوگ...... یعنی ہندو، سکھ اور مسلمان—— وحشی نہیں ہیں۔ ہم سب نیک انسان ہیں۔ روز ازل سے سچائی اور محض سچائی کے متلاشی اور پرستار ہیں بلکہ نیکی اور بدی کے معاملے میں ہماری معنویت کا یہ حال ہے کہ ہم بڑے اطمنان سے لاکھوں' کروڑوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار سکتے ہیں—— اے بھولی اور نادان لڑکی! سمجھ لے اور مت بھول کہ نیکی کی راہیں بے حد دشوار ہیں......"

"میں خاک نہیں سمجھی۔"

مرد بیٹھ گیا۔ وہ ایک دوسرے کی جانب خاموش نظروں سے تکتے رہے' پھر لڑکی بولی۔"اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ میں بھی نیکی کی راہ میں......"

"ہاں" مرد اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسکرایا۔

لڑکی لاچار ہو کر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر دبانے لگی۔

مرد نے اس کی دلی کیفیت کو بھانپتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تم یہ خیال بھی تو کرو کہ اب تم گھریلو عورت کی زندگی کیوں کر بسر کرسکتی ہو؟''

دفعتہً اسے وہ اجنبی مرد یاد آگئے جنہوں نے فسادات کے دنوں میں بار بار اس کی عزت لوٹی تھی اور پھر ہم قوم مردوں کا کارواں آنکھوں تلے سے گذرنے لگا۔ جنہوں نے اس کے واپس لائے جانے پر اسے تباہ کیا تھا اور ایک مرتبہ پھر وہ رو پڑی...... پھوٹ پڑی۔

''یہ بات مجھے قطعاً پسند نہیں ہے......'' مرد نے نرم لہجے میں احتجاج کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ '' تم پڑھی لکھی، سمجھدار اور نیک لڑکی ہو۔ ذرا اس بات کا خیال بھی تو کرو کہ میں نے مبلغ تیس روپے اس غرض سے نہیں خرچ کیے ہیں کہ تم میرے رو برو بیٹھی رات بھر روتی رہو۔''

اس پر لڑکی فوراً چپ ہوگئی۔ اس کی آنکھوں کے گوشوں میں جو آنسو ابل رہے تھے وہ بھی قطرے بن کر نہیں ٹپک سکے بلکہ پلکوں ہی میں الجھ کر اور لرز کر رہ گئے۔

مرد نے اسی لہجے میں سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ ''تم آزاد اور آرام وہ زندگی کی عادی ہوچکی ہو۔ اب گھر کا کام کاج کرنا شاید موافق نہ آئے۔ کہاں یہ عیش و عشرت اور کہاں، کسی غریب جھونپڑے کی محدود چار دیواری...... کہاں یہ رنگین بھڑک دار لباس اور کہاں ......؟''

معاً دونوں کی نظریں ملیں۔ لڑکی جنگلی بلی کے مانند بپھری بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں...... مرد چپ ہوگیا۔ دفعتاً لڑکی کے ہاتھ اٹھے اور اس نے وحشیانہ انداز سے گریبان چاک کر ڈالا اور قمیص تار تار کر ڈالی اور پھر شاید اسے رونا آنے لگا لیکن وہ ہٹ دھری سے آنسو پی کر شدید جنبش دے کر اور ہونٹ سختی سے بھینچ کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔

اس کے بدن کا اوپر کا حصہ عریاں ہوچکا تھا۔ اس نے انگیا نہیں پہن رکھی تھی۔

شاید اس کی چھاتیاں انگیا کی ضرورت سے بے نیاز تھیں جو ڈھیلا ڈھالا کپڑا اس نے سینہ پر باندھ رکھا تھا وہ خود بخود ڈھلک گیا۔

مرد نے اٹھ کر اس کے چیتھڑوں سے ہی اس کے بدن کو ڈھانپ دیا اور خود ذرا پرے ہٹ کر پوچھا۔ ''کیا اب میں تم کو چوم سکتا ہوں۔''

''کیوں نہیں۔'' لڑکی نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

وہ اس کے قریب پہنچا۔ اس نے اس کے پریشان بالوں کو سنوارا اور دھیرے دھیرے دوستانہ انداز سے اس کے گرم رخساروں اور گھنے بالوں پر چمکارے کے انداز سے ہاتھ پھیرتا رہا۔ اس کا لڑکی کے دل پر خوشگوار اثر ہوا۔ قریب کی تپائی پر دھرے ہوئے آئینے میں دونوں کی نظریں ملیں۔ لڑکی نے آہستہ سے کہا۔ میری اس مانگ میں سندھور پڑ چکا ہے ایک مرتبہ۔''

''شاید پھر پڑے۔'' مرد نے غیر جذباتی آواز میں جواب دیا۔

اس بات کا لڑکی کے دل پر اور بھی خوشگوار اثر ہوا۔ اس کے چہرے سے خشونت کے آثار زائل ہونے لگے تو مرد نے اس کے بال پرے ہٹا کر شانے کی جانب گردن کے نچلے حصے کی سب سے زیادہ پھڑکتی ہوئی رگ پر ہونٹ رکھ دیئے۔

لڑکی کو لذت اور گدگدی کا احساس ہوا۔

''لو میں ذرا دروازہ بند کردوں۔'' یہ کہہ کر وہ دروازے کی جانب بڑھا۔ تو لڑکی نے اس کی جانب دیکھے بغیر خوشگوار لہجے میں کہا۔ '' آج جس مقام کا آپ نے بوسہ لیا ہے اسے پہلے کبھی کسی نے نہیں چوما...... میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میرے بدن کا یہ حصہ بالکل کنوارا ہے' بے عیب اور پاک ہے......''

آواز آئی۔ ''شاید اب تمہارے بدن کے کسی بھی حصے کو کوئی اور مرد نہیں چھو سکے گا۔'' اب کے مرد کی آواز میں جذبات کی ہلکی سی لرزش موجود تھی۔

لڑکی نے دفعتہً گھوم کر اس کی جانب دیکھا لیکن وہ اس وقت چٹخنی چڑھا رہا تھا۔

اس کے سر کے بال قدرے بڑھے ہوئے تھے اور انہوں نے بڑھ کر اس کے نکھرے رنگ کی گردن کے کچھ حصے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ دروازہ بند کر کے فوراً لوٹ آئے...... لیکن نہ معلوم مرد نے کیوں تامل کیا۔ وہ یوں محسوس کر رہی تھی کہ خود اس کے بدن کی طاقت بھی زائل ہو چکی ہے اور وہ کرسی سے اٹھ نہیں سکتی...... لیکن اس نے نقاہت کے عالم میں بہ کمال مہر و اخلاص مرد کے سر کے پچھلے حصے کو دیکھا اور اس کے دل نے سوال کیا۔ "کیا اس ساری غلاظت اور سڑانڈ کے باوجود جو میرے بدن میں داخل ہو چکی ہے۔ کیا ان سب بدمعاشیوں کے باوجود جو میرے جسم کے ساتھ کی جا چکی ہیں۔ کیا ان......"

اب مرد نے سر گھمایا اور لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے بھرپور نظروں دیکھا۔ اس کے لبوں پر دلفریب مسکراہٹ پھیلنے لگی جیسے وہ اپنے مخصوص انداز میں کہہ رہا ہو۔ "اے بھولی اور نادان لڑکی! سمجھ لے اور مت بھول کہ ان ساری زیادتیوں، غلاظتوں، بدمعاشیوں سے تیری معصومیتیں اور نکھر آئی ہیں......"

پھر وہ اس کی جانب قدم بہ قدم بڑھنے لگا۔ اب کے لڑکی اپنے آنسو نہیں روک سکی۔ وہ پھر زور زور سے رونے لگی۔ مرد نے اسے چپ کرانے کی کوشش کی لیکن وہ شدت جذبات سے لرزتے ہوئے شانوں کو ہلا کر بلند تر آواز میں روتے ہوئے چلائی۔ "نہیں میں ضرور روؤں گی۔" مرد چپکے سے آ کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ اس نے پھر ایک سگریٹ سلگایا اور کمال اطمینان سے ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔

لڑکی بدستور روتی رہی لیکن مرد کو اس کے رونے سے کوفت محسوس نہیں ہو رہی تھی کیونکہ اب وہ اس چیز کو قطعاً گرلیلا نقطۂ نظر سے دیکھ رہا تھا۔

یہ افسانہ افسانوی مجموعہ پہلا پتھر میں شامل ہے۔

اعتراف

بیمار خاوند کے پلنگ کے قریب بچھی ہوئی آرام کرسی پر دراز شاہدہ آنکھیں موندے اپنے خیالات میں گم تھی۔

بظاہر مریض کی آنکھیں بند تھیں لیکن اس بات کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا کہ آیا نقاہت کی وجہ سے اس کی آنکھیں بند تھیں یا وہ واقعی سوگیا تھا یا قطعاً بے ہوش پڑا تھا۔ اس کے حساس نتھنوں کو جنبش تک نہیں ہو رہی تھی۔ سانس کم کم اور نامعلوم لیکن وہ ضرورت سے زیادہ پتلی تھی جیسے وہ شکنجے میں دبا دی گئی ہو۔ نتھنے روئی کے پردے کے مانند باریک۔ وہ ہر وقت سرخ، نمدار اور متحرک رہتے تھے۔ نتھنوں کے اندرونی حصے بالوں کی فراوانی کے باعث بالکل سیاہ دکھائی دیتے تھے جو بال نتھنوں سے باہر نکل آتا اسے چمٹی سے نوچ کر پرے پھینک دیا جاتا تھا۔

وہ کئی روز سے بیمار تھا۔ ڈاکٹر سمجھ چکے تھے کہ مریض کا بچ جانا ناممکن ہے۔ لیکن مریض کی حسین اور جوان بیوی پر یہ راز افشا کرنے کا انہیں حوصلہ ہی نہیں ہوتا تھا۔

شاہدہ شب و روز خاوند کی تیمار داری کیا کرتی۔ چوبیس گھنٹوں میں اس کی بجھی بجھی آنکھوں میں موہوم سی چمک صرف اسی وقت پیدا ہوتی تھی جب رات کے دس بجے کے قریب اسے سیٹی کی ہلکی سی آواز سنائی دیتی تھی۔ اسے اس سے محبوب کی آمد کی اطلاع

ٹل جاتی تھی۔ شوہر کے بیزار ہونے سے پہلے بھی— پچھلے چند مہینوں سے اس کا یہی معمول ہو گیا تھا۔ سارا دن ان چند کیف انگیز لمحوں کی یاد میں بیت جاتا تھا۔ اگر کبھی ناغہ ہو جاتا تو اس کا دم گھٹنے لگتا اور جان لبوں تک آ جاتی تھی۔

کل رات بھی اس کا محبوب ایک روز کے ناغے کے بعد آیا تھا..... اور وہ دل ہی دل میں بے پرواہ! ظالم!! بے پرواہ! ظالم!! کی رٹ لگا رہی تھی کہ باہر سے سیٹی کی آواز آئی..... اس کا دل دھڑکنے لگا۔ جب بھی ناغہ ہو جاتا تو وہ یہی سمجھتی تھی کہ اس کا محبوب کبھی نہیں آئے گا..... سیٹی کی آواز سے گویا سوکھے دھانوں پر پانی پڑ جاتا۔

باہر رات پرسکون اور ہوا خنک تھی۔

تاروں کی مدھم روشنی میں شاہدہ کی صورت پھیکی پڑتی ہوئی تصویر کے مانند دکھائی دے رہی تھی۔ وہ برآمدے کے سفید چوبی جنگلے پر بیٹھ گئی اور لان کے پرلے سرے پر اُگے ہوئے چیڑھ کے درختوں کے گھنے سائے کی جانب گھور گھور کر دیکھنے لگی۔ اس کے بکھرے ہوئے گھنے اور سیاہ بال کالی گھٹاؤں کی طرح چاند سے مکھڑے کو گھیرے ہوئے تھے۔ آنکھیں خشک اور کھوئی کھوئی سی، بھرے بھرے ہونٹوں پر بے کلی کی تہہ سی جم گئی تھی۔ بہ ہزار وقت وہ زبان نکال کر ہونٹوں پر پھیر لیتی تھی۔

اتنے میں بجری کے پچکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ دفعتہً اس کا محبوب آتا دکھائی دیا۔ لان سے ہٹ کر وہ بجری بچھی روش پر چل رہا تھا۔ قدم بہ قدم..... اس کی عمر بہ مشکل اٹھارہ یا انیس برس کی ہوگی کہ اس نے تھوڑی پر استرا پھیرنا شروع کر دیا تھا لیکن مونچھیں جن کی حقیقت نرم و نازک روؤں کے سوا کچھ نہیں تھی، ابھی سلامت تھیں۔ شاہدہ عمر میں اس سے چھ سات برس بڑی تھی لیکن نازک اندام ہونے کی وجہ سے اس کی ہم عمر ہی دکھائی دیتی تھی۔ نوجوان کی صورت سے مردانگی کے بجائے لڑکپن کا الھڑپن زیادہ عیاں تھا۔ چہرہ اس قدر بھولا تھا گویا منہ میں دانت ہی نہیں ہیں۔

اس نے آتے ہی شاہدہ کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔ تنگ چولی کے دامن میں عورت کا سینہ مچلنے لگا۔ اس نے شکایت کرنی چاہی کہ آخر اس نے ایک رات کا ناغہ کیوں کیا لیکن ہونٹ لرز کر رہ گئے۔

''تم اداس ہو۔'' نوجوان نے سرگوشی میں پوچھا۔
''نہیں تو۔'' شاہدہ کے لبوں سے آہ سی نکل گئی۔ اس نے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بے کیفی کی تہہ معدوم ہوتی جارہی تھی اور ہونٹوں کی شادابی ختم ہوتی جارہی تھی۔

وہ آہستہ سے ہنس پڑا۔ اس ہنسی میں مسرت، رنج یا شرارت کا جذبہ کارفرما نہیں تھا۔ لیکن یہ بے معنی ہنسی بھی نہیں تھی۔ یہ الھڑپن کی ہنسی تھی۔ بہار زندگی کی ہنسی تھی۔ جوانی ہنسا ہی کرتی ہے۔ پھر اس نے بند ہاتھ کھول دیئے اور اس میں چھپا ہوا عورت کا نسبتاً اجلا ہاتھ خرگوش کے ننھے بچے کے مانند کسمسانے لگا۔

شاہدہ کو یوں محسوس ہوا کہ اس کے جواب سے محبوب مطمئن نہیں ہوا تھا۔ اس نے پھر مری ہوئی آواز میں کہا۔ ''چار روز سے سوئی نہیں کبھی دو گھڑی کو آنکھ لگ بھی گئی تو کیا۔ شاید جاگنے کی وجہ سے چہرہ اتر گیا ہوگا۔ یوں بھی بے حد تکان محسوس کر رہی ہوں۔'' ...... یہ کہہ کر وہ اپنا ہاتھ پیشانی تک لے گئی۔ پھر اس نے سر پیچھے کی جانب جھکا دیا جیسے گردن کو جھٹکا دے کر اس کی ساری تکان دور کردینا چاہتی ہو۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹوں پر سوجن آگئی تھی۔

''تم سولیا کرو۔''

یہ سن کر عورت نے اس کی طرف بڑی عجیب نظروں سے دیکھا۔ ''سولیا کرو۔'' میں خود غرضی کی جھلک تھی۔ نوجوان نے محسوس کیا کہ اسے اس طرح نہیں کہنا چاہئے تھا۔ یہ خود غرضی ہی نہیں بلکہ سنگ دلی تھی کہ خاوند بیمار ہو اور بیوی مزے سے پڑی سویا کرے۔ شاہدہ اس قسم کے جذبات کا اظہار پسند نہیں کرتی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ ایسی والہانہ محبت جیسے وہ نوجوان اس کا عاشق نہیں بلکہ معشوق ہو۔ بعض اوقات اظہار محبت کرنے میں وہ خود بڑی گرم جوشی سے پہل کرتی تھی۔ وہ رخصت ہونے لگتا تو اس کے بازو اپنی کمر کے گرد لپیٹ لیتی اور کہتی۔ ''نہیں،

نہیں ابھی نہیں۔ ذرا تو رک جاؤ...... یہاں! اور پھر وہ محبت سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتی۔ اس کی گردن کے گرد بازو حائل کر کے لپٹ جاتی...... اس کی گرم جوشی کے مقابل اس کی اپنی محبت پھیکی نظر آنے لگتی— اور جب کبھی وہ ایک روز کے ناغے کے بعد آتا تو اس کی بے قراری دہشت سے کم نہیں ہوتی تھی "کل تم کیوں نہیں آئے؟ غالباً تمہیں یقین ہوگا کہ ناغہ کرنے کے بعد آؤ گے تو مجھے بدستور زندہ سلامت پاؤ گے۔ آں؟ کہو کہو لیکن یاد رہے۔ میں تمہیں خبردار کیے دیتی ہوں کہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا رہے گا۔ پھر وہ اس کے سارے چہرے کا بھوکی نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے کہتی۔ "میں ڈرتی ہوں...... کسی روز ہمیشہ کے لیے میری آنکھوں سے دور چلے جاؤ گے اور پھر لوٹ کر نہیں آؤ گے...... تمہاری راہ تکتے تکتے میری آنکھیں پتھرا جائیں گی...... بالآخر میں مر جاؤں گی۔

یہ الفاظ— بلند بانگ دعوے— یہ بنے بنائے گھڑے گھڑائے الفاظ جنہیں کہنے پر شاہدہ مجبور سی ہو جاتی تھی...... وفورِ جذبات کے مقابل الفاظ کی کم مائیگی پر شاہدہ کی آنکھیں پرنم ہو جاتی تھیں لیکن پیشتر اس کے کہ آنسو بھر آئیں آنکھوں کی نمی چوس لی جاتی۔

شاہدہ کی محبت اور وارفتگی کے باوجود نوجوان اپنے دل کے حال سے بے خبر نہیں تھا۔ وہ خود اس کی شخصیت سے مرعوب ہو چکا تھا۔ وہ اس سے ہر بات کی جواب طلبی نہیں کرتا تھا، نہ وہ اس کی ہر حرکت پر نکتہ چینی ہی کرتا۔ کئی باتیں اس کی عقل کے حدود سے باہر تھیں۔ لیکن اس نے شاہدہ کو ان کی وضاحت کرنے کے لیے کبھی نہیں کہا تھا۔ وہ کسی طرح بھی اس کے دل کو دکھ نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ شاہدہ کا اپنے خاوند سے گہرا لگاؤ اس کی سمجھ سے باہر ہی رہا۔ وہ ایک بچے کی ماں بھی تھی اور پھر ایک غیر مرد پر عاشق بھی تھی۔ ادھر خاوند سے بھی اس کا رشتہ قائم تھا۔ اس کے کھانے پینے، کپڑے لتے اور دیگر ضروریات کی اسے خاصی فکر دامن گیر رہتی تھی۔ اسے ان سب باتوں کا علم تھا۔ پھر بھی اس نے کبھی استفسار نہیں کیا۔ مبادا ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ اسے شاہدہ سے دور رہنا پڑے۔ چنانچہ اس نے اس قسم کے سارے شکوک کو دفن کر دیا تھا...... لیکن آج اس

کی سوجی سوجی آنکھیں اور اس کا اترا اترا چہرہ دیکھ کر اس کے منہ سے اس قسم کے الفاظ نکل ہی گئے لیکن وہ فوراً اپنی محبوبہ کی دلی کیفیت کو بھانپ گیا۔ اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''نہیں شاہدہ ! اپنا دل مت میلا کرو، در اصل میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ تم جانتی ہی ہو۔ مجھے اس معاملے میں کچھ کہنا ہی نہیں چاہئے اگر تمہارے دل کو ٹھیس لگی ہو تو میں معافی کا خواست گار ہوں۔۔۔ کیا فی الحقیقت ان کی طبیعت بہت خراب ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے تم انہیں ملازم کے سپرد کردو۔ آخر اس بات کا امکان بھی تو ہے تا کہ رت جگے سے تمہاری طبیعت بھی علیل ہو جائے۔ ایسی شاندار صحت تو پہلے بھی کب تھی کہ ان بد پرہیزوں کی متحمل ہوسکو۔''

شاہدہ کو اس کی باتوں سے کچھ اطمینان حاصل ہوا۔ آہستہ سے بولی۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں تمہاری دلی کیفیت کا بخوبی اندازہ لگا سکتی ہوں...... لیکن ان کی ...... وہ واقعی بہت سخت بیمار ہیں۔ بخار ان کے سر کو چڑھ گیا ہے۔ رات کے وقت دو دو گھنٹے کے بعد دوا پلانی ہوتی ہے۔ اگر میں ہی سو رہوں تو انہیں دوا کون پلائے...... بھلا نوکر کا کیا بھروسہ؟

''درست ہے۔ کہہ کر نوجوان نے سر جھکا لیا۔

اس وقت وہ بھی اداس نظر آتا تھا۔ یا تو وہ حقیقتاً پریشان تھا یا پھر شاہدہ کا بیمار خاوند کی اس قدر انہماک سے تیمار داری کرنا اس کے لیے رنج وہ ثابت ہو رہا تھا۔ شاہدہ نے کم و بیش یہی اندازہ لگایا۔ وہ اس کے جھکے ہوئے چہرے کی جانب دیکھ رہی تھی۔ وہ چہرہ جسے دیکھتے رہنے کی بھوک کبھی ختم نہیں ہوسکتی تھی۔ اس وقت اداس اور کھویا کھویا سا تھا۔ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب کھینچا۔ وہ ڈنگلے پر چڑھ کر برآمدے میں چلا آیا۔ شاہدہ نے خاموشی سے اس کی جانب دیکھا اور پھر اس کے ترشے ہوئے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیئے۔ آج اس کے ہونٹوں میں وہ گرمی، وہ تڑپ نہیں تھی۔ پہلے وہ یہی سمجھی تھی کہ کچھ دیر بعد حرارت پیدا ہوجائے گی لیکن جب اس کا وہی حال رہا تو اس نے اپنا چہرہ قدرے پیچھے ہٹا کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا:

''تم مجھ سے خفا ہو گیا؟''

وہ تھوڑی دیر تک چپ چاپ خواب ناک نظروں سے شاہدہ کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اس کے حیرت سے قدرے کھلے ہوئے ہونٹوں کے قریب اپنے ہونٹ لے گیا— شاہدہ ٹوٹی ہوئی شاخ کے مانند اس کی آغوش میں گر پڑی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ جدا ہو گئے۔ وہ زیادہ دیر تک رکے رہنے سے معذور تھی۔"

کمرے کو واپس آتے وقت اس نے بالوں کو انگلیوں سے ہموار کیا۔ بار بار بغل گیر ہونے کی وجہ سے کپڑوں میں جو بے ترتیبی پیدا ہو گئی تھی، اسے دور کیا اور پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی بیمار خاوند کے کمرے میں داخل ہو گئی۔

پچھلی رات کے یہ سارے واقعات فلم کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے سے گذر رہے تھے۔ آنکھیں موندے موندے اس نے سوچنا شروع کیا کہ کہیں آج وہ پھر ناغہ نہ کر دے۔ حالانکہ ایسا بہت کم ہوتا لیکن وہ بیچاری اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی...... دفعتہً اس نے آنکھیں کھول کر ٹائم پیس کی جانب دیکھا۔ ابھی آٹھ بجے تھے۔ محض آٹھ— وہ دس سے پہلے تو کیا آئے گا۔

آنکھیں کھول لینے کے بعد اب انہیں بند کرنے میں تساہل سے کام لے رہی تھی۔ عجب کیفیت ہو گئی تھی اس کی۔ تپائی پر رکھے ہوئے سبز رنگ کے شیڈ والے ٹیبل لیمپ کی روشنی میں کمرے کی ہر شے جگمگا رہی تھی۔ یہاں تک کہ دواؤں کی رنگ برنگ کی شیشیاں بھی بڑی بھلی دکھائی دے رہی تھیں۔ البتہ مریض کے چہرے پر شیڈ میں سے چھن چھن کر سبز رنگ کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ شاہدہ کی نظر شوہر کے چہرے تک پہنچ کر رک گئی۔ اس کا لمبوترا چہرہ، بڑا سا سر دبی ہوئی کنپٹیاں بھنویں ناک کے اوپر آن کر مل گئی تھیں۔ اس کے پتلے بے رس ہونٹوں کے اوپر مونچھیں کانٹوں کی طرح سیدھی کھڑی تھیں۔ جسم دبلا پتلا، جلد پچکی اور الجھی سی۔ اپنے ننگے بدن اور شوہر کے عریاں جسم کے لمس ہی کے احساس ہی سے شاہدہ کے دل میں کراہت سی پیدا ہونے لگی......

پھر اس کی نگاہ سامنے کی میز پر رکھی ہوئی اپنی تصویر پر جا پڑی۔ یہ بہت پہلے کی تصویر تھی۔ شادی سے پہلے بھی وہ اس تصویر کو بڑے انہماک سے دیکھا کرتی تھی۔ اسے اس صورت اور اس جسم سے محبت تھی۔ ان دنوں اس کی جو سہیلی بھی اسے دیکھتی تو کہتی۔ ''شاہدہ! تجھ پر تو جوبن پھٹ پڑا ہے ری۔ بھئی اللہ کرے تجھے شوہر بھی تیری ٹکر ہی کا ملے۔''

سہیلیوں کی اس قسم کی باتیں اسے پسند نہیں آتی تھیں۔ جوبن پھٹ پڑنا، کافر جوانی، قاتل نگائیں، وغیرہ محاوروں ہی سے اسے سخت نفرت تھی۔ وہ ان باتوں پر سنجیدگی اور فلسفیانہ انداز میں غور کیا کرتی تھی۔ وہ حسن کی تعریف سیدھے سادے الفاظ میں سنا زیادہ پسند کرتی تھی۔ وہ اس بات کی خواہش مند بھی نہیں تھی کہ اس کا شوہر لازمی طور پر بے مثل حسن کا مالک ہو۔ وہ کہتی تھی کہ میں دنیا کے ساتھ سمجھوتہ کر سکتی ہوں۔

پھر گھر میں اس کی شادی کا چرچا ہوا۔ چند مہینے اسی چہل پہل میں گذر گئے اور پھر شادی ہوگئی۔

پہلی رات کو وہ خاوند کے انتظار میں تن تنہا پلنگ پر بیٹھی تھی۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اس کا خاوند رنڈوا ہے۔ خوب صورت بھی نہیں ہے لیکن وہ پڑھی لکھی سمجھدار لڑکی تھی۔ وہ مایوس نہیں ہوئی۔ وہ کب چاہتی تھی کہ وہ لازمی طور پر بانکا ترچھا جوان ہو۔ آخر ایسا محض اتفاق ہی سے ہوا کرتا ہے۔ لیکن جب اس نے ایک رات شوہر کے ساتھ گذار لی تو اسے اپنی زندگی کے بھرپور ہونے کے احساس کے عوض عجیب کھوکھلا پن سا محسوس ہونے لگا۔ پہلی ملاقات بڑی مضحکہ خیز سی رہی۔ خاوند نے خاص التفات نہیں کیا۔ باتیں نہیں ہوئیں۔ اس کا گھونگھٹ الٹ دینے کے بعد جب دونوں کی نظریں ملیں تو شاہدہ کو اس کی آنکھوں میں کوئی جذبہ ہی دکھائی نہیں دیا۔ روکھاپن سرد مہری، اسے دیکھتے ہی شوہر پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا جیسے کوئی انہونی شے دیکھ لی ہو۔ جیسے اس کے قریب آنے میں کوئی خطرہ ہو اور یہ بُعد بڑھتا ہی چلا گیا اور تو اور اس نے کبھی اس کے ہونٹوں کو بھی نہیں چوما تھا کبھی اس کے گالوں کو چومتا تو پھر اسے یوں محسوس ہوتا جیسے شوہر کے ہونٹ

اس کے ہونٹوں کی جانب بڑھنا چاہتے ہیں لیکن پھر سخت مونچھوں کی چبھن سی محسوس کر کے رہ جاتی۔ اس نے کبھی پیار کا ایک لفظ تک نہیں کہا تھا۔ جنسی تعلقات کے باوجود جذباتی طور پر ایک دوسرے سے کوسوں دور تھے۔ یہاں تک کہ بچی کی پیدائش بھی انہیں ایک دوسرے کے قریب نہیں لا سکی۔ کبھی آپس میں جھگڑا نہیں۔ خفگی یا رنجش پیدا نہیں ہوئی لیکن ان کی ازدواجی زندگی چھکڑا بن کر رہ گئی تھی جو ناہموار راستے پر ہچکولے کھاتا بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

شاہدہ کا دل دکھ کے مزے سے آشنا ہو چکا تھا۔ نامعلوم سا درد کلیجے میں بیٹھ کر رہ گیا تھا۔ آغاز شباب سے لے کر اس لمحے تک کا زمانہ ایک مرتبہ پھر اس کی آنکھوں تلے سے گزر گیا۔ آرام کرسی پر پیچھے کی جانب جھکے جھکے اس نے آنکھیں نیم وا کر لیں۔ ایک مرتبہ تو اس کی قوت ادراک قطعاً مفلوج ہو گئی تھی اور نہ کوئی احساس ہی باقی رہ گیا تھا۔

سامنے خاوند کی دھندلی دھندلی صورت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ خاوند جو اس کے لیے صبح سے شام تک دفتر میں کام کرتا تھا۔ نہ معلوم کیا کچھ کرتا تھا۔ وہ خاوند جس نے اسے کبھی سخت کلمہ تک نہیں کہا تھا۔ اپنی ساری آمدنی اس کے سپرد کر دیتا۔ اس کے کپڑے لتے دیگر ضروریات کا دھیان رکھتا تھا...... اس کی آنکھیں ایک مرتبہ پھر شوہر کے چہرے پر جم گئیں اس کے نتھنوں میں سے چند بال باہر کو نکل آئے تھے جنہیں وہ بیماری کی وجہ سے نوچ کر پرے نہیں پھینک سکا تھا...... معاً اس کے لبوں میں سے ہلکی سی آواز نکلی۔ شاہدہ نے آنکھیں پورے طور پر کھول دیں۔

"پانی!"

شاہدہ نے فوراً پانی کا گلاس اس کے منہ کے قریب کر دیا۔ دو تین گھونٹ پی کر اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔ پانی کے قطرے اس کی سخت مونچھوں پر لرز رہے تھے۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ اپنی زرد آنکھیں کھولیں اور بیوی کی نظروں سے نظر ملائی۔ معلوم ہوتا تھا وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔

اس کی آنکھوں میں نہ معلوم کیا جذبہ تھا۔ شاہدہ وہیں زمین پر دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔ شوہر کے ہونٹ لرزے۔ "شاہدہ!!"

"جی۔"— پھر وہ بہت دیر تک چپ رہنے کے بعد بولا "شاہدہ!!"

اس کی آواز میں لرزش بڑھتی جارہی تھی۔ شاہدہ نے ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔ سانس کی آمدورفت جاری تھی— "جی!"

شوہر نے ایک مرتبہ پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔" میں کچھ کہنا چاہتا ہوں کہنا چاہتا ہوں...... کئی دفعہ جی چاہا کہ کہہ دوں...... لیکن...... لیکن...... نہ معلوم...... ڈرتا تھا کہ کہیں تم برا نہ مان جاؤ......"

یہ کہہ کر اس نے منہ پھیر لیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بیوی ہمہ تن گوش ہے۔ پھر دفعتہً آواز آئی۔ "شاہدہ! مجھے تم سے محبت ہے، پہلی رات ہی سے......"

شاہدہ کا جسم شدت کی گرمی سے جھلس کر سرد پڑ ہونے لگا۔ اس نے ایک مرتبہ کھڑکی میں سے جھلملاتے روشن تاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھا۔ پھر سر شوہر کے سینے سے چھوا دیں...... وہ مر رہا تھا۔

چیڑھ کے جھنڈ میں مینڈھوں کی آوازیں آتی رہی...... لیکن وہ بیٹھی ہچکیاں لے لے کر آنسو بہاتی رہی۔"

یہ افسانہ افسانوی مجموعہ پہلا پتھر میں شامل ہے۔

راستہ چلتی عورت

یہ کوئی شعلہ نہیں تھا، بلکہ بوٹا سنگھ کی نئی نویلی بیر بہوٹی سی دلہن کے سرخ دوپٹے کا آنچل تھا، جو تیز گرم ہوا کے جھونکوں میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔

اب وہ کوٹ گوراں نام کے گاؤں کے قریب پہنچ چکے تھے، شادی کے بعد پہلی بار بوٹا سنگھ بیوی کو اس کے میکے سے اپنے گاؤں کو لے جا رہا تھا۔ تقریباً آدھا راستہ طے ہو چکا تھا، کیوں کہ کوٹ گوراں آدھے راستے پر واقع تھا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ دھوپ اور گرمی کی شدت کی حد نہیں تھی۔ کوٹ گوراں کے لوگ انتہائی گرمی کا یہ وقفہ کسی قدر آرام سے گذارنے کے لیے گاؤں کے باہر شرینہہ کے اونچے اور گھنے پیڑوں کے جھنڈ کی چھاؤں تلے گذارتے تھے۔ چناں چہ اس وقت بھی وہ وہاں جمع ہو کر اپنے اپنے مشاغل میں مصروف تھے۔ کوئی شطرنج کھیل رہا تھا، کوئی چوسر، کوئی باتیں بنا رہا تھا تو کوئی اونگھ رہا تھا۔ بعض لوگ گھروں سے ہلکی پھلکی چارپائیاں اٹھا لائے تھے اور بعض زمین پر ہی بوریا بچھائے ہوئے تھے۔ البتہ جگیر سنگھ اپنے لفنگے ساتھیوں کے ساتھ الگ محفل جمائے ہوئے تھا۔ وہ محض وحشی جوان ہی نہیں تھا بلکہ بچ بچ دم خم کا مالک تھا اور اپنے چیلے چانٹوں میں سب سے ممتاز تھا۔ کچھ دن پہلے تیز و تند آندھی کے طوفان میں شرینہہ کے اونچے پیڑ کی ایک بھاری بھرکم ڈالی چرچرا کر زمین پر

آ گری تھی۔ جگیر اور اس کے آٹھ دس ساتھی اسی سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ اس وقت وہ محض آپس کی گپ شپ سے محظوظ ہو رہے تھے۔ جگیر اپنی ایک فٹ کی کرپان سے ایک چھوٹی سی شاخ کو بائیں ہاتھ میں تھامے آہستہ آہستہ چھیل رہا تھا۔ اس بے مصرف کام کے دوران میں رہ رہ کر اس کی باچھیں چری جاتی تھیں۔ اس کے اجڈ چہرے سے خشونت کے آثار ہویدا تھے۔ اس کے ساتھ غیر ضروری انہماک کے ساتھ یا تو اس کے ہاتھوں کی جانب دیکھ رہے تھے یا شکاری جانور جیسی مستعدی کے ساتھ ادھر اُدھر تاک رہے تھے۔ اچانک انہوں نے دور سے آتی دلہن کو دیکھا تو پر معنی انداز میں ہلکے سے کھانس کر ایک نے جگیر کے کولہے پر کہنی کا ٹہوکا دیا۔

پہیا، یعنی وہ چوڑی راہ گزر جس پر بوٹا سنگھ اپنی بیوی کے ساتھ چلا آرہا تھا، پیڑوں کے اس جھنڈ کے قریب سے ہی گزرتی تھی۔ سامنے کچھ فاصلے پر گوردوارے کی چھوٹی سی عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے گنبد پر ایک جھنڈا لہرا رہا تھا جس کا رنگ کبھی گہرا زرد رہا ہوگا تاہم اس پر ایک چکر، دو کرپانوں اور ایک کھڑے کھنڈے کا نشان اب تک معدوم نہیں ہوا تھا۔

وہاں پر موجود ایک بھی شخص ایسا نہیں تھا جس کی نظر بے اختیار اس دلہن کی طرف نہ اٹھ گئی ہو، جو ایسی دکھائی دیتی تھی جیسے ابھی ابھی کسی باکمال کمہار کے چاک سے اتاری گئی ہو۔ جگیر اور اس کے ساتھیوں کی نگاہیں تو گویا دلہن کے چندن سے بدن پر پیوست ہو کر رہ گئیں۔

جیسے جیسے دلہن قریب آتی گئی، یہ حقیقت اور بھی واضح ہوتی گئی کہ لڑکی واقعی نایاب تھی۔ اس کے آگے چلتے ہوئے بوٹا سنگھ کی شان بھی نرالی تھی۔ دیکھنے میں وہ کوئی لحیم شحیم کڑیل جوان نہیں تھا۔ اس کا قد میانہ، جسم اکہرا اور تیور مردانہ تھے۔ چال میں ناگ کا سا لہرا تھا۔ دوہرے شملے والی پگڑی سے کج کلاہی ٹپکتی تھی۔ سانولے سلونے چہرے پر عجب دمک تھی۔ ہاتھ میں ہلکی پھلکی لاٹھی تھی۔

جب یہ جوڑا ان سب لوگوں کے سامنے سے گزر رہا تھا تو یکایک جگیر سنگھ ایک خاص انداز سے کھانس اٹھا۔

بوٹا سنگھ رک گیا۔

ان دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے الجھ کر رہ گئیں۔ پل بھر کے تامل کے بعد بوٹا سنگھ مسکرایا تو اس کے سامنے والے اوپر کے دونوں دانتوں میں پیوست سونے ننھی ننھی کیلیں دکھنے لگیں۔ وہ جگیر کو آنکھوں آنکھوں میں تولتے ہوئے بھاری آواز میں بولا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کچھ تکلیپھ ہے۔''

''ہے تو۔'' جگیر نے پر اسرار اور پر معنی انداز میں ایک نظر دلہن پر ڈالی۔

''ایسی ویسی بھاگی بھگائی لڑکی نہیں ہے۔ میری بیاہتا جورو ہے۔''

''تو بھائی، اپنا راستہ ناپیے۔''

''سو تو ناپ ہی رہے تھے، لیکن آپ کو کچھ تکلیپھ میں پا کر رکنا پڑا۔''

''تکلیپھ کی بات چھوڑو، مگر ایک پرشن جرور اٹھتا ہے۔''

بوٹا سنگھ نے کھڑے کھڑے پہلو بدلا۔ ''پرشن؟''

جگیر نے زور سے زمین پر تھوک کر جواب دیا۔ ''پرشن اٹھتا ہے کہ جو لوگ گلے میں ہیرے لٹکائے پھرتے ہیں انہیں اس بات کا پربندھ بھی کر لینا چاہیے کہ کہیں کوئی اجنبی جھپٹا نہ مار لے جائے۔''

گاؤں کے سب ہی لوگ جانتے تھے کہ راہ گیروں پر بے جا آوازے کسنا جگیر اور اس کی ٹولی کا شیوہ تھا۔ مگر آج وہ حد سے کہیں آگے نکل گئے تھے۔ یہ کسی کی بھی نظر میں پسندیدہ بات نہیں تھی۔

''سمجھا۔'' بوٹا سنگھ دبے دبے قہر میں ڈوبی آواز میں غرایا۔

سب لوگ غیر معمولی لفڑے کے لیے تیار ہو گئے۔

بوٹا سنگھ نے اپنی لاٹھی دلہن کے حوالے کی اور پھر اس نے آگے سے تہبند کو سمیٹ کر پورے پلو کو دونوں رانوں میں گھما کر اسے پیچھے کی طرف سے نیچے پہنے ہوئے کچھے (جانگیے) کے نیفے تک اچھی طرح ٹھونس لیا۔ جوتے اتار کر ایک طرف رکھ

دیئے۔ پھر لاٹھی ہاتھ میں لے کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

سب لوگ ایک ٹک اس کی حرکت غور سے دیکھ رہے تھے۔

اس نے لاٹھی کو پہلے اپنی ایک انگلی پر ٹکا کر ہوا میں اٹھایا، لمحہ بھر رکنے کے بعد اس نے لاٹھی کو ہوا میں خوب اوپر تک اچھالا، جب لاٹھی اوپر سے نیچے کی طرف گری تو اس نے اسے دونوں ہاتھوں میں دبوچ کر دسوں انگلیوں پر نچانا شروع کر دیا۔ عجب تماشا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے لاٹھی کسی قسم کا ساز ہے، جس کے تاروں پر بوٹا سنگھ کی تیزی سے چلتی ہوئی انگلیاں رقصاں تھیں۔ کیا مجال جو لاٹھی اس کی انگلیوں کی گرفت سے نکل کر گر جائے۔

لاٹھی پر اپنی گرفت کے کمال کا مظاہرہ کرنے کے بعد بوٹا سنگھ نے اسے دونوں ہاتھوں میں تھام کر چاروں طرف گھمانا شروع کر دیا— وہ پینترے پر پینترا بدلنے لگا۔ سرک لگاتا ہوا کبھی ادھر کبھی اُدھر نکل جاتا۔ اس کی ٹانگوں میں گویا بجلی بھری تھی۔ پاؤں کے نیچے سے دھول کے ہلکے ہلکے بادل بلبلا کر ہوا میں اٹھنے لگے۔ کچھ لمحہ تو ایسے آئے جب دیکھنے والوں کو لاٹھی نہیں محض اس کا کوندتا ہوا سایہ دکھائی دے رہا تھا۔ لاٹھی تھی کہ بپھرا ہوا ناگ۔ ایسا لگتا تھا کہ نہ جانے کتنے ناگ فضا میں پھنکار رہے ہیں۔ اس امر میں تو کوئی شبہ نہ رہا تھا کہ اگر بوٹا سنگھ حملہ آوروں سے گھرا ہوتا تو اس وقت تک اس کی لاٹھی نہ معلوم کتنوں کا خون چاٹ چکی ہوتی اور نہ جانے کتنی لاشیں زمین پر بچھ چکی ہوتیں۔

آخر بوٹا سنگھ نے لاٹھی روک دی اور اس کی بونچی موٹھ پر ٹھوڑی ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دھیرے دھیرے آنکھوں کی پتلیاں گھما گھما کر وہاں موجود اشخاص کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

ہر شخص دم بخود بیٹھا یا کھڑا تھا۔

اب بوٹا سنگھ نے جگیر سنگھ پر نظر جما دی، جو ابھی تک اسی ٹہنی کو چھیلے جا رہا تھا۔

کچھ توقف کے بعد بوٹا سنگھ نے اس سے کہا" جو سوال آپ نے اٹھایا تھا اس کا جواب تو میں نے دے دیا۔ اب میرے من میں ایک سوال اٹھا ہے جس کا جواب مجھے ملنا چاہئے۔"

روئے سخن جگیر کی طرف تھا، جو بدستور کرپان سے ٹہنی چھیلے جارہا تھا۔

بوٹا کہتا گیا: یہاں سے آگے بڑھنے کے بعد جو ہوگا اس سے تو میں نمٹ لوں گا، لیکن سوال یہ ہے کہ اس گاؤں میں بھی تو کوئی نہ کوئی اپنے باپ کے تخم سے اور اپنی ماں کا لال ہوگا۔ جس کے دل میں پرائے ہیرے اڑانے کا چاؤ ہوگا۔"

اس سے آگے بوٹا سنگھ جو کہنا چاہتا، وہ یا تو اس نے دانستہ طور پر یا نادانستہ طور پر نہیں کہا— تاہم اس کی بات ادھوری ہونے پر بھی مکمل تھی۔

ظاہر تھا کہ یہ جگیر کے لیے کھلا چیلنج تھا۔ دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ لوگ باگ یہ دیکھنے کے منتظر تھے کہ کیا جگیر اور اس کے ساتھی بوٹا سنگھ پر ٹوٹ پڑیں گے— اب جگیر کرپان ہاتھ سے رکھ کر قدم بہ قدم بوٹا سنگھ کی طرف بڑھا اور قریب پہنچ کر مسکراتے ہوئے گہری آواز میں بولا۔" سردار جی، اس گاؤں میں نہ تو کوئی اپنے باپ کے تخم سے ہے اور نہ اپنی ماں کا لال ہے۔"

اتنا کہہ کر جگیر الٹے قدموں لوٹ گیا۔

ایک بار پھر دونوں راہ گیر اپنے راستے پر ہو لیے، پیچھے عورت چکوری کی طرح چلتی ہوئی آگے مرد، جس کی پگڑی کا شملہ اصیل مرغ کی کلغی کی طرح ہوا میں سر بلند کیے ہوئے تھا۔

بلونت سنگھ کے بہترین افسانے، مرتبہ: گوپی چند نارنگ' میں شامل ہے اور کسی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔

گمراہ

صبح کے وقت میں حجامت بنا رہا تھا۔

سامنے بڑا سا آئینہ، ہاتھ میں سیفٹی ریزر اور چہرے پر صابن کا جھاگ۔ کون نہیں جانتا کہ ایسے موقع پر چہرہ کیسی کیسی صورتیں اختیار کرتا ہے۔ معاً میرے منہ کا دہانہ ایک مخصوص انداز سے کھلا تو میرا سیفٹی ریزر والا ہاتھ ساکت ہوگیا۔ اپنے منہ کا وا شگاف دہانہ دیکھ کر کسی بات کی یاد تازہ ہوگئی۔

خدایا!..... کیا بات تھی وہ!

چند لمحوں تک میرا دماغ عجیب الجھن میں پھنسا رہا۔ میرے منہ کے اس انداز سے کھلنے کا کسی واقعے سے تعلق تھا— وہ واقعہ کیا تھا؟

رفتہ رفتہ ذہن کے دھندلکے میں مجھے ایک اور کھلا ہوا منہ نظر آنے لگا۔ وہ چہرہ مجھ سے زیادہ عمر رسیدہ تھا۔ ناک چپٹی سی، باچھوں کے دونوں طرف جھاڑ جھنکاڑ کی طرح الجھی ہوئی زردی مائل سفید مونچھیں لٹک رہی تھیں۔ منہ کے اندر دانت حاضر کم اور غائب زیادہ تھے۔ یہ ماسٹر جھانگی داس جی کا چہرہ تھا۔" پچھلی شام جب میں نے ان کا منہ اس انداز سے کھلا ہوا دیکھا، تو قصہ علی بابا میں چالیس چوروں کے غار کا نقشہ کھنچ گیا۔ میرے سامنے ان کا منہ اس انداز سے تیسری بار کھلا تھا۔

مسٹر جانکی داس مجھ سے چھ سات برس بڑے ہوں گے۔ وہ کتابوں کا کیڑا تھا اور میں فائلوں کا۔ عمر میں زیادہ تفاوت نہیں تھا، اور نہ میری زندگی مصائب اور پریشانیوں سے مبرّا تھی۔ پھر بھی ان کا چہرہ کہیں زیادہ تکان زدہ اور بوڑھا دکھائی دیتا تھا۔ غالبًا مالی حیثیت سے جانکی داس کے حالات مجھ سے زیادہ خراب تھے— لیکن یہ موضوع کبھی زیرِ بحث نہیں آیا۔ ایک محلّہ میں رہتے ہوئے بھی میں ان کے بارے میں اتنا ہی جانتا تھا کہ وہ رمیش کے کلاس ٹیچر تھے، اور وہ محض یہ جانتے تھے کہ میں ان کے اس شاگرد کا باپ تھا۔ ماسٹر جانکی داس نے پچھلی شام مجھے تیسری بار اطلاع دی کہ رمیش اسکول سے اکثر غیر حاضر رہتا تھا۔ مصروفیت کے سبب میں اس مسئلہ کی طرف توجہ نہیں دے سکا تھا۔ ماسٹر جی نے اسے میری غفلت سمجھا۔ چناں چہ تیسری بار یہ شکایت کرنے کے بعد آخر میں انہوں نے اپنا منہ اسی مخصوص انداز سے کھول کر گویا مجھے خبردار کیا۔" جناب اگر یہی حالت رہے گی تو آپ کا لڑکا گمراہ ہوجائے گا۔"

انہوں نے 'گم' اور 'راہ' پر الگ الگ زور دیا۔ یہ فقرہ کہتے وقت ان کے چہرے پر انتہائی اذیت کے آثار نمایاں ہوگئے۔ بات ادا ہوجانے کے بعد بھی ان کا منہ جوں کا توں کھلا رہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ جب تک مجھے آنے والے المیہ کا پوری شدت سے احساس نہ ہوجائے تب تک ماسٹر جی اپنے کھلے ہوئے منہ کو بند نہیں کریں گے۔ لیکن مجھے ان کی شکل مضحکہ خیز سی لگی— یہی محسوس ہوا کہ مسئلہ کی نوعیت اتنی خطرناک اور اہم نہیں تھی جتنی کہ وہ اپنی صورت سے ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

کل شام، اور آج پھر مجھے محسوس ہوا کہ لفظ "گم راہ" کس قدر بھاری بھرکم تھا— یہی بات میں نے اپنی بیوی سے کہی۔ اس نے مجھ سے اتفاق نہیں کیا۔ اس کا خیال تھا کہ ماسٹر جی کی شکایت بجا تھی، لفظ 'گمراہ' کا استعمال بھی مناسب تھا، نیز مجھے جلد از جلد اس پر توجہ دینی چاہئے۔

آئینہ میں اپنی صورت کو خود میں نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔" ابے گدھے کہیں کے! سوال یہ نہیں تھا کہ لفظ گمراہ ضرورت سے زیادہ بھاری بھرکم تھا یا نہیں، بلکہ سوال لڑکے کے مستقبل کا تھا۔ اولاد کی غلط روی کا خمیازہ والدین کو بھی بھگتنا پڑتا ہے۔"

شیو کے بعد نہاتے وقت میں نے تہیہ کر لیا کہ اس بات کی کھوج کروں گا کہ رمیش اسکول کے بجائے کہاں جاتا ہے۔ ناشتے کے بعد میں دفتر کو چلا تو اتفاق سے رمیش کتابوں کا بیگ کندھے پر لٹکائے جاتا نظر آیا۔ کچھ دور تک ہم اسی طرح آگے پیچھے چلتے رہے۔ پھر اسکول کی طرف جانے کے بجائے وہ ایک دوسری سڑک پر ہولیا۔

سنی سنائی باتوں سے میں زیادہ متاثر نہیں ہوا، لیکن اپنی آنکھوں سے صاحب زادے کی یہ حرکت دیکھ کر میں طیش میں آگیا۔ چناں چہ میں بھی دفتر کا راستہ ترک کر کے اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔

سڑک سے ہٹ کر شیشم کے اونچے اونچے پیڑوں کے نیچے بازی گر کرتب دکھا رہے تھے۔ لمبے لمبے بانسوں کی دو قینچیوں کے درمیان ایک دبیز رسّہ تنا ہوا تھا۔ بائیں سرے پر کالے رنگ کی ایک عورت مہاراشٹری ڈھنگ سے ساڑی پہنے کھڑی تھی۔ اس کے دبلے پتلے چہرے کے مقابلے میں اس کا جسم زیادہ بھرا بھرا دکھائی دے رہا تھا۔ سڈول پنڈلیاں دمک رہی تھیں۔ اس نے ایک بڑا سا تھال رسّے پر ٹکایا، اور اس میں دونوں پاؤں جما کر کھڑی ہوگئی، ہاتھوں میں لمبا سا بانس تھام لیا۔ توازن قائم رکھتے ہوئے اس نے اچھل اچھل کر تھال سمیت آگے بڑھنا شروع کیا۔ تماشائی دم بخود کھڑے تھے۔ ایک بازی گر نیچے کھڑا زور زور سے تھالی بجا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ عورت رسّہ پار کر کے دوسرے سرے پر پہنچ گئی۔ فضا تالیوں سے گونج اٹھی۔ لمحہ بھر کے لیے میری توجہ رمیش سے ہٹ گئی۔ گھڑی پر نظر ڈالی، دس بجنے میں آٹھ منٹ باقی تھے۔ سوچا، اب رمیش کو کان سے پکڑ کر اسکول کو جانے والے راستے پر ڈال دوں۔ نگاہ اٹھائی تو رمیش اپنی جگہ موجود نہیں تھا۔۔۔ کیا اس نے مجھے دیکھ لیا تھا؟

نہیں!۔۔۔ وہ چالیس پچاس قدم کے فاصلے پر بڑے اطمینان سے چلا جارہا تھا۔ اگر اسے میری موجودگی کا علم ہوتا تو اس قدر بے پروائی سے سڑگشت کرتا ہوا نہ چلتا۔ پہلے آواز دینے کی سوچی، پھر یہ ارادہ ترک کر دیا، کہ شاید وہ کسی دوسرے راستے سے

اسکول کو رخ پھیر لے گا۔

میرا اندازہ غلط نکلا، وہ شہر کے باہر کی جانب جا رہا تھا۔

ہمارے شہر کے باہر کوٹھیوں اور بنگلوں والا علاقہ بڑا پر فضا تھا۔ ان سے پرے سرسبز و شاداب پہاڑیاں نظر آتی تھیں۔ ان پہاڑیوں سے بھی آگے اونچے اونچے پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں، نیلگوں غبار میں تیرتی ہوئی سی لگتی تھیں۔ زیادہ تر بنگلوں کے چاروں طرف ہری بھری باڑیں موجود تھیں۔ ان کے اندر لیچی اور آموں کے پیڑ، نیز رنگ برنگے پھولوں کی کیاریاں نظر آتی تھیں۔

رمیش ان تنگ لیکن صاف ستھری پکی سڑکوں پر بڑھتا جا رہا تھا۔ اب ساڑھے دس بجنے کو تھے۔ میں بھی دفتر نہ پہنچ سکا۔ بیٹے کا اس طرح سڑ گشت کرنا مجھے بڑا پُر اسرار سا لگ رہا تھا۔ میں مشہور جاسوس جیمز بانڈ (007) کی طرح قدم ناپتا ہوا اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ لیکن میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ کیا کرتا ہے، کس سے ملتا ہے، کہاں ہے اس کی منزل؟

وہ لال پیلی دھاریوں والی قمیص پہنے ہوئے تھا، پاؤں میں بے ڈول بوٹ اور اُن میں سے بھورے رنگ کے چھوٹے چھوٹے موزے باہر کو جھانک رہے تھے۔ اس کی عمر بارہ تیرہ برس کی تھی۔ نیکر کے مختصر پائنچوں میں سے اس کی دبلی رانیں، نیچے موٹے گھٹنے اور پتلی سی پنڈلیاں نظر آ رہی تھیں۔ در اصل اس کا بدن بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ نہیں تھا۔ البتہ اس کی ہڈیاں موٹی اور قد لمبا ہوتا جا رہا تھا اس کے کندھے پھیلے ہوئے اور ریڑھ کی ہڈی سیدھی تھی۔ سر کے گچھے سے بال چھوٹے چھوٹے تھے۔ شاید ہوا بالوں میں داخل ہو کر انہیں غبارے کی طرح پھلا رہی تھی۔

اس نے ایک بار بھی پیچھے کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ سیٹی بجاتا، کچھ بل کھاتا اور لہراتا ہوا بڑھتا جا رہا تھا، کبھی کہیں رک کر پیڑوں پر بیٹھے بندروں اور پرندوں کو دیکھنے لگتا اور پھر کسی پتھر کو بوٹ کی ٹھوکر مار کر آگے بڑھ جاتا۔ سور کا بچہ! بھلا وہ کیا جانے کہ

اس کے یہ بوٹ خریدنے کے لیے اس کے باپ کو صبح سے شام تک دفتر میں فائلوں سے کتنا ماتھا پھوڑنا پڑتا ہے۔

پیڑوں کے نیچے نرم و نازک گھاس پر اب بھی شبنم کی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں۔

دور سے برساتی ندی کا خوب چوڑا پاٹ نظر آنے لگا تھا۔ ندی کے اس پار چائے کے باغات اور چیڑ کے جنگل تھے۔ آسمان پر بدلیاں جمع ہو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے نیلے پیلے، سبز گلابی، اودے اور نہ جانے کیسے کیسے رنگ کے لباسوں میں ملبوں پر یوں کا میلا لگنے والا تھا۔

پگ بیت گئے۔ میں بھی کبھی لڑکپن میں ادھر سیر گشت کے لیے آیا کرتا تھا۔

آگے سپیروں کا ڈیرہ لگا ہوا تھا، ان کے پھٹے پرانے خیموں کے آس پاس اَن گنت کپڑے جو ڈھلنے کے بعد اور بھی غلیظ لگ رہے تھے، سوکھنے کے لیے یا تو گھاس پر بچھا دیے گئے تھے یا جھاڑیوں پر لٹکا دیے گئے تھے۔ روکھے سوکھے بالوں اور لٹکی لٹکی مونچھوں والے سپیرے بے دلی سے ادھر اُدھر گھوم پھر رہے تھے۔

رمیش ان کے ڈیرے کے قریب پہنچا تو پانچ چھ کتے بڑے زور شور سے بھونکتے ہوئے اس کی طرف لپکے۔ میں ڈرا کہ کہیں ان کی ٹانگیں نہ نوچ ڈالیں۔ مگر نزدیک پہنچتے ہی کتے چپ ہو گئے اور دُمیں ہلانے لگے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ حضرت سے مانوس تھے۔

سپیروں کے لڑکے بالے دوڑتے ہوئے آئے اور اسے حلقے میں لے لیا۔ میں پرے پیڑ کی اوٹ سے یہ تماشا دیکھتا رہا۔ نہ جانے بچوں کے مابین کیا باتیں ہوتی ہیں۔ پھر دیکھتا کیا ہوں کہ ایک لڑکے نے چار پانچ سانپ رمیش کے گلے میں ڈال دیے۔ میرا کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا۔ بے اختیاری کے عالم میں ایک قدم آگے بڑھ گیا۔ لیکن بیٹے کو اطمینان سے ہنستے دیکھ کر میں پھر پیڑ کی اوٹ میں ہو گیا۔ دل زور زور سے

دھڑکتا رہا۔ آخر سانپوں کا کیا بھروسہ! رفتہ رفتہ سانپ اس کے گلے سے سرک کر بدن پر آ گئے۔ اور پھر بل کھا کر نیچے گھاس پر لہرانے لگا۔

دس پندرہ منٹ اسی قسم کی چہلوں کے بعد رمیش...... رمتا جوگی آگے نہر کی طرف بڑھ گیا۔

چھوٹی سی نہر تھی، بہ مشکل چار ساڑھے چار فٹ چوڑی اور ڈیڑھ فٹ گہری۔ دونوں کناروں پر تنگ پٹریاں۔ پانی کی چادر کے ساتھ ساتھ ایک انگل سے بالشت بھر اونچی گھاس کا گویا جنگل سا کھڑا تھا، جس میں پیپرمنٹ اور براہمی بوٹی کے پودے بھی موجود تھے۔ یہ نہر برساتی ندی کے اس پار سے پل بناتی ہوئی ادھر پہنچتی ہے، پہلے سات فٹ اونچی جھال کی شکل میں نیچے گرتی اور پھر مدھر گیت کی لے کی طرح سنبھل سنبھل کر بہہ نکلی۔

اس وقت چند بنگالی اور گوانی کچھ کچھ فاصلے پر کیکڑوں کی تاک میں نہر کے کنارے بیٹھے تھے۔ ہاتھ میں لمبی مضبوط چھڑی، جس کے ساتھ بندھی ڈوری کا دوسرا سرا کینچوے کا چارہ سنبھالے پانی میں ڈوبا ہوا۔ کبھی کبھی غڑاپ کی آواز سنائی دیتی۔ چھڑی ایک جھٹکے کے ساتھ پیچھے کو اٹھتی، ڈوری چابک کی طرح جھٹکا کھاتی، اور ایک کیکڑا باہر آ گرتا۔۔۔ گرتے ہی وہ پانی کی طرف بھاگتا لیکن شکاری لکڑی سے اس کی ٹانگیں توڑ تاڑ کر اسے تھیلے میں ڈال لیتا۔

رمیش پٹری پر بیٹھا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیکڑے کیوں کر باہر آ کر گرتے تھے۔ تاہم وہ اس قدر مگن تھا کہ اسے میرے قریب پہنچ جانے کی خبر تک نہیں ہوئی۔۔۔ شہر سے دور، گھر کی گہما گہمی سے الگ تھلگ پرسکون مقام پر مجھے رمیش یکسر اجنبی سا نظر آ رہا تھا۔ اس کی کچھ بے ڈول اور نکلتی ہوئی سی ٹانگیں، گول مٹول ہاتھ، سانولی لیکن انگور کی طرح شاداب گردن اور زعفرانی رنگ کے نرم نرم بال!...... معاً میرے دل نے زبانِ خاموشی میں پکار کر پوچھا: ''

تم کون ہو؟''

اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں کتنا تجسس تھا! وہ وہاں کی ہر چیز سے کس قدر ہم آہنگ تھا۔ ایک میں تھا جو برسوں سے اپنے آپ کو دنیا کی ہر شے سے اکھڑا اکھڑا سا محسوس کر رہا تھا۔ زندگی جد و جہد کا نام ہے، کسی بزرگ نے نصیحت کی تھی...... اور میں دنیا سے لڑتے لڑتے آخر کار اس سے بے گانہ ہو کر رہ گیا۔ لیکن اس لڑکے نے ان چیزوں سے، اس فضا سے، اس گھاس پھوس سے دوستی قائم کی تھی۔ وہ ان سے پیار کرتا تھا اور یہ اس کو چاہتے تھے، اپناتے تھے۔

معاً—— رمیش کی نظر مجھ پر پڑی۔ مجھ سے آنکھیں چار ہوتے ہی اس کا چہرہ اتر گیا۔ منہ پر دہشت کے ساتھ ساتھ عجیب سی مردنی چھا گئی۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر خود میں بھی ڈر گیا...... کیا میں اس قدر بھیانک تھا؟

رمیش کو اور کچھ نہیں سوجھا تو اس نے یوں ہی ہاتھ پھیلا کر کہا۔

''پپا، یہ لوگ کیکڑے پکڑ رہے ہیں۔''

دراصل خود اسے اس بات کا کچھ احساس نہیں تھا کہ وہ کیا اور کیوں کہہ رہا تھا۔

میں بھی پسر کر اس کے پہلو میں بیٹھ گیا، اور سوال کیا۔ ''جانتے ہو کہ کیکڑے ان کے ہاتھ لگتے کس طرح ہیں؟''

اس کی موٹی موٹی آنکھیں تجسس کی وجہ سے اور بھی بڑی ہوگئیں۔ میں تفصیل سے اسے شکار کے رموز سمجھاتا رہا۔

اس کے اسکول کا ذکر ہوا نہ میرے دفتر کا۔ نہ میں نے ان سے پوچھا کہ وہ وہاں کیوں چلا آیا تھا، اور نہ اسے اس بات کی پریشانی رہی کہ میں وہاں کیسے پہنچ گیا تھا۔ چند منٹ میں اس کا سارا خوف دور ہوگیا۔ ہم دو دوستوں کی طرح بے تکلفی سے ادھر اُدھر کی ہانکنے لگے۔

اس کا جی بھر گیا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ندی کی طرف ہاتھ پھیلا کر بولا۔

''آؤ پپا اس پار چلیں۔''

میں فوراً اس پر آمادہ ہو گیا۔

میلوں دور اونچے اونچے پہاڑوں پر خوب بارش ہو چکی تھی، تاہم ندی بھر نہیں سکی۔ جا بجا ٹمیالے پانی کے چوڑے چوڑے خطوط دکھائی دے رہے تھے۔ کنارے پر پہنچے تو وہ اپنے بوٹوں کے تسمے کھولنے لگا۔ میں نے اسے روک کر کہا۔ ''نہیں بیٹے! پاؤں اور ٹانگیں بھیگ جانے سے تمہیں زکام ہو جائے گا۔''

کم سے کم میرے دل میں یہی ڈر بیٹھا ہوا تھا۔

مجھے اپنے پمپ شو اتارنے میں دیر نہیں لگی، میں نے اس کو اپنی پیٹھ پر بٹھا لیا، اس کی دونوں ٹانگوں کو بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ اس نے میرے پمپ شو ہاتھوں میں لے کر باہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔ اس طرح میں اپنے شو کے چمڑے کی بو سونگھتا ہوا ندی پار کرنے لگا۔

اس کی جھجک بالکل دور ہو چکی تھی، وہ طوطے کی طرح بولے جا رہا تھا۔ ''پپا! ندی کے اس پار ایک بوڑھا لکڑہارا رہتا ہے۔ وہ سارا دن کلہاڑے سے لکڑیاں پھاڑتا رہتا ہے...... پپا! وہاں ایک سوامی جی بھی ہیں...... جٹا دھاری، اور پپا! چائے کے باغ کے پاس سکھوں کا گوردوارہ ہے جہاں حلوہ کھانے کو ملتا ہے، کڑاہ پرشاد کہتے ہیں اسے......''

ندی پار لکڑہارا تو دکھائی نہیں دیا۔ البتہ سوامی جی موجود تھے۔ ان کی آنکھوں میں نور تھا۔ جسے دیکھ کر دل کو سرور ملتا تھا۔ ہم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔

''یہ آپ کا بیٹا ہے؟''

''جی، سوامی جی۔''

''بڑا سیانا اور بھولا لڑکا ہے، بڑا ہو کر آپ کا نام روشن کرے گا۔''

ان کی اس رسمی بات پر مجھے بے حد خوشی ہوئی اور اسکول سے بھاگے ہوئے بیٹے

پر فخر سا محسوس ہونے لگا۔

گورودوارے سے آتے ہوئے داڑھیوں والے سکھوں کو دیکھ کر یوں لگا جیسے دور دراز ہمالہ کی گپھاؤں میں سے سادھو اور مہاتما قمیصیں اور پتلونیں پہن کر اچانک ہمارے سنسار میں آ گئے ہیں۔

اب ہم چائے کے باغوں میں پہنچ چکے تھے۔ بیچوں بیچ گہرائی میں وہی ندی سوئی سوئی سی بہہ رہی تھی۔ دائیں بائیں چائے کے بے شمار پودے تھے کہیں کہیں چیڑ، دیودار اور سفیدے کے پیڑ بھی نظر آ رہے تھے۔ لمبی لمبی ٹوکریاں پیٹھ پر ٹکائے پہاڑی لڑکیاں چائے کی پتیاں توڑ رہی تھیں۔ ان کے کانوں سے چاندی کی خوب بڑی بڑی بالیاں لٹک رہی تھیں، ناک میں پھول دار کیلیں چمک رہی تھیں۔ وہ لڑکیاں بھی رمیش سے مانوس تھیں۔ جو بھی اسے دیکھتی مسکرا دیتی......''

ہمیں چھوٹے چھوٹے برساتی نالوں سے بھی گزرنا پڑا۔ باغ ختم ہوئے تو کھیت شروع ہو گئے۔ وہی نہر ان کھیتوں میں سے ہو کر گزر رہی تھی۔ کہیں کہیں جھونپڑے بھی بکھرے ہوئے تھے، انہیں میں سے ایک جھونپڑے میں رہنے والی تیس پینتیس سالہ کسان عورت رمیش کو دیکھ کر ہنس دی۔ ''بہت دنوں بعد آئے۔''

رمیش نے لاڈ سے میرے گلے میں باہیں ڈال کر کہا۔ '' آج پپا بھی میرے ساتھ ہیں۔''

عورت لجا گئی۔ شاید وہ سمجھی کہ میں بہ طور خاص اسے دیکھنے کے لیے آیا تھا۔ میں نے اس کا اضطراب دور کرنے کے لیے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ رمیش کی یہ سیدھی سادی موسی، ہمیں کچھ کھلانے پلانے پر مصر ہوئی تو میں بڑی مشکل سے معذرت کر کے آگے بڑھ گیا۔ آدھ میل آگے جا کر ہم نے وہ دو پراٹھے کھائے جو رمیش اسکول کو لے جایا کرتا تھا۔

رمیش راستے بھر اپنے قصے سناتا رہا۔ یہاں تک کہ ہم دینا پور کے قصبے میں پہنچ

گئے۔ یہاں سے شہر کو جانے والی بسیں مل جایا کرتی تھیں۔ چار بج چکے تھے، آسمان پر چھائی گھٹا یکایک برس پڑی۔ ہم نے قصبہ کی ایک دکان میں پناہ لی۔ بھوک پھر چمک آئی تھی۔ دکان سے بھنے چنے اور اندرکھی (چلپا گڑ) کھا کر پیٹ کی بھوک کچھ کم کی۔ گرم گرم چائے کے دو پیالے لے کر ہم چسکیاں بھرنے لگے۔ میں نے سگریٹ منہ میں دبایا، اسے ماچس دکھا کر دھواں اڑاتے ہوئے بولا۔ ''بیٹا! میں سگریٹ پیتا ہوں لیکن یہ بری عادت ہے۔''

رمیش بولا۔'' ہاں پپا! اچھے آدمی سگریٹ نہیں پیتے۔''

یہ کہتے ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا، فوراً ترمیم کر کے بولا۔''پپا! اچھے لڑکے سگریٹ نہیں پیتے۔''

اس کی برمحل ترمیم پر میں نے مسکرا کر ہاتھ بڑھایا اور اس کے نرم گھنے بالوں میں انگلیاں الجھادیں۔

سارا دن رمیش کو اسکول سے نہ بھاگنے کی نصیحت کرنے کی سوچتا رہا، لیکن ایسا کرنے کو جی نہیں چاہا۔ آخر طے کیا کہ پھر کبھی سہی۔

تیز بارش میں بھیگتی ہوئی کچھ جوان جہاں دیہاتی لڑکیاں بارہ سنگھوں کی طرح قلانچیں بھرتی ہوئی ادھر سے گزریں۔ مجھ پر نظر پڑی تو رخ پھیر لیا۔ مجھے بدمزہ نہیں ہوا، کیوں کہ وہ میرے معصوم بچے کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہیں۔

بالآخر پانی ختم گیا، ہم اڈے پر پہنچے اور ٹکٹ کٹا کر بس میں پہنچ گئے۔

شہر میں پہنچے تو بادلوں کی وجہ سے پیش از وقت اندھیرا گہرا ہوگیا۔ سڑکیں اور ہمارے محلے کی گلیاں بھی بھیگی بھیگی تھیں۔ گھر پر پہنچے تو دیکھا میری بیوی دروازے پر پریشانی کے عالم میں کھڑی تھی۔ رمیش آگے آگے تھا۔ ماں کی نظر اپنے بیٹے پر پڑی تو چلا کر بولی۔ ''ارے کہاں تھا اب تک، میں نے سارا محلہ چھان مارا......''

رمیش ماں کی ڈانٹ سن کر پلٹا اور میری اوٹ میں ہوگیا۔ میں نے بیوی سے کہا۔'' اسے کیا کہتی ہو، یہ میرے ساتھ تھا سارا دن۔''

وہ آنکھیں نکال کر بولی۔'' اوہو! پہلے تو بیٹا ہی بھاگا کرتا تھا، اب آپ بھی دفتر سے بھاگنے لگے؟''

محلے کے بابو گوپی ناتھ میرے ہی دفتر میں کام کرتے تھے، انھیں کی زبانی میری غیر حاضری کا پتہ چل گیا ہوگا۔

ہم، باپ بیٹا، بیٹھک میں چلے گئے، باہر آنگن میں بیوی کچھ دیر تک چلاتی رہی۔ اس کا غصہ بھی بے جا نہیں تھا، آج باپ بیٹا دونوں ہی سارا دن غائب رہے۔

سہما ہوا رمیش میری گود میں بیٹھا رہا۔ لیکن اس انداز سے جیسے وہ مجھے اپنی گود میں لے لینا چاہتا ہو۔ وہ اس بات کو شدت سے محسوس کر رہا تھا کہ اسی کی وجہ سے مجھے بھی ڈانٹ پڑ رہی تھی۔ نہ جانے کتنے طویل عرصے کے بعد وہ میری گود میں بیٹھا مجھے ..ی عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ شاید میرے من کے اندر سوئے ہوئے بچپن کے جاگ جانے سے اس کے اندر خوابیدہ پدرانہ شفقت جاگ اٹھی تھی! اسے اور کچھ نہیں سوجھا تو اپنی پتلی پتلی باہیں میرے گلے میں ڈال کر مجھ سے لپٹ گیا اور پھر چند لمحوں کے بعد ذرا پیچھے ہٹ کر بولا۔'' پپا! میں آپ کے کمرے میں بیٹھ کر پڑھا کروں گا...... ٹھیک ہے نا؟''

کئی مہینے گزر گئے۔ اب وہ باقاعدہ اسکول جانے لگا تھا۔ اسکول سے غیر حاضر رہنے پر اسے ماسٹر جی اور اس کی ماں نے کئی بار ڈانٹا تھا، اس پر اثر نہ ہوا۔ لیکن جب اس کی وجہ سے مجھے بھی ڈانٹ پڑی تو وہ بہت متاثر ہوا— اس روز سے وہ ہر رات میرے کمرے میں پڑھتا ہے۔ ماسٹر جی خوش ہیں، اس کی ماں خوش ہے، اور میں......

پہلے پہل مجھے بھی گہری مسرت کا احساس ہوا تھا، کیوں کہ میری ڈانٹ کے بغیر

وہ درست ہو گیا تھا...... لیکن رفتہ رفتہ......

رات کے نو بجے ہیں، بارش ہو رہی ہے۔ کبھی کبھی کھڑکی میں سے بجلی چمکتی دکھائی دے جاتی ہے۔ رمیش مطالعہ میں محو ہے، اس کی ماں اطمینان سے بنائی کا کچھ کام کر رہی ہے۔ البتہ میں متردد ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ایک بار پھر رمیش اسکول سے اور میں دفتر سے بھاگ کر ساری دنیا کو ٹھینگا دکھا کر، اسی دن کی طرح آوارہ گردی کریں— یہ بات اس سے کہہ نہ سکتا۔ دل کی گھٹن بڑھتی جارہی ہے— پہلے وہ گمراہ تھا، اب میں گمراہ ہو رہا ہوں۔

سوچتا ہوں کہ میرا بیٹا صبح کے اجالے میں راہِ راست بھول گیا تھا، اس لیے لوٹ آیا— جو رات کے اندھرے میں راستہ بھول جائے وہ کیسے لوٹ سکے گا؟

نہیں، میں کبھی واپس نہیں لوٹ سکوں گا۔ میں ہمیشہ گمراہ رہوں گا۔

یہ افسانہ بلونت سنگھ کے بہترین افسانے مرتبہ گوپی چند نارنگ میں پہلی بار شامل ہوا ہے۔ کسی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ کلیات میں شامل کیا جارہا ہے۔

کالی تتّری

کالی تتری چُڑی وچ بولے
تے اُڈ دی نوں باج پے گیا

بڑے مزے میں مولا نے چلم میں تمباکو اور اس کے اوپر سلگتے ہوئے اپلے کے دو ٹکڑے جما دیے، اور پھر مارے سردی کے دانت کٹکٹاتا ہوا چارپائی پر چڑھ ٹانگوں پر ھنہ ڈال مگن ہو گیا۔

روٹی کھانے کے بعد اسے حقے کی سخت طلب ہوتی تھی۔ چناں چہ اس نے آنکھیں موند کر دو چار کش ہی لیے ہوں گے کہ دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔ یہ دستک اسے بڑی ناگوار گزری۔ اس نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

"کون ہے؟"

جواب میں پھر کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دی۔

پیردا فضلہ— چھوٹا سا گاؤں تھا۔ عین اس کے سرے پر مولا کا کچا مکان تھا۔ جہاں وہ اپنی بوڑھی ماں اور ایک بیوہ بہن سمیت رہتا تھا۔ گاؤں میں گھستے وقت چوں کہ اس کا مکان سامنے پڑتا تھا، اس لیے راہ گیر اسی سے کسی مکان کا پتہ یا کسی اگلے گاؤں کا راستہ دریافت کرنے کے لیے دروازہ آن کھٹکھٹاتے تھے۔ لیکن اس وقت آدھی رات ہونے

کوٹھی اور پھر سردیوں کے موسم میں تو سرِ شام ہی گاؤں پر خاموشی کا تسلط ہوجاتا تھا۔ نہ جانے بے وقت کون آن دھمکا تھا۔ جب مولا کو یقین ہوگیا کہ اسے اٹھنا پڑے گا تو اس نے حقے کی نے ایک جانب کو ہٹائی اور دھسّے کو سنبھالتا ہوا دروازے کی جانب بڑا۔

دروازہ کھولا تو دیکھا کہ باہر تاریکی میں میانے قد کا ایک سکھ کھڑا ہے۔ پگڑی اس کے سر پر موٹے رسّے کی طرح لپٹی ہوئی تھی اور اس کے ایک سرے سے اس نے اپنے چہرے کا، آنکھوں کے سوا نچلا حصہ چھپا رکھا تھا۔ اس کا رنگ سیاہی مائل گندمی تھا۔ بھنویں موٹی، گھنی اور لمبی تھیں۔۔۔ آنکھیں تیز اور متجسس۔ اس کی ناک کے جڑ کے قریب آنکھوں کے نیچے باریک اور گہری لکیروں کا جال سا بنا ہوا تھا۔

مولا بدکلامی کرتے کرتے رک گیا۔ اس نے بھاری اور خشک لہجے میں پوچھا۔

"تم کون ہو؟"

اجنبی نے لحہ بھر اس کی طرف چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور پھر غصہ سے بولا۔

"میں بھنبھوڑی گاؤں سے آرہا ہوں۔"

"بھنبھوڑی! وہ تو یہاں سے بیس کوس کی دوری پر ہے۔ لیکن تم یوں بات کرتے ہو جیسے پڑوس کے گاؤں سے آرہے ہو......"

اجنبی نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"میں ڈاچی پر آیا ہوں......"

مولا کو اس کے بولنے کا ڈھنگ پسند نہیں آیا۔ اس نے بے پروائی سے کہا۔ "خیر مجھے اس سے کیا غرض۔ سوال تو یہ ہے کہ تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟"

"مجھے بگا سنگھ بھنبھوڑی والے نے بھیجا ہے۔"

یہ سن کر مولا چوکنا ہوگیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر نووارد کا بازو تھام لیا اور جلدی سے دھیمی آواز میں بولا۔

"......تو یہاں کھڑے ہو کر کیا کر رہے ہو، اندر چلے آؤنا۔"

اجنبی بہ یک جست اندر آگیا۔ وہ بڑا مضبوط شخص دکھائی دیتا تھا۔ اس نے بدن پر موٹا کھیس لپیٹ رکھا تھا۔

مولا نے ڈیوڑھی میں سے جھانک کر اندر کی جانب دیکھا اور اس امر کا اطمینان کر لیا کہ اس کی بہن اور ماں سب سے پیچھے والے کمرے میں لحافوں میں گھسی پڑی ہیں تو اس نے صحن والا دروازہ بند کر لیا اور اجنبی سے مخاطب ہو کر بولا۔

"میں نے دروازہ بند کر دیا ہے تاکہ ہماری باتوں کی آوازیں اندر تک نہ پہنچیں۔"

اجنبی کچھ نہیں بولا۔ مولا نے تیزی سے باہر والے دروازے میں سے جھانک کر اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ پھیکی چاندنی میں دور جوہڑ کا پانی پگھلے ہوئے سیسے کی ٹکی کے مانند دکھائی دے رہا تھا۔ ہوا ساکن تھی۔ پیڑ اور دور دور تک پھیلی ہوئی جھاڑیاں بے حس و حرکت کھڑی تھیں۔ یہ دیکھ کر مولا نے اپنے دانتوں میں اٹکی ہوئی حقے کی نے کو ہونٹوں میں دبوچ کر بڑے اطمینان سے گڑگڑ کی آواز بلند کی اور پھر دروازہ بند کر کے لوٹا۔ نووارد ڈیوڑھی میں اندر بنی ہوئی کھرلی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

"بھوک لگی ہو تو بتاؤ کھانے دانے کا کچھ بندوبست کروں۔"

"نہیں میں کھانا کھا کر آیا ہوں قریب کے گاؤں سے ...... بس اب کام ہو جانا چاہئے۔"

"کیوں اِتی جلدی بھی کیا ہے؟"

"مجھے پھورن لوٹنا ہوگا۔"

"کیوں؟"

"تجھے نے یہی کہا تھا۔ میرا یہاں رہنا مناسب نہیں۔ کسی نے دیکھ لیا تو سک ہوگا۔ کھاہ مکھاہ۔"

"ڈاچی کہاں ہے؟"

"ڈاچی ساتھ والے گاؤں میں اپنے ایک دوست کے ہاں چھوڑ آیا ہوں۔"

"اور بندوکھ؟ (بندوق)"

"بندوق میرے پاس ہے؟"

مولا کو تعجب ہوا کہ اتنی بڑی بندوق اس نے کہاں چھپا رکھی ہے۔

اس پر اجنبی نے قدرے جھنجھلا کر قمیص کے نیچے سے دو نالی بندوق دکھائی جس کی دونوں نالیاں الگ کر کے اس نے بٹ سمیت انگوچھے میں لپیٹ رکھی تھی۔

اور پھر ان پر ایک رسّی کس کر باندھ رکھی تھی۔

اب مولا سمجھا۔ سر ہلا کر بولا۔

"اچھا توڑ کر باندھ رکھی ہے۔"

"ہاں ویسے چھپ تو نہیں سکتی نا۔"

"ٹھیک۔"

"اب جلدی کرو۔"

"اور کارتوس؟"

اجنبی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ بگڑ کر کہنے لگا۔

"دیکھو میں بالکل تیار ہو کر آیا ہوں..... بس اب مجھے موکے پر لے چلو۔"

"اچھی بات ہے۔" یہ کہہ کر مولا نے حقے کے دو تین خوب گہرے گہرے کش لیے۔ پھر دھسّے کو بدن پر خوب اچھی طرح لپیٹا اور مسکرا کر بولا۔

"استاد تمھیں میرے گھر کا پتہ کیسے چلا؟ کسی سے پوچھا تھا کیا؟"

"میں ایسا کچا نہیں ہوں کہ کسی سے تمہارے گھر کا پتہ پوچھتا پھروں۔ اس طرح تو تم پر شبہ کیا جا سکتا تھا۔ تجّے نے مکان کا ٹھیک ٹھیک پتہ اور تمہارا حلیہ بتا دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ تمہاری راہ دیکھتا ہوگا۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" مولا ہنس کر بولا۔ "تجو اس کام کو کسی ماسولی آدمی کے سپرد نہیں کر سکتا تھا۔ اچھا تو لو میں چلا۔ ابھی دو تین اور آدمیوں کو بھی بلانا ہے۔"

"بلا لاؤ۔ پر میں ان کو اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔"

"بے شک بے شک جرورت بھی کیا ہے؟"

یہ کہہ کر مولا چلنے لگا تو اجنبی بولا— "حقّا لیتے جاؤ۔"

"کیوں؟"

"حقّا گڑگڑاتے چلو گے تو سک نہیں ہوگا، دیکھنے والوں کو۔"

"یہ تو واقعی کھری بات کہی تم نے۔"

مولا نے حقہ اٹھایا۔ نے دانتوں میں دبائی، اور چلم سے بندھی ہوئی چٹی جھلاتا اور تہمد لہراتا ڈیوڑھی سے باہر نکل گیا۔

اجنبی نے اس کے رخصت ہوتے ہی دروازہ اندر سے بند کر لیا اور سرکنڈوں کا بنا ہوا بالشت بھر اونچا مونڈا گھسیٹ کر سلگتے اپلوں سے بھری ہوئی مٹی کی انگیٹھی دونوں ٹانگوں کے درمیان رکھ کر بیٹھ گیا۔

مولا کینچوؤں کی طرح بل کھاتی ہوئی سنسان اور تنگ گلیوں میں سے گزرتا ہوا بالآخر ایک بوسیدہ کچے مکان کے آگے کھڑا ہو کر آوازیں دینے لگا: "سدا گرا! اوئے سدا گرا!!"

کوئی جواب نہ ملنے پر اس نے پھر ہانک لگائی۔

"اوئے سدا گرا! سدا گرا ہوئے!"

پھر وہ اطمینان سے حقہ گڑگڑانے لگا۔ دماغ میں جو طراوت پہنچی تو دل اجنبی کو دعائیں دینے لگا۔ جس نے کہ حقہ اس کے ہمراہ بھجوا دیا تھا۔

مکان کا دروازہ کھلا۔ اندر سے گھنے اور کالے بالوں والا ایک نوجوان نکلا۔ پہلے تو اس نے مولا کی جانب خواب ناک آنکھوں سے دیکھا لیکن جب پہچانا تو اس کی آنکھیں پورے طور سے کھل گئیں۔

مولا نے زرد زرد دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔" واہش دے دے کر بھرا تو گلا بھی بیٹھ گیا۔ کہاں گھسا پڑا تھالاں کے موڑے۔"

اس پر دونوں ہنسنے لگے۔

سداگر نے پوچھا: "ہاں بے بتا۔"

جواب میں مولا چپ چاپ حقہ گڑگڑاتا رہا۔ پھر اس نے شرارت اور پر معنی انداز سے ابرو اوپر اٹھا کر ایک آنکھ اس طرح ماری جیسے ڈھیلا کھینچ کر مار دیا ہو۔

سداگر سمجھ گیا۔

"چلو۔" مولا نے کہا۔

"ٹھہرو۔ میں اوڑھنے کے لیے تو کچھ لے آؤں اندر سے۔"

وہ بھاگا اندر گیا اور کالے رنگ کی ایک لوئی بدن پر لپیٹتا ہوا فوراً واپس آ گیا۔

دونوں وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ گاؤں پر ہو کا عالم طاری تھا۔ کہیں کہیں کوئی کھجلی ماری کتیا دانت دکھاتی ہوئی دکان کے ایک تختے سے نکل کر دوسرے تختے تلے دبک جاتی۔ یا گارے سے بنے ہوئے کچے مکانوں کی دیواروں تلے چھچھوندریں جان چھپاتی پھرتی تھیں۔

دبے دبے لہجے میں باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں بڑھتے چلے گئے۔ انہوں نے میلا سنگھ کو اس کے مکان سے اور لبھو کو مویشیوں کے طویلے سے بلا کر اپنے ہمراہ لیا اور واپس مولا کے مکان پر پہنچ گئے۔

اندر سے اجنبی نے دروازہ کھولا۔ اس کا چہرہ اب پگڑی کے شملے میں چھپا ہوا تھا۔ سداگر، لبھو اور میلا سنگھ ابھی جوان تھے۔ ان کاموں میں نئے نئے داخل ہوئے تھے اجنبی کا نقاب کے پیچھے چھپا ہوا چہرہ اور جن کے مانند گھنی بھنوؤں تلے اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر ان کے نوخیز جسموں میں سنسنی کی لہریں دوڑ گئیں۔

اجنبی نے جلدی سے ان کی صورتوں کا جائزہ لیا۔ پھر اس نے کھیس میں سے ہاتھ نکال کر اشارہ کیا کہ اب دیر کس بات کی ہے؟

اس کا ہاتھ بھی کالا تھا۔ اس پر موٹے موٹے بال اُگے ہوئے تھے۔

مولا نے جواب دیا۔

''دیر کسی بھی بات کی نہیں۔''

''تو اب چلیں۔''

''ضرور۔''

مولا نے آگے قدم بڑھایا اور باقی سب اس کے پیچھے ہو لیے۔ اجنبی کے قدم بڑی پھرتی سے اٹھ رہے تھے اور اس کی پتلیاں دم بھر کو بھی ایک جگہ نہیں رکتی تھیں۔ تسبیح کے دانوں کی طرح کھٹا کھٹ گھومتی تھیں۔

دور سے کبھی کبھار پہرے دار کے دفعتاً چلا اٹھنے کی آواز یوں سنائی دے جاتی جیسے وہ کوئی خوف ناک خواب دیکھ کر ہڑبڑا کر اٹھا ہو۔ اس کی آواز اور اپنے درمیان کا فاصلہ رکھتے ہوئے وہ بڑی تیزی سے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔

گاؤں سے نکل کر تقریباً پون میل کی دوری پر واقع پیراں والے رہٹ پر پہنچ کر وہ رک گئے۔ مولا کے اشارے پر شدا کرنے رہٹ کے قریب والے باڑے میں گھس کر ایک مریل بیل کو باہر نکالا اور پھر وہ اسے ہانکتے ہوئے ذرا پرے لے گئے اور گاؤں کے ایک بڑے سود خور کے کھیت میں اسے چھوڑ دیا اور وہ خود ببول کے پیڑ کی چھدری چھاؤں تلے جا کھڑے ہوئے۔

پورا چاند آسمان پر چمک رہا تھا۔

اجنبی سکھ نے اپنی بغل میں سے بندوق کا انجر پنجر نکالا۔ نالیوں کو بٹ سے کڑک کیا اور نیچے کی جانب چوبی تکی جمائی اور ہتھیلی کی ایک ہی ضرب سے اسے اپنی جگہ پر بٹھا دیا۔

پھر اس نے دونوں نالیوں میں ٹھوس گولیوں والے کارتوس (Bullets) بھرے اور ایک نظر مریل بیل کی جانب دیکھا جو سرد ہوا میں کان پھڑپھڑاتا اور پتلی اور کمزور دم کو نقاہت سے ہلاتا گھاس پر منہ مار رہا تھا۔ پھر اس نے شست باندھ کر لبلبی دبائی۔ گولی

کھاتے ہی بیل بغیر کسی جد و جہد کے زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ یہ گولی تو شیر کو ٹھنڈا کردینے کے لیے کافی تھی، لیکن اجنبی نے احتیاط کے طور پر دوسری گولی بھی اس کی گردن پر چپکا دی۔

بیل کا کام تمام ہوتے ہی اجنبی نے اپنی اور بھی تیزی سے چمکتی ہوئی آنکھوں سے مولا اور اس کے ساتھیوں کی جانب دیکھا پھر بھاری آواز میں بولا۔

"اچھا اب مجھے چلنا چاہیے۔ صبح سے پہلے واپس پہنچنا ضروری ہے۔"

مولا نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "اچھی بات۔"

اجنبی نے چاروں سے ہاتھ ملاتے ہوئے ایک بار پھر بھاری آواز میں کہا:

"ساب سلامت!"

"ساب سلامت!"

اجنبی نے پھر اپنی بندوق کو توڑ تاڑ کر اس پر کپڑا لپیٹ دیا اور پھرتی سے قدم اٹھاتا ہوا قدرے پھیکی چاندنی میں غائب ہوگیا۔

وہ چاروں کچھ دیر تک اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ پھر وہ بیل کی جانب بڑھے۔ اور دیکھا کہ وہ قطعاً مر چکا ہے۔

اب وہ جلد جلد گاؤں کی جانب بڑھے۔ اور گاؤں کے قریب پہنچ کر انہوں نے دفعتاً 'پکڑو پکڑو' کا شور بلند کیا۔

لوگوں کو ڈاکوؤں کا ڈر لگا رہتا تھا۔ چناں چہ بہت بڑی تعداد میں لوگ گھروں سے باہر نکل آئے تب انہیں پتہ چلا کہ بے چارے مولا کا بیل گولی سے مار دیا گیا۔

مولا دیر تک گولی مارنے والے کی ماں اور بہنوں سے اپنا رشتہ گانٹھتا رہا اور جب اس کا گلا بیٹھ گیا تو سورج نکلنے سے پہلے پہلے وہ چھ کوس پرے تھانے میں اس امر کی رپٹ درج کروا کر گاؤں لوٹ آیا۔

2

پیروالصغیر گاؤں چھوٹا تھا لیکن یہاں کا سب سے امیر گھرانہ "ماہنہ" دور دور تک مشہور تھا۔ اردگرد دیہات میں ان کی اسامیاں موجود تھیں اب ماہنوں کا دبدبہ کچھ کم ہوگیا تھا۔ کیوں کہ پیر کے ٹھٹھے اور اردگرد کے دیگر گاؤں کے بدمعاشوں نے مل جل کر خواہ مخواہ مقدمہ بازی میں پھنسا کر انہیں کھوکھلا بنا دیا تھا اور ادھر ان کے لیے مولانے ایک نئی مصیبت کھڑی کردی تھی۔

سردیوں کا سورج کچھ زیادہ بلند نہیں ہونے پایا تھا کہ علاقے کے تھانے سے ایک لمبا تڑنگا مسلمان تھانے دار گھوڑے پر بیٹھا اور دو سائیکل سوار سپاہی ساتھ لے کر پیر کے ٹھٹھے میں آن دھمکا۔

گاؤں کے باہر ایک بڑے اور بزرگ پیپل کے پیڑ تلے پہنچ کر تھانے دار گھوڑے پر سے اترا۔ سنہرے کلاہ پر لپٹی ہوئی اس کی خاکی رنگ کی کلف لگی پگڑی کے لہراتے ہوئے شملے دور ہی سے دکھائی دینے لگے۔ چناں چہ گاؤں بھر کے چماروں، بھنگیوں اور کسانوں کے بچے اور کتے گاؤں میں گھستے ہی ان کے پیچھے ہو لیے اور اب وہ ایک بڑا سا حلقہ بنائے کھڑے تھے۔

پیپل کے نیچے بلا کی گرد تھی جس میں سوکھے پتے اور بھوسے کے تنکے ملے ہوئے تھے۔

گھوڑے کی لگام سکھ سپاہی کے ہاتھ میں تھما کر تھانے دار نے دونوں طرف سے وردی کو کھینچ کر اپنے سڈول بدن پر جمایا اس کا اونچا قد کلاہ دار پگڑی کے باعث اور بھی اونچا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی دمکتی ہوئی پیشانی خوب کشادہ تھی اور اس کی ناک جڑ ہی سے ایک دم اوپر کو اٹھ گئی تھی۔ اپنی شان دار اونچی ناک کی وجہ سے وہ بڑا باوقار اور بارعب انسان نظر آرہا تھا۔ ابھی نوجوانی کی ناتجربہ کاری اس کے چہرے سے جھلکتی تھی، لیکن وہ ذہین ضرور تھا۔ اس کے سبز رنگ کی پتلیوں کی وجہ سے وہ بھول دیہاتیوں کے

انگریج' جان پڑتا تھا۔

پہلے اس نے کھلی ہوا میں ٹہل ٹہل کر دو تین گہرے سانس لیے اور پھر جیب ٹٹول کر ایک خاکی رنگ کا کاغذ باہر نکالا اور اس پر بغور نظر دوڑانے لگا۔

اسی اثنا میں گاؤں کے لوگ بھی جمع ہونے شروع ہوگئے۔ ادھر سکھ سپاہی نے گھوڑے کی لگام پیپل کی جڑ سے باندھ دی۔

کہیں سے نمبردار کی خبر ملی تو وہ بیچارا سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ جب وہاں پہنچا تو حال یہ کہ دم پھولا ہوا اور پگڑی ٹانگوں میں الجھی ہوئی۔ تھانے دار نے ٹانگیں اکڑا اکڑا کر نظر اوپر اٹھائی اور حلقے میں کھڑے ہوئے آدمیوں میں سے ایک کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔

وہ بیچارا گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

تھانے دار نے تحکمانہ انداز سے کہا۔ "میں تمہیں کو دیکھ رہا ہوں۔"

"جی مجکو؟" اس آدمی نے اپنے سینے پر انگلی جماتے ہوئے پوچھا اور اثبات میں جواب پاتے ہی اس نے مضحکہ خیز انداز سے آنکھوں کی پتلیاں دائیں بائیں گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر پگڑی سنبھالتا ہوا تھانے دار کی جانب بڑھا۔

"تم مولا کا گھر جانتے ہو؟"

"آہو جی اوہ......"

"جاؤ اسے بلا کر لاؤ۔"

وہ آدمی سرپٹ بھاگا لیکن مولا حقہ ہاتھ میں لیے پہلے ہی سے تمبہ اڑاتا چلا آرہا تھا۔

تھانے دار سے آنکھیں چار ہوتے ہی اس نے دور ہی سے حقہ زمین پر رکھ دیا اور بڑے غلو سے جھک کر فرشی سلام کیا اور پھر آگے بڑھا۔

" موتیاں والیو! میں نے دور ہی سے آپ کو دیکھ لیا تھا۔ بس حقہ تازہ کرنے

میں دیر ہوگئی۔"

یہ کہہ کر مولا نے بڑے خوشامدانہ انداز سے حقے کی نے اس کے نتھنوں سے بھڑا دی۔

نمبردار آتے ہی چار پائی کا انتظام کرنے کے لیے الٹے پاؤں لوٹ گیا۔ بیٹھنے کی کوئی مناسب جگہ نہ پاکر تھانے دار ایک مگدر پر بیٹھنے لگا تو مولا نے بڑھ کر اپنا کھیس بچھا دیا اس پر اور پھر للکار کر کہا— "اوے میا دیوا بگج کے میرے گھر سے چار پائی اور بستر لے آ۔"

اس کی بات سنتے ہی دو تین آدمی بھاگ نکلے۔

تھانے دار نے پہلے تو چپ چاپ حقے کے خوب گہرے گہرے کش لیے اور پھر مولا کی جانب مخاطب ہوتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ "سنا اوئے بھوتنی پلستر! بات کیا ہے آج چوروں کے گھر مور پڑ گئے؟"

"توبہ! میری توبہ!!" کہتے کہتے مولا وہیں اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ "جر جستو! جبھی تو کہتے ہیں کہ بد اچھا بدنام برا۔"

"ہاں خوب یاد آیا۔" تھانے دار نے سپاہی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "اوئے مجیب سیہنا! جا، جرا رام لال مانہے تے اوہدے لڑکے کوتو بلا کے لیا۔"

پہلے ہی سے سدھائے ہوئے سداگر نے آگے بڑھ کر ہاتھ جوڑ دیے اور مسکین آواز میں بولا۔ "کھان صاب بڑا انرتھ ہویا اے جی۔ بچارے مولا کی تاں کمر ہی ٹٹ گئی۔ کسان کو بیل کا بڑا سہارا ہوتا ہے۔"

مولا نے ٹھنڈی سانس بھر کر منہ نیچے کو لٹکا دیا۔

اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ رام سفید دھوتی اور اس پر سفید کرتا پہنے آ پہنچا۔ اس کے ساتھ اس کا نرم و نازک بیس سالہ لڑکا ہیرا لعل بھی تھا جو چنون پہنے تھا۔

تھانے دار نے باپ بیٹے کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ باپ بچارہ ادھیڑ عمر کا

سنجیدہ انسان تھا۔ لیکن تھانے دار کو لڑکے کے کھڑے ہونے کے انداز سے بغاوت کی بو آئی تاہم اس نے کافی تحمل سے پوچھا۔

"اے لونڈے اپنا نام بتائیو۔"

اس پر پڑھے لکھے لڑکے کو کچھ گرمی آ گئی۔ برہم ہو کر انگریزی زبان میں بولا:

" You Should Not Be So Rude"

تھانے دار کو انگریزی بس واجبی آتی تھی۔ اس لیے وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔" دیکھ اوے منڈیا! ہم سے زیادہ گٹ پٹ نہیں کرنا۔ جو کہنا ہو سو اپنی بولی میں کہو تا کہ سب لوگ تمہارا بیان سمجھ سکیں۔"

نوجوان ذرا تیز مزاج تھا۔ بولا۔" آپ افسر ہیں۔ آپ کو ذرا تمیز سے بات کرنی چاہیے۔"

یہ غیر متوقع جواب سن کر تھانے دار نے سر اوپر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے۔ اس نے اشارے سے سپاہی کو قریب بلایا اور ہونٹ کاٹ کر بولا۔" عجیب سیہا! اس منڈے کو تھوڑی تمیز دکھاؤ۔"

عجیب سنگھ کے دو تین جھانپڑ کھا کر نوجوان کے دانت ہل گئے۔ تھانے دار نے اس کے چکنے بالوں کے گچھے کو ہاتھ میں دبوچ کر کہا۔" بیٹا میں تمہارے ایسے شریف بدمعاشوں کو سیدھے راستے پر لانا خوب جانتا ہوں۔" پھر حاضرین کی جانب متوجہ ہوئے۔" دیکھو جی ایک غریب کسان کا بیل گولی سے اڑا دیا اور اوپر سے دھونس جماتے ہیں۔ قانون ہمارے ہاتھ میں ہے۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دکھانا ہمارا کام ہے۔"

حاضرین میں سے بیش تر نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ تھانے دار غرا کر بولا۔"اوئے مولیا۔"

"جی سوتیاں والیو!"

مولا بغل ہی میں سے نکل کر ہاتھ باندھ کر تھانے دار کے روبرو کھڑا ہو گیا۔"
"بیل کہاں پر مرا پڑا ہے۔"
"شہنشاہ جی! وہ تو مانجھوں کے کھیت میں ہی مرا پڑا ہے۔ بے چارا قسمت کا مارا باڑے میں سے نکل کر ان کے کھیتوں میں جا نکلا۔ بس اٹھا کے گولی داغ دی انہوں نے بھلا دو ڈنڈے مار کر نکال دیتے سالے کو۔ غریب کا بیل تو بچ جاتا۔" یہ کہتے کہتے مولا نے روتی صورت بنالی۔

مانجھا یہ الزام سن کر سٹپٹا گیا۔ لیکن بیٹے کا حشر دیکھ چکا تھا، اس لیے چپ رہا۔
"ہم مرا ہوا موقع پر دیکھیں گے۔"
"چلو موتیاں والیو!"

اب آگے آگے موتیاں والا۔ ساتھ ساتھ مولا، سوداگر، لبھو وغیرہ۔ ان کے پیچھے مانجھے اور سب کے آخر میں ناک سڑسڑاتے بچے اور دُمیں ہلاتے ہوئے کتے۔

یہ لشکر کھیت پر کھیت پھلانگتا ہوا جب مانجھوں کے کھیت میں پہنچا تو دیکھا کہ سردی سے اکڑا ہوا بیل کھیت میں ٹانگیں پسارے پڑا ہے...... مولا نے احتیاطاً ایک لونڈے کو وہاں بٹھا دیا تھا۔ تاکہ گدھ اور کتے مردار کے قریب نہ آئیں۔

خان صاحب (تھانے دار) نے بیل کی اگلی ٹانگوں کے پیچھے اور گردن میں لگی ہوئی گولیوں کے نشانات کو بغور دیکھا۔ گاؤں کے تین چار آدمیوں کو بھی دیکھنے کا حکم دیا۔ پھر گاؤں واپس آ کر پیپل کی چھاؤں تلے بچھی ہوئی چار پائی پر بیٹھ گئے۔ اس وقت ان کے لیے مکھن اور لسی کا کٹورا تیار تھا۔

مکھن کا گولہ نگل کر اور اوپر سے لسی چڑھا کر خان صاحب نے باچھیں جھاڑن نما رومال سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں بے مولو! اب بتا سارا قصہ۔ تیرا بیان لکھا جائے گا اب۔"

مولا نے کھانس کر گلا صاف کرتے ہوئے بتانا شروع کیا کہ کیسے پچھلی رات کو

وہ اپنے باڑے تک یہ دیکھنے کے لیے گیا کہ وہ لونڈا جو وہاں مویشیوں کی رکھوالی کے لیے مقرر تھا، وہاں موجود بھی تھا یا نہیں کیوں کہ اس کمبخت کا ایک چمارن سے یارانہ تھا۔ موقع پا کر راتوں کو ادھر بھی کھسک جایا کرتا تھا۔

''تم اکیلے تھے یا اور بھی کوئی ساتھ تھا۔''

''نہیں جی کیلا کتھے۔ میرے نال سداگر، میلو، اور لبھو بھی تو تھے۔''

''یہ کب سے تمہارے ساتھ تھے؟''

''بادشاہو، یہ تو ہر روج میرے ساتھ ہوتے ہیں۔ کھانے دانے سے فرصت پا کر کبھی یہ میرے پاس آجاتے ہیں اور کبھی میں ان کے پاس چلا جاتا ہوں، گپ اڑانے کے لیے۔''

''اچھا اچھا پھر کیا ہوا؟''

''پھر شہنشاہو، ابھی ہم باڑے سے دور ہی تھے کہ دھائیں دھائیں دوبار بندوق چلنے کی آواز سنائی دی۔ ہم تو جی ڈر کے مارے کھیتوں میں چھپ گئے......''

''اچھا تو تم ڈر گئے؟'' خان صاحب نے پوچھا کیوں کہ شکل ہی سے مولا ان آدمیوں میں سے دکھائی دیتا جنہیں ڈر کبھی چھوتا بھی نہیں۔

'' آہو جی ہم ڈر گئے؟''

''اچھا پھر؟''

اتنے میں یہ ننگا مانہہ گاؤں کی طرف بھاگتا دکھائی دیا۔ پہلے ہم سمجھے کسی ڈاکو نے اس پر گولی چلائی ہے۔ پر جی اس کے ہاتھ میں بندوق دیکھ کر ہم گھبرا گئے۔''

'' ہوں......'' خان صاحب نے اثبات میں یوں سر ہلایا۔ جیسے وہ اس معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے ہوں۔ ''پھر؟''

''پھر جی ہم باڑے کی طرف بڑھے۔ راستے میں انہیں کے کھیت پڑتے ہیں۔ وہاں ہمیں سفید سفید چیز دکھائی دی۔ ہم ڈرتے ڈرتے قریب پہنچے تو دیکھا کہ میرا بیل

مرا پڑا ہے۔ میں نے تو سر پیٹ لیا اور جھک کے دیکھا تو گولیوں کے نشان دکھائی دیئے۔"

تھانے دار صاحب نے مولو سے متعدد سوالات کیے۔ پھر میلو، سوداگر اور نتھو کی جرح کی گئی۔

"اچھا تو سوداگر! تم نے اچھی طرح پہچان لیا تھا کہ وہ رام لعل کا بیٹا ہیرا لعل ہی تھا؟"

"ہاؤ جی۔"

اس طرح سے سب نے الگ الگ اس امر کی تصدیق کی۔ اب خان صاحب پھر ہیرا لعل کی طرف متوجہ ہوئے۔ "دیکھو ہیرا! سچ سچ بتادو کہ آخر بات کیا ہے۔ ورنہ یاد رکھو کہ میں مجرموں کا سخت دشمن ہوں۔ تھانے پہنچ کر دو کانوں میں سر کردوں گا تمہارا......"

اب تو ہیرا لعل تاؤ میں آنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ابھی پہلی مار ہی سے اس کی ناک جل رہی تھی اور ہونٹوں پر سوجن آگئی تھی۔ اس نے مدھم آواز میں کہا۔ "یہ الزام بالکل بے بنیاد ہے۔ میں تو کھانا کھا کر گھر سے باہر تک نہیں نکلا۔"

خان صاحب نے اس کے باپ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "لالہ! تمہارا لونڈا ذرا سخت دانہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ہمارا کام بھی بھولے بھٹکوں کو راستے پر لانا ہے۔ سمجھا لو اپنے بیٹے کو۔ ورنہ ایک بار میں نے ہاتھ اٹھا دیا تو یاد رکھو پہچان نہیں پاؤ گے کہ اس کا سر کدھر کو تھا اور منہ کدھر کو۔"

رام لعل مقدمہ بازی سے تنگ آچکا تھا ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "خان صاحب! ابھی لڑکا ہی تو ہے، شاید...... میں بیل کی قیمت دینے کو تیار ہوں۔"

"بیل کی قیمت؟" مولا نے چلا کر کہا۔ "غریب کے بیل کی جان اتنی سستی نہیں ہوتی کہ جب جی چاہا مار دیا اور پھر پیسے کی دھونس جتانے لگے۔"

خان صاحب بولے۔" چپ رہو جی تم۔ بکواس بند کرو۔"

"نہیں بادشاہو! میری کیا مجال ہے۔" مولا ہاتھ جوڑ کر الگ کھڑا ہو گیا۔

"اچھا لالہ اپنی بندوق تو منگواؤ ذرا۔"

بندوق حاضر کی گئی۔

ہیرا بولا۔" دیکھیے بندوق کی نالی میں گریز لگا کر میں نے الگ رکھ چھوڑی تھی۔"

خان صاحب نے ہیرا کی طرف گھوم کر دیکھا اور زور زور سے سر ہلا کر بولے۔

"سب سمجھتا ہوں یہ گریز تو آج ہی کی لگی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔"

تھوڑی دیر تک بندوق کا معائنہ کیا گیا۔ پھر انہوں نے سپاہی سے کہا۔

"عجیب سیتھا! کاغذ لاؤ تو بندوق کی رسید لکھ دوں۔"

اس کے بعد سب کے بیانات مکمل کیے گئے اور پھر تھانیدار نے کہا۔" بندوق تھانے میں داخل ہوگی بیٹا! ہیرا چلو تھانے۔ پھر دیکھو میں ہیرا کا بیڑا کیسے بناتا ہوں۔"

رام لعل بیٹے کے لیے سخت پریشان تھا۔ ہاتھ باندھ کر بولا۔

" خان صاحب دیا کیجئے۔ میں بیل کی قیمت اور جرمانہ دینے کو تیار ہوں۔"

" یہ تو بعد کی باتیں ہیں..... معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری جیب میں روپے اچھل رہے ہیں لالہ!"

رام لعل نے بہ مشکل تھوک نگلتے ہوئے پوچھا" کیا ضمانت نہیں ہو سکتی؟"

" یہ سب تھانے پہنچ کر طے ہوگا۔"

یہ کہہ کر خان صاحب گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ جب وہ ہیرا کو لے کر چلنے لگے تو رام لعل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ جانتا تھا کہ لڑکے نے جوش میں آکر گستاخی کی ہے اس لیے اس کی خیر نہیں۔ کچھ سوچ کر آگے بڑھا اور ہاتھ جوڑ کر بولا:

"خان صاحب! ایک بات عرض کروں۔"

خان صاحب نے گھوڑا روک لیا۔

''بات یہ ہے کہ مولا کے بیل کو گولی میں نے ماری تھی۔''

خان صاحب نے ہنس کر گھوڑے کو ایڑ دی اور بولے۔''لالہ! لڑکے کو بچانے کی خاطر جھوٹ بول رہے ہو۔ ذرا گواہوں سے تو پوچھو۔ ہم تو قانون کے بندھے ہیں جب تھانے دار صاحب ان سب کی نظروں سے اوجھل ہوگئے اور بندوق بھی اپنے ساتھ لے گئے تو مولا نے اپنے گھر کی ڈیوڑھی میں پہنچ کر پہلے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر بھاری آواز میں بولا۔'' یا مولا!'' اس کے بعد سداگر سے مخاطب ہو کر اس نے کہا۔'' دیکھ بے سداگر! ابھی بھسنگوی پر سوار ہو کر سیدھا بکھنوڑی چلا جا اور بگا سنگھ سے کہہ دے کہ دھائیں دھائیں بولنے والی چڑیا پنجرے میں بند ہوگئی ہے۔

3

ابھی سورج ڈھل ہی رہا تھا کہ دفعتاً اس قدر زور کی آندھی اٹھی کہ زمین سے آسمان تک دھواں دھار ہوگیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کرہ زمین کا سینہ پھٹ گیا ہے ارد گرد کے بادل در بادل فلک بوس پہاڑوں کے مانند جھوم جھوم کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور ارد گرد کا یہ سمندر خس و خاشاک کو اڑاتا، امڈتا چلا آرہا ہے— سورج دفعتاً روپوش ہوگیا۔ ہر چہار جانب دھندلاہٹ اور تاریکی بڑھتی جارہی تھی اور گدلے آسمان میں آنے والی آندھی کی خبر دینے والے چیلوں کے جھنڈ بھی اس بے پناہ دھندلاہٹ میں خلط ملط ہوگئے۔

لکڑی کے بنے ہوئے بھاری بھاری چرکھڑوں والے رہٹ لے اوپر چھائے ہوئے پھلاہ کے بڑوں کے جھنڈ میں سے کپورا سنگھ ٹھٹھے والا ایک آتشیں تھوتھنی والی سرتا پا سیاہ مضبوط گھوڑی پر سوار باہر نکلا۔ اس نے پہلے پیر کے ٹھٹھے کی جانب دیکھا اور پھر دور دور تک بچھے ہوئے کھیتوں پر نگاہ دوڑائی، لیکن اس کی نظر دور تک نہیں جاسکی۔ کیوں کہ آندھی دم بہ دم بڑھتی آرہی تھی۔ کھیتوں کی فصلیں گرد آلود ہوا کی آمد آمد سے ایک بڑے

تالاب کے میلے گدلے پانی کی طرح لہریں لیتی دکھائی دے رہی تھیں۔

کیورا ٹھٹھے والا، جسے عام طور سے کالا تیتر کہتے تھے، اسے گاؤں سے نکال دیا گیا تھا۔ کئی برس سے اس نے گاؤں میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کی تھی۔ لیکن ہفتہ بھر پہلے وہ چوری چھپے اپنی بہن کو ملنے کے لیے گیا۔ صرف ایک رات رہ کر اور یہ معلوم کر کے کہ سسرال سے لائے ہوئے زیورات وہ کہاں پہ رکھتی ہے، چپ چاپ لوٹ آیا تھا۔ آج ان زیورات اور اس کے ساتھ اڑوس پڑوس والوں پر ہاتھ صاف کرنے کا ارادہ تھا۔

وہ بہت جسیم انسان تھا، کالا بھجنگ، حرامی پن نس نس میں بھرا ہوا تھا۔ اس کا دل بے حس اور جذبات کند ہو چکے تھے۔

ابھی وہ دور دور تک نگاہ دوڑا ہی رہا تھا کہ کھیتوں میں چند سائے دکھائے دیئے جو پرچھائیوں کی طرح اس کی جانب آئے۔

آندھی کا زور بڑھنے لگا۔

گاؤں کے چاروں طرف پھیلی ہوئی گرد پر پہلے تو سبک دھول کی چادریں لہلہائیں پھر بھاری گرد تہہ در تہہ اوپر کو اٹھنے لگی اور جوہڑ کے پانی کے سرسراتے ہوئے سانپوں کی طرح ننھی ننھی لہریں بل کھا کھا کر کروٹیں لینے لگیں۔ طوطے، کوے دیگر گھریلو چڑیاں پیپل اور دھریک کے پیڑوں میں پناہ گزیں ہو گئیں۔

کھیت کھیت چلتے ہوئے وہ آدمی جب قریب پہنچے تو کیورے نے انہیں پہچان لیا۔ آگے آگے مولا تھا اور اس کے پیچھے پیچھے سداگر، نبھو اور میلا سنگھ۔

انہیں دیکھتے ہی کیورا کرخت لہجے میں بولا:

"تم لوگ کہاں تھے؟"

"یہاں تو تھے۔" سداگر نے ہنس کر جواب دیا۔

کیورے کو سداگر کی ہنسی پسند نہیں آئی۔ اس نے اس کی جانب کڑی نظروں سے دیکھا۔ وہ خود بہت کم ہنستا تھا۔ ظاہر تو یہ ہوتا تھا کہ وہ سداگر کے منہ پر الٹے ہاتھ

کا جھانپڑ دے گا لیکن پھر خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا اور مولا سے مخاطب ہوا۔

"مولا!"

"ہوں۔"

"سب ٹھیک؟"

"ہم تو سب ٹھیک ہی ہیں..... تیاری تو تمہاری ہونی چاہئے۔"

اسے مولا کی حاضر جوابی بھی پسند نہیں آئی۔ لیکن اس وقت غصے کا موقع نہیں تھا۔ اور کچھ نہیں تو ڈاکے کا معاملہ چوپٹ ہو جانے کا ڈر تھا۔ تاہم اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

"ہماری تیاری سے تمہارا کیا مطلب؟ تم تو اپنی کہو۔"

"ہمارا کام تو کبھی کا ہو چکا۔ گاؤں میں ایک بندوق تھی سو اب تھانے میں ہے۔"

"کسی طرف سے کوئی بات نکلی تو نہیں؟"

"نہیں۔"

"کوئی افواہ، شک و شبہ؟"

"کچھ نہیں۔"

"کپور کی گھوڑی شاید آندھی میں کسی قسم کی بو پا کر بے چین ہو ہو کر بدکتی اور بے چینی سے زمین پر سم جھاڑتی تھی۔ لیکن وہ اسی پر خوب جم کر بیٹھا تھا۔

تاریکی دم بہ دم بڑھتی جا رہی تھی۔ کپورے کی لوہے کی تاروں کی طرح سخت داڑھی کے بال لہرانے لگے۔ کھیتوں سے بھاگ کر لوگ باگ اپنے اپنے گھروں میں گھس گئے تھے۔ چور خوش تھے کہ آج پروردگار بھی ان کی مدد کرنے پر تلا ہوا تھا۔

انہیں کئی ساتھیوں کا انتظار تھا جو دور دور یعنی پٹیالے تک سے آنے والے تھے۔ کپورے نے سوچا کہ اگر آندھی کی یہی کیفیت رہی تو انہیں اپنی کارروائی جلد شروع کرنی ہوگی۔

کپورا بولا۔ "اچھا اب میں چلتا ہوں۔"

"ابھی باقی لوگ تو نہیں آئے ہوں گے۔"

"آ گئے ہوں گے۔ چل کر دیکھتا ہوں۔ تم لوگوں کو تلاش کرنے میں میرا وقت خراب ہوا۔"

"ہم تمہیں دیکھتے رہے۔ تم کہیں دکھائی نہیں دیئے۔"

"رہٹ پر ملنے کا وعدہ تھا۔ میں سیدھا اسی جگہ پہنچ گیا تھا۔"

"پہلے ہم بھی رہٹ پر گئے تھے۔ پھر ہم کھیتوں میں چلے گئے۔"

"کیوں؟"

"ہم نے سوچا کہ کہیں رہٹ پر ہمیں کوئی ساتھ ساتھ دیکھ نہ لے۔"

"یہ اچھی حرکت کی تم نے ۔ اس قسم کی حرکتیں کرو گے تو خود پھنسو گے اور ہمیں بھی پھنساؤ گے۔ اگر مجھے کوئی اس جگہ دیکھ لیتا تو؟"

سولا بولا۔ "اچھا جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اپنی جگہ سے تمہیں دیکھنے کی کوشش کرتے لیکن آندھی کی وجہ سے تم دکھائی نہیں دیے۔ بھئی! آگے کو خیال رکھیں گے۔ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔"

اس پر کھیدا خوش ہو گیا۔ بولا:

"دیکھو ہم آکر پہلے اسی جگہ رکیں گے۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو تو ہمیں خبر کر دینا۔"

"اچھی بات۔"

"سولا! تمہارا گھر تو بالکل سامنے پڑتا ہے۔"

"تو پھر ذرا نظر رکھنا تاکہ جب ہم یہاں پہنچیں تو تم میں سے ایک شخص ہمیں آن ملے۔ سمجھے۔"

"لیکن آندھی بڑھتی جا رہی ہے۔ نہ جانے کب تک اس کا زور رہے......
تھوڑی دیر میں ہاتھ کو ہاتھ تک سجھائی نہیں دے گا۔ تم لوگ اتنی دور سے کیسے دکھائی

دے سکتے ہو۔"

کپورے نے قدرے تامل کیا پھر بولا۔" یہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن اب کریں کیا؟"

" تم یہ بتاؤ کہ سب کو لے کر کب تک لوٹو گے؟"

کپورے نے قدرے غور کرنے کے بعد جواب دیا۔" بھئی پٹیالے اور جیند تک سے جوان آرہے ہیں۔ اگر سب پہنچ گئے تو ہم ایک گھنٹہ تک لوٹ آئیں گے۔"

"اچھی بات۔"

"اور کیا اب رات بھیگنے کا انتظار تو کریں گے نہیں ہم۔ آندھی سے تو اس قدر اندھیرا چھا جائے گا کہ بس طبیعت خوش ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے۔"

"تو بھئی اب میں چلا۔"

یہ کہہ کر کپورے نے گھوڑے کو ایڑ دی اور بگولے کی سی تیزی کے ساتھ دم بدم دھندلاتی ہوئی جھاڑیوں میں گم ہو گیا۔

4

ایک گھنٹہ گزرنے بھی نہ پایا تھا کہ پہر کے ڈھلنے پر ایسی گہری تاریکی چھا گئی کہ پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔

کپورا اور اس کے ساتھی گھوڑوں اور سانڈنیوں پر سوار اندھا دھند چلے آرہے تھے تیز و تند ہوا گویا ان کے کپڑے نوچ کر ان کے بدن سے الگ پھینک دینا چاہتی تھی۔ ان کی داڑھیاں اور مونچھیں گرد سے اَٹ گئی تھیں۔۔۔ آنکھوں کی پلکیں ایک دوسری میں پیوست ہوئی جا رہی تھیں۔ اگر کپورا ان کی رہ نمائی نہ کرتا تو کبھی راستہ تلاش نہ کر پاتے۔

ان میں ہندو مسلمان اور سکھ سبھی شامل تھے۔ ان کے پاس دو کچی رائفلیں

تھیں۔ جن کی نالیوں کے دہانے انہوں نے کپڑوں کی ڈاٹوں سے بند کر رکھے تھے تاکہ گرد اندر نہ جانے پائے۔ لاری کے اسٹیرنگ کی نالی والی ایک بندوق بھی تھی۔ ان کے علاوہ وہ کرپانوں، چھویوں، لاٹھیوں اور صفا جنگوں سے مسلح تھے۔

اس وقت دور سے پیر کا مٹھہ مرے ہوئے بھیلسے کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔

گاؤں سے ہٹ کر سنت وتار سنگھ جی کی ٹوٹی ہوئی سادھ کی اونچی دیواریں الگ تھلگ کھڑے ہوئے دیو کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ بوسیدہ دیوار کے قریب سڑے ہوئے پانی کی ایک کھائی تھی جس کی سطح پر سبز رنگ کی کائی جمی رہی تھی۔ اور دیوار کی دراڑوں سے جنگلی بیلیں لٹک آئی تھیں اور ان کی پتیاں پانی کی سطح کو چوما کرتی تھیں۔

مولا نے سداگر کو حسب وعدہ موقع پر بھیج دیا تھا۔ سداگر ریت کے ایک ٹیلے کی اوٹ میں سر اور کانوں کو دھسّے میں لپیٹے بیٹھا تھا۔ دیکھنے کے لیے اس نے آنکھوں کے آگے ایک چھوٹا سا سوراخ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ بھلا ایسی تاریکی میں کیا دکھائی دے سکتا تھا۔ نظر نے تو کچھ کام نہیں کیا۔ البتہ کانوں میں گھوڑوں کے سموں کی ٹپاٹپ اور سانڈھنیوں کے بلبلانے کی آوازیں آئیں تو اس نے چوکنا ہو کر گردن اٹھائی لیکن ڈاکو چشم زدن میں اس کے سر پر تھے۔ اس تاریکی میں چھویوں کی دھیمی دھیمی چمک اور بھی زیادہ خوف ناک دکھائی دے رہی تھی۔

آندھی کے شور میں آواز گونجی:

''کون؟''

''سداگر'' سداگرے نے جلدی سے جواب دیا۔ مبادا جواب دینے میں تاخیر ہو اور اس کا سر چھوی کے ایک ہی وار سے کٹ کر الگ جا گرے۔

''سداگر کون؟''

اب سداگر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ چلّا کر بولا۔'' اوئے میں...... میں سداگر ٹھٹھے والا کپورا کتھے اے؟''

عین وقت پر کپورے کی گھوڑی مچل کر آگے بڑھی۔ ''سداگر''

''ہاؤ کپوریا''

''اوئے اپنا ہی منڈا اے۔'' کپورے نے ساتھیوں سے کہا۔ پھر سداگر سے مخاطب ہو کر پوچھا:

''مولا بھی ہے؟''

''نہیں— وہ گھر پر ہے۔''

''باکی سب ٹھیک ہے۔''

''سب ٹھیک ٹھاک ہے۔''

اس اثنا میں گرد آلود ہوا فرّاٹے بھرتی رہی۔ گھوڑے اور سانڈھنیاں بے چینی سے رقصاں تھیں۔

نو وارد ڈاکوؤں نے چند ے آپس میں تبادلۂ خیالات کیا اور پھر کپور سداگر سے بولا۔

''سداگر بیٹے! اب ہمیں رہٹ کی طرف لے چلو۔''

سداگر کچھ کہے بغیر اٹھا اور رہٹ کی جانب روانہ ہوگیا۔ وہ سب اس کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔

کپورے نے رہٹ کے قریب پہنچ کر دریافت کیا۔ ''سداگر! طویلہ تو کھالی ہے نا۔

''ہاؤ۔ بالکل کھالی ہے۔''

''ایسا نہ ہو کہ کوئی باہر کا آدمی گھسا ہو۔''

''ارے نہیں۔''

رہٹ پر پہنچ کر وہ گھوڑوں اور سانڈھنیوں سے نیچے اترے۔ جانوروں کو طویلے میں بند کر کے سداگر کو رکھوالی کے لیے مقرر کیا اور خود سارے سامان سمیت گاؤں کی طرف بڑھے۔

مولا کے مکان کا دروازہ نیم وا تھا۔ اس نے دروازے میں اینٹیں پھنسا کر تختوں

کو ایک جگہ جما دیا تھا۔ اور وہ خود لبھو کے ساتھ بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ میلا سنگھ الگ بیٹھا داڑھی کرید رہا تھا۔

انہوں نے دروازے میں سے ڈاکوؤں کو پہچان لیا۔ جب وہ قریب آ گئے تو انہوں نے دیکھا کہ ان میں سب کے سب بڑے مضبوط اور تر چھے تلنگے آدمی شامل تھے۔

مولا تہمد جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "ساب سلامت!"

"ساب سلامت اے جی۔" دبی دبی ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔

مولا بڑھ کر دہلیز تک گیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے دروازے کے آگے بھانت بھانت کی صورتیں کھڑی ہیں۔ انہوں نے پگڑیوں کے شملے گھما کر چہرے ڈھانپ رکھے تھے۔ سوائے آنکھوں کے ان کے چہرے کا اور کوئی حصہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بدن سے وہ ننگے تھے ان کے جسم سرسوں کے تیل کی وجہ سے نہ صرف چمک رہے تھے بلکہ تیل کی ہلکی ہلکی بو بھی پھیل رہی تھی۔

مولا نے لمبی مونچھوں پر چار انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"آج تاں اللہ دا بڑا پھل ہے جی۔"

"ہاں۔"

مولا نے کپورے کی ننگی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "اچھا! پانی کانجی پی لو ستارے۔"

کپورے نے جٹا جھاڑ ناریل کے مانند اپنے سر کو انکار کے طور پر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھو! بکت گھٹ اے۔ پانی کانجی کی بات چھڈ۔"

مولا نے ادھر ادھر دیکھا۔

"یارو! سواری بنا آ گئے او۔"

"نہیں گھوڑے ڈاچیاں طبیلے میں چھوڑ آئے ہیں۔"

"پر بھا! گھوڑے کچھ جھیک رکھو۔ بھاگتے وقت جرورت پڑے گی...... اور پھر

کپوریا! تمہیں کسی نے پہچان لیا تو آہمت آ جائے گی۔ تو اپنی گھوڑی جھینک رکھنا.....“
کپورے کو مولا کی بات پسند آئی۔ اس نے جھک کر ایک ساتھی کے کان میں کچھ کہا اور وہ۔ ”ہاؤ“ کہہ کر طویلے کی جانب روانہ ہوگیا۔
کپورے نے مولا سے کہا۔
”مولیا! اب دیر مت کرو۔ بس چلو۔ ایسا موقع پھر کبھی ہاتھ نہیں آئے گا۔“
”بوت بچھا۔“
مولا نے پھونک مار کر دیا بجھایا تو اس کی لمبی لمبی مونچھیں پھڑکیں۔
اب وہ ایک لمبی قطار کی صورت میں ایک دوسرے کے ساتھ لگے لگے بڑھنے لگے۔
گوبر کے ڈھیروں جوہڑ اور اروڑیوں کے قریب سے ہوتے ہوئے وہ گلی میں گھس گئے۔
آندھی کی وجہ سے بے پناہ شور پیدا ہو رہا تھا۔ ایسے موقع پر کتے بھی کھوروں میں دُبکے ہوئے تھے۔ ایک آدھ نے دبی سی بھوں کی آواز نکالی بھی تو وہ آندھی کے شور میں دب کر رہ گئی—
ان کی رائفلیں بھری ہوئی تھیں۔ ان سب کے ہتھیار بالکل تیار تھے۔ ہر اہم موڑ پر کپورا ایک آدمی کھڑا کر دیتا۔
مولا کی ابھی تک بگا سنگھ سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ بگا کم گو انسان تھا۔ مولا اس حقیقت سے واقف تھا۔ اس لیے اس نے بھی کوئی بات نہیں کی۔ وہ تیلے کے دوش بدوش چلا جارہا تھا۔ بگا تاڑ کی طرح لمبا تھا۔ اس کی آنکھیں اندر کی جانب دھنسی ہوئی تھیں، لیکن ان میں وحشی جانور کی آنکھوں کی سی چمک اور تجسس تھا۔ وہی ان سب کا سوار تھا۔
ڈاکو طویل کن کھجورے کی طرح دیواروں سے لگے لگے بڑھ رہے تھے۔
تیلے نے مولا سے دریافت کیا۔
”مکان ہے کہاں؟“
”گاؤں کے پچھواڑے“

یہ سن کر تلے کے ابرو پر بل پڑ گیا۔ تگو نے دبی آواز میں کہا۔

"اگر لوگ باگ جاگ پڑے تو اس تاریکی اور آندھی میں گاؤں سے باہر نکلنے کے لیے بہت احتیاط اور ہوشیاری کی ضرورت ہے۔"

مولا نے قدرے بے پروائی سے کہا۔

"اوئے بھا! تم لوگوں کے سامنے کون ٹکا رہ سکے گا — چاہے سو آدمیوں سے مقابلہ کیوں نہ ہو جائے۔"

تلے پر مولا کی اس بڑ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ گاؤں والوں کا بخوبی مقابلہ کر سکتے ہیں لیکن وہ ایک گرگ جہاں دیدہ تھا۔ اس وقت سوال مقابلہ کر سکنے یا نہ کر سکنے کا نہیں تھا۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ تھا کہ گروہ کا ہر آدمی بچ کر نکلنا چاہیے ورنہ ایک آدھ بھی پولس کے ہتھے چڑھ گیا تو سارے گروہ کی آفت آجائے گی۔ اس قدر آندھی، تاریکی اور شور میں یہ سارا کام بخیر و خوبی انجام پاجانا اس قدر آسان نہیں تھا جتنا کہ مولا کو محسوس ہوتا تھا۔

معاً بگوا ایک دم رک گیا اور اس کے پیچھے سب کے سب ڈاکو رک گئے۔

تاریکی میں سامنے سے انہیں ایک تاریک تر سایہ دکھائی دیا — معلوم ہوتا تھا کہ کوئی آدمی جلد جلد قدم اٹھاتا بڑھا چلا آرہا ہے۔

وہ سب چشم زدن میں دیوار کے ساتھ لگ کے کھڑے ہو گئے۔

وہ آدمی بدن پر کالی چادر لپیٹے تیزی سے بڑھتا آرہا تھا۔ لحہ بہ لحہ وہ ان کے قریب پہنچ رہا تھا۔

ڈاکو دم سادھے کھڑے تھے۔ اتفاق سے اس دیوار پر ایک چھجا بڑھا ہوا تھا۔ اس لیے وہ مکمل تاریکی میں کھڑے تھے۔

یوں سچ سے قریب کھڑا ہوا آدمی بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہ تو محض بگو کی متجسس آنکھوں نے ہی اجنبی کو آتے دیکھ پایا تھا۔

چند لمحوں بعد وہ اجنبی ان کے قریب سے گزرنے لگا۔ اس غریب کو اس امر کا مطلق احساس نہیں تھا کہ وہ ہتھیار بند ڈاکوؤں کی چھویوں کے سائے تلے سے گزر رہا ہے۔ اگر کہیں اس کے منہ سے چوں کی آواز نکل جاتی تو اس کا سرتن سے جدا ہوتا۔

ڈاکوؤں پر موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ وہ اس تنخی سے آدمی کے سائے کو اپنے قریب سے گزرتے دیکھ رہے تھے۔ خدا خدا کر کے وہ ان کی قطاروں سے آگے بڑھ گیا۔ اس کے جانے کے بعد سب نے اطمینان کی سانس لی۔ کیوں کہ وہ اس وقت خون خرابہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اگر کہیں اس کی بہت تیز چیخ نکل جاتی اور اس چیخ کو سن کر گاؤں میں شور مچ جاتا تو انہیں خالی ہاتھ واپس بھاگنا پڑتا۔

گاؤں کے اندر والے چوراہے پر پہنچے تو دیکھا کہ اونچے چبوترے والے بڑے کنوئیں کی منڈیر پر پانی نکالنے کی اونچی اونچی چرکھڑیاں سر جھکائے غم ناک انداز میں کھڑی ہیں اور ان چرکھڑیوں کے قدموں میں ناہموار پیڑوں کے لوہے کے ڈول ہوا کے زور سے ہل ہل کر ڈانگا ڈنگ کا شور بلند کر رہے ہیں۔ اور چبوترے کے قریب کھڑے مسوڑیوں کے پیڑ گویا انہیں خشمگیں نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

وہ سب فوراً پیڑوں کے جھنڈ تلے چلے گئے۔ تاکہ آپس میں مشورہ کرلیں۔

کپورے نے چھو چھو کر سب کی تعداد معلوم کی۔ مطمئن ہو کر اس نے کہا۔

"اس جگہ کم سے کم تین جوان کھڑے رہنے چاہئیں۔"

"وہ کیوں؟" ان میں سے ایک نے جو لدھیانہ کے علاقے کا ذرا تیز چلت جوان تھا، اعتراض کیا۔

کپورے کو اس کا یہ اعتراض پسند نہیں آیا۔ اس نے ابرو پر گہرے بل ڈال کر اس کی جانب دیکھا اور پھر گہری سانس لے کر اس نے اپنے غصے کو دبایا اور اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرنے لگا۔

"اس جگہ سے صرف ایک تنگ گلی آگے کو جاتی ہے جو مکانوں کے اندر ہی ختم

ہو جاتی ہے۔ ہمارے بھاگ نکلنے کا صرف یہی ایک راستہ ہے۔"

"اوئے آپانوں پڑا نہیں اے۔ آپاں نال کون مکابلہ کر سکتا ہے۔" نوجوان نے بازو ہوا میں لہرا کر بے پروائی سے بلند آواز میں کہا۔

اب تو کپورے کا جی چاہا کہ اس کی گردن مروڑ کر رکھ دے۔ اس کے یہ تیور دیکھ کر نوجوان بھی بھرنے لگا۔ نوجوان مضبوط اور جوشیلا ہی سہی، لیکن کپورے کے مقابلے میں کھڑا ہونا تو سراسر حماقت تھی اس کی۔

شاید ان کے دو دو ہاتھ ہو جاتے۔ لیکن جگے نے نوجوان کو آنکھ دکھائی تو وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ پھر بگا کپورے سے مخاطب ہو کر بولا:

"ہاں تو کیا کہہ رہے تھے تم؟"

"ادھر جو تنگ گلی تم دیکھ رہے ہو، اسی کے اندر ہمیں جانا ہے۔ وہ مکانات جن پر ہماری نظر ہے قلعے کے مانند ہیں۔ ہر آفت سے بچے ہوئے ہیں۔ اوّل تو وہاں پہنچنے کا کسی ڈاکو کو حوصلہ ہی نہیں ہوا۔ ہماری یہ پہلی کوشش ہے۔ اگر ہم وہیں کہیں گھر گئے تو عجب مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہماری خیریت اسی میں ہے کہ ہم یہاں سے سب کے سب صحیح سلامت نکل جائیں...... صرف یہی ایک کھلی جگہ ہے۔ خطرے کے موقع پر ہمارا ایک آدمی فوراً گلی کے اندر آ کر ہمیں خبر کر سکتا ہے۔ ہماری یہ کوشش ہونی چاہئے کہ اوّل تو ہمیں مقابلہ کرنا ہی نہ پڑے لیکن ایسا ہو بھی تو یہاں کھلی جگہ میں ہو۔"

جگے نے اثبات میں سر ہلایا۔

کپورے نے پھر کہنا شروع کیا۔" یہ آندھی ہماری مدد بھی کر سکتی ہے اور ہمارا نقصان بھی کر سکتی ہے۔" اگر کوئی گڑبڑ ہوگئی تو اس ہلّو بازی، آندھی اور اندھیرے میں ہم اپنے ساتھیوں کی گنتی بھی نہ کر پائیں گے۔"

بگا کو حرف بہ حرف اس سے اتفاق تھا۔

چناں چہ تین آدمی وہاں پر چھوڑ کر وہ لوگ آگے بڑھے۔

تنگ گلی میں پہنچ کر انہیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ قبر میں ہوں۔ آندھی اور ہوا کا زور کم تھا۔ البتہ قیامت کا شور کانوں کے پردے پھاڑے ڈالتا تھا۔

دفعتاً بگا ایک دم رک گیا۔ اس کے ساتھ ہی سب کے قدم رک گئے اور وہ اپنی تھوتھنیاں اس کے قریب لے آئے تاکہ اس کی بات سن سکیں۔

چگے نے سانسی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''بانس نہیں لائے؟''

''او، وہ تو بھول گئے۔''

''واہ اوئے بھو...... تو کیا اب...... کے سہارے چڑھو گے چھت پر......''

''بانس کون دور ہے۔ مولا کے گھر ہی سے تو لانا ہے۔ میلو جار تو بھاگ کے جا اور مولو کی ڈیوڑھی کے اندر صحن کے کونے میں ایک لمبا بانس دھرا ہوگا...... بس اٹھا کے پھورن واپس آنا......''

میلو نے تھوتھنی گھمائی اور ناک کی سیدھ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا جاتا۔

وہ سب آگے بڑھے۔ کچھ دور جا کر گلی بائیں ہاتھ کو گھوم گئی تھی۔ موڑ سے چند قدم آگے داہنے ہاتھ کو ایک ادھورا مکان تھا۔ جس کی بنیادیں بھرنے کے بعد نہ جانے اسے کیوں چھوڑ دیا گیا تھا۔ اب وہاں بڑے بڑے خشک جھاڑ، اور چھٹی (کپاس کی چھڑیاں) کے انبار اگلے مکان کی دیوار کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ جب کسی کتیا کو بچے جننے ہوتے تو وہ چیختی کراہتی یہیں آن کر پناہ لیتی۔ ایک کونے میں بجز بھوسے کا چولہا تھا جس میں اس وقت ریت بھری تھی۔

وہاں رک کر انہوں نے اس مکان کے پچھواڑے کا جائزہ لیا جس کے اندر انہیں سب سے پہلے داخل ہونا تھا۔

چھت سے پرے بجلی چمک چمک کر آنکھیں دکھا رہی تھی۔ گھنگھور گھٹائیں سیاہ دامن لہراتی بے پناہ دل کی طرح آسمان کی وسعتوں میں پھیلنے لگیں۔ آندھی کے زور میں

کمی تو نہ آئی تھی۔ البتہ ہوا میں ہلکی سی گرد باقی نہ رہی تھی۔

کپورے کے اشارے پر وہ پھر رک گئے۔ ان کی داڑھیاں پھر ایک دوسرے کے قریب آئیں۔ اس نے کہا۔

"سب لوگ یہیں پر رکیں۔ میں بگے کو لے کر مکانوں کو اگلی طرف سے دیکھ لوں جرا۔"

وہ دونوں چند ہی قدم پر پہنچ کر ان سب کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

سانسی نے مکان کی جانب دیکھا اور پھر دل ہی دل میں اندازہ لگانے لگا کہ اس پر بانس کی مدد سے چڑھنا ممکن بھی ہے یا نہیں۔ ان میں سے ایک بولا:

"دیکھو! مکان جرا اونچا مالم ہوتا ہے۔"

"ہاں — ہے تو۔"

"اگر تم بانس کے زور سے چھلانگ کر اس پر نہ چڑھ سکے تو اِدھر اُدھر سے اوپر جانے کا کوئی راستہ یا سہارا بھی دکھائی نہیں دیتا...... پھر تو آگے والے دروازے سے جانا پڑے گا۔"

سانسی چپ چاپ دانتوں تلے مونچھ کا ایک سرا چباتا رہا۔ پھر یوں بولا۔ جیسے اپنے آپ ہی کو مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔

"میں آگے بڑھ کر دیوار کے پیچھے سے ٹھیک اندازہ لگا سکتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور دیوار کے قریب پہنچ کر مٹی کے ایک انبار کے عقب میں گم ہو گیا۔ تاریکی کی وجہ سے اندازہ لگانا مشکل سا ہو رہا تھا۔

چند منٹ بعد بگا اور کپورا بھی واپس آ گئے۔ بگا بولا۔

"پہلے تو کپورے کی بہن پر ہاتھ صاف کرنا ہوگا۔ اس کے بعد پڑوس کے چند گھر بھی اچھے ہیں ان پر بھی جلدی سے ہاتھ پھیر دیا جائے...... اپنا سانسی یار کدھر گیا۔"

"وہ دیوار کی طرف گیا ہے آتا ہی ہوگا۔ اندھیرے میں اسے بھی کچھ سوجھ نہیں رہا۔"

چند ثانیوں کے بعد سائیں آ گیا—

اسے دیکھتے ہی تَلّے نے کہا۔

"مکان تو اونچا ہے بھو۔"

"ہاں بھا!" سائیں نے پھر ایک مکان کی جانب نظر ڈالی اور پھر قدرے بے چینی سے ہاتھ ملنے لگا۔ شاید اس کے ہاتھ بانس پکڑنے کے لیے بے قرار ہو رہے تھے۔

"پھر؟" تَلّے نے سوال کیا۔

سائیں نے اس کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔

"کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟"

تَلّے کو اس کے جواب سے اطمینان نہیں ہوا۔ لیکن سردست اس کے سوا اور کوئی چارہ کار بھی تو نہ تھا۔

اتنے میں میلو ہاتھ میں لمبا بانس لیے یوں وارد ہوا جیسے بڑے موذی جانور کو کندھے پر لادے لا رہا ہو۔

سائیں نے بڑھ کر بانس تھام لیا۔ پہلے اسے لچکا لچکا کر اس کی مضبوطی کا جائزہ لیا۔ اور راستہ ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھا اور پھر اس نے مکان کی چھت کی جانب نظر دوڑائی۔ مٹیالے آسمان پر کالے بادل گدلے دھبوں کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔

اب سائیں نے اپنے کمر کے گرد لمبا رسا لپیٹا اور زمین پر ہاتھ مار کر دو ڈھیلے کمر بند میں ٹھونس لیے اور سر گھما کر دھیمی آواز میں ساتھیوں سے کہا۔

"اچھا، اب میں کوشش کرتا ہوں— چھت پر صحیح سلامت پہنچ گیا تو یہ دو ڈھیلے تمہاری طرف پھینکوں گا۔"

بعد ازاں اس نے لمبے بانس کو سنبھالا اسے دونوں ہاتھوں میں تولا اور پھر دو چار بار پاؤں کے پنجوں پر ناچ کر تیزی سے بھاگ نکلا......

......معاً اس کے قدموں کی آواز بند ہو گئی۔

سب نے اسے پر پھڑپھڑاتے ہوئے بڑے چمگادڑ کی طرح ہوا میں اٹھتے دیکھا۔ قیاس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ چھت پر پہنچ گیا ہے۔

اگر بجلی چمک جاتی تو وہ اسے دیکھ ہی لیتے۔ ورنہ..... تڑاخ سے دو ڈھیلے ان کے قریب گرے۔ ایک تو میلو کی ٹانگ پر لگا۔

"اوئے میاں دیا!" وہ ٹانگ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ لیکن چوٹ بالکل معمولی تھی۔ ڈھیلا کچی مٹی کا تھا۔

اب تگّے نے چند آخری ہدایات دیتے ہوئے کہا۔

"دیکھو! اب ہمیں یہ سارا کام جلد سے جلد ختم کرنا ہے۔ اس گاؤں میں چند اچھے لڑاکا جوان رہتے ہیں جو جان کی بازی لگا سکتے ہیں۔ اس لیے ہمیں چپ چاپ اور پھرتی سے اپنا الّو سیدھا کر کے نو اور دو گیارہ ہو جانا ہے۔ سمجھے؟"

"ہاں بھئی" سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا۔

کپورے نے میلو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دھیمی آواز میں ہدایت دی کہ وہ سب جوانوں کو لے کے مکان کے دروازے پر پہنچ جائے۔

وہ لوگ اُدھر چلے گئے تو کپورا تگّے کو ساتھ لے کر پچھواڑے والی دیوار کے قریب پہنچا۔ ابھی ان کے قدم رکنے بھی نہ پائے تھے کہ چھت پر سے رسّہ لمبے ناگ کی طرح پھنپھناتا اور لہراتا ہوا نیچے گر کر جھولنے لگا۔

باری باری دونوں رسّے کی مدد سے چھت پر پہنچ گئے۔

چھت کی منڈیر بہ مشکل چار چھ انگل اونچی ہوگی۔ تیز و تند آندھی کے زور میں انہیں یوں محسوس ہوا جیسے ان کے پاؤں اکھڑ جائیں گے اور وہ چشم زدن میں اڑ کر گاؤں کے باہر جا گریں گے۔ اس لیے وہ جھکے صحن سے آنے والی سیڑھی پر بنی ہوئی مٹی کی جانب بڑھے۔ یہ اور خوشی کی بات تھی کہ مٹی کا دروازہ ابھی کھلا تھا۔ ورنہ انہیں کود پھاند کر نیچے جانا پڑتا۔ اس لیے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ گھر کے لوگ ابھی سوئے نہیں تھے۔

حقیقت یہ تھی کہ ابھی سونے کا کوئی وقت بھی نہیں تھا۔

کپورے کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ ٹگو کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی چھوی اور سانپی حسب معمول لمبا سا چھرا تھامے تھا۔

انہوں نے ایک بار پھر اپنے اپنے چہروں کو پگڑیوں کے شملوں میں چھپایا۔ صرف آنکھوں اور ابروؤں کو ننگا چھوڑ دیا اور پھر پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے سیڑھیاں اترنے لگے۔

وہ کافی نیچے جا چکے تھے کہ دفعتاً موڑ سے ٹمٹماتی ہوئی روشنی دکھائی دی۔ وہ فوراً سمجھ گئے کہ کوئی شخص ہاتھ میں لال ٹین یا چراغ لیے سیڑھیوں پر چڑھتا چلا آرہا ہے۔۔۔۔ وہ ٹھٹھک کر رک گئے۔ روشنی پھیلتی جارہی تھی۔

ابھی وہ کچھ طے بھی نہ کرپائے تھے کہ چراغ کے پیچھے دو زنانہ پاؤں دکھائی دیے اور ان کی آنکھیں ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکی کی آنکھوں سے ملیں جو چراغ کو اپنے دونوں ہاتھوں کے حلقے میں لیے ہوئے تھی تاکہ وہ بجھ نہ جائے۔

انہیں دیکھتے ہی لڑکی کا رنگ فق ہوگیا۔ اس نے یہ بڑی زبان باہر نکال کر حلق سے ایک دلدوز چیخ نکالنے کی کوشش کی، لیکن مارے خوف کے اس کی قوت گویائی سلب ہوگئی۔ مٹی کا چراغ اس کے ہاتھ سے گر کر لوٹ گیا۔

ٹگے نے پھرتی سے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ وہ بے ہوش ہوگئی۔ انہوں نے اس کے منہ میں اسی کی چندری ٹھونس ٹھانس کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر وہیں کونے میں ڈال دیا۔

صحن میں پہنچے تو دیکھا ایک جانب ڈیوڑھی ہے اور دوسری جانب مکان کا پہلو ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ جس دروازے سے نکل کر لڑکی آئی تھی، اس کا کنڈا اس نے باہر سے چڑھا دیا تھا تاکہ ہوا کی تیزی کے باعث دروازے نہ کھولے۔ اندر روشنی ہورہی تھی اور اندر گھر والوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

بگا اور سانسی دروازے کے دونوں جانب اپنے اپنے ہتھیار سنبھال کر کھڑے ہوگئے۔ اور کپورا باقی ساتھیوں کے لیے گلی کا دروازہ کھولنے کو ڈیوڑھی کی جانب بڑھا۔ ڈیوڑھی میں مویشی بندھے تھے۔ ایک بیل تو اسے اتنا پسند آیا کہ بے اختیار جی چاہا کہ اسے بھی وہ اپنے ہمراہ لیتا جائے۔ لیکن اس رات یہ قطعاً ممکن نہیں تھا۔

ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر اس نے گلی میں جھانکا تو کچھ نظر نہ آیا۔ چناں چہ اس نے بیل ہانکنے کے انداز میں ٹو ٹو کر کے دو تین آوازیں نکالیں تو متعدد سائے اس کی جانب بڑھے۔ جیسے کالی دیواروں نے انہیں جنم دے دیا ہو۔

کپورے نے ایک جوان کو بندوق سمیت گھر کے پچھواڑے منجھی کے انباروں کے پاس کھڑے رہنے کے لیے بھیج دیا اور باقی لوگوں کو اندر لے آیا۔

دو گھڑی بعد وہ سب لوگ دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔

بگو نے چھوی بڑھائی اور دروازے کے کنڈے میں اڑس کر ٹہوکا جو دیا تو کنڈا بڑی آواز کھل کر گرا اور تڑاتڑ بجنے لگا۔۔۔ دروازے کے دونوں تختے زور زور سے پنکھا جھلنے لگے۔ گھر کے لوگ سمجھے کہ لڑکی مٹی کا دروازہ بند کر کے لوٹی ہے۔ وہ کچھ دیر تک اس کے اندر آنے کا انتظار کرتے رہے۔ لیکن جب کوئی صورت دکھائی نہیں دی تو ایک مرد جلدی سے باہر نکل آیا۔ پہلے وہ دروازے کے دونوں جانب کھڑے ہوئے بگو اور سانسی کو نہیں دیکھ پایا۔۔۔ جب اس نے لڑکی کو صحن میں نہ پا کر گردن گھمائی تو بگو اور سانسی کی صورتیں دکھائی دیں۔ اس نے گھبرا کر پوچھا:

''آپ کون ہیں؟''

اسی اثنا میں باقی آدمی بھی ڈیوڑھی میں گھس آئے اور دروازے میں سے ان کی خبیث صورتیں دکھائی دینے لگیں۔ وہ دونوں چپ چاپ کھڑے رہے۔ پیچھے سے کپورے نے اس کی گدی پر الٹے ہاتھ کا ایسا دھپ دیا کہ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔

یہ سب کچھ چند ثانیوں میں ہوگیا۔ وہ سب فوراً مکان کے اندر داخل ہوگئے۔

لالٹین کی روشنی میں ان کے ہتھیار جگمگا اٹھے۔ جان کے خوف سے گھر کے کسی فرد نے شور نہیں مچایا۔ اس کا بھی وہی علاج کیا گیا جو پہلی لڑکی کا کیا گیا تھا۔

کپورا ذرا چھپا چھپا ہی رہا تاکہ اسے کوئی پہچان نہ لے۔ بگّے کو اندر والے کمروں میں لے گیا اور ان کی طرف اشارہ کیا۔ دم کے دم سب کچھ سمیٹ لیا گیا۔ پھر وہ سب صحن میں آ گئے — بگّو نے ایک نظر میں ساتھیوں کی تعداد جانچ لی اور پھر وہ دو حصوں میں بٹ کر پڑوس کے مکانوں کی جانب بڑھے۔ جن کے صحن ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔

اتنے میں باہر سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی ان کے قدم رک گئے۔ پھر دھڑا دھڑ گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس کے ساتھ آندھی کے شور میں مردوں کے للکارنے کی صدائیں بلند ہوئیں۔

موقع کی نزاکت سمجھتے ہوئے وہ باہر کی جانب بھاگے۔

جس نوخیز نشانہ باز جوان کی کپورے نے بندوق سمیت مکان کے پچھواڑے ڈیوٹی لگائی تھی اس نے ہڑبڑاہٹ میں یہ گولیاں چلا دی تھیں۔ ہوا یہ کہ آندھی کے زور سے ٹہنی اور جھاڑ کے انبار حرکت میں آ گئے اور لڑھکتے ہوئے اس کی جانب بڑھے اور اس نے گھبراہٹ میں نہ جانے کیا سمجھ کر پے در پے تین گولیاں چلائیں۔

اسی اثنا میں گاؤں کے مختلف حصوں سے خطرے کی صدائیں بلند ہوئیں۔ چر کھڑیوں والے کنویں کی جانب سے ایلی ایلی کی آوازیں آنے لگیں۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ان کے ساتھی انہیں خطرے سے آگاہ کر رہے ہیں۔

اب انہوں نے میلو کو آگے لگایا اور سرپٹ بھاگے۔

چرکھڑیوں والے کنویں تک پہنچے تو وہاں اندھا دھند لاٹھیاں چل رہی تھیں۔ گاؤں کے من چلے بھی جلدی میں جیسا ہتھیار ملا، لے کر مقابلے پر آن ڈٹے تھے۔ لیکن تاریکی اور آندھی نے انہیں کچھ کرنے نہ دیا۔

اُدھر ہتّو کے سدھائے ہوئے ساتھی گاؤں والوں کے کندھوں سے کندھے بھڑاتے ہوئے نہایت صفائی سے ادھر اُدھر منتشر ہو کر صحیح سلامت گاؤں سے نکل گئے۔

اتنے میں کپورے کو اپنی کالی گھوڑی دکھائی دی۔ وہ فوراً پھلانگ کر اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔

اس کا خیال تھا کہ جب وہ اپنی منہ زور گھوڑی کو ایڑ دے گا تو وہ گاؤں کے ہجوم کو کائی کی طرح چیرتی ہوئی نکل جائے گی۔ لیکن عین اس وقت بجلی چمکی تو گاؤں والوں میں سے بعض نے اسے پہچان لیا اور آندھی کے بھیانک شور میں "کالا تیتر۔ کالا تیتر" کی وحشیانہ آوازیں گھل مل گئیں۔

ایڑ دیئے جانے پر گھوڑی سمٹ کر جو اچھلی تو گاؤں کے منچلے جوان نے اس کی لگام پر جھپٹا مارا۔ اس پر گھوڑی ہنہنا کر پچھلے پاؤں پر کھڑی ہو گئی۔ اس کی انگھڑیاں پھٹ گئیں۔ کان پھڑ پھڑائے۔ اور ایال لہرائی۔ سوار نے ہونٹ کاٹ کر اپنے لمبے دستے والی کلہاڑی اوپر اٹھائی۔ لیکن گھوڑی کے اگلے پاؤں زمین پر لگنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک چھوری چمکی اور کپورے کے پیٹ کی آنتیں ادھیڑتی ہوئی انہیں پیٹ سے باہر لے آئی۔

وہ بڑے نگر مچھ کی طرح بل کھا کر اوندھے منہ زمین پر گرا۔ پیٹ سے خون کا فوارہ چھوٹا اور لمحہ بھر میں زمین اس کے گاڑھے خون سے سرخ ہو گئی۔

پھر بارش کی موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔

یہ افسانہ 'نقوش لاہور' افسانہ نمبر جنوری 1954 میں پہلی بار شائع ہوا۔ کسی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ "بلونت سنگھ کے بہترین افسانے" مرتبہ گوپی چند نارنگ ناشر ساہتیہ اکادمی دلی میں پہلی بار نارنگ صاحب نے شامل کیا ہے۔

نوٹ: اس کہانی کا پس منظر وہ متحدہ سالم پنجاب ہے جس میں ہندو، مسلم اور سکھ ڈاکو مل جل کر اپنے بھائی بندوں کے مکانوں میں نقب لگایا کرتے تھے۔

آبشار

اگر کبھی دہرہ دون جانے کا اتفاق ہو تو آپ کا میزبان آپ کو سنسل دھارا نامی مقام دیکھنے کی دعوت ضرور دے گا...... اور آپ انکار ہرگز نہ کیجئے گا۔

سنا ہے کہ اب وہاں بسیں جانے لگی تھیں لیکن پہلے دہرہ دون سے راج پور قصبے تک کوئی آٹھ میل کا سفر لاری میں طے کرنا پڑتا تھا اور سنسل دھارا تک پہنچنے کے لیے راج پور سے بھی آگے چند پہاڑیوں کے نشیب و فراز سے گزرنا پڑتا تھا۔

منزل کے آخری حصے میں چند جھونپڑیوں پر مشتمل ایک چھوٹا سا گاؤں واقع ہے۔ دائیں بائیں اونچی اونچی پہاڑیاں ہیں۔ ان کے بیچوں بیچ ایک ندی بہتی ہے۔ ندی کے کنارے کنارے آگے بڑھیئے تو گاؤں سے ڈیڑھ دو فرلانگ پرے وہ مقام ہے جسے سنسل دھارا کہتے ہیں۔

ندی کے کنارے پر ایک چھوٹا سا مسافر خانہ بنا ہوا ہے۔ قریب ہی گندھک کے پانی کا چشمہ ہے جس کا پانی پینے اور اس میں اشنان کرنے کے لیے لوگ دور دور سے آیا کرتے ہیں۔ ندی پار دائیں ہاتھ کو ایک گپھا دکھائی دیتی ہے جس کے اندر پہاڑ کی چھت سے ہر وقت پانی ٹپکتا رہتا ہے اور بائیں ہاتھ کو ایک چھوٹا سا قدیم مندر دکھائی دیتا ہے۔ مندر تک جانے کے لیے ایک اونچا سا لوہے کا پل بھی بندھا ہے۔ ہر چہار

جانب ہریالی ہی ہریالی، پانی ہی پانی، خنکی ہی خنکی ہے۔ الغرض ان صفات کے باعث یہ تفریح کا مقام بن گیا ہے جہاں بچے، بوڑھے مرد اور عورتیں اکٹھا ہوتے ہیں سب گندھک کے چشمے یا ندی میں نہاتے ہیں یہ گپھاؤں میں آنکھ مچولی کھیلتے پھرتے ہیں۔

اس پار پل کے قریب کھڑے ہو کر سامنے کی جانب نگاہ دوڑائیں تو مندر کے بائیں طرف پہاڑی کے اوپر سے نیچے تک آپ کو ایک طویل و عریض لکیر دکھائی دے گی۔ بہت اوپر پہنچ کر یہ لکیر جھاڑیوں میں گھل مل جاتی ہے...... پہلے اس جگہ ایک آبشار تھا۔ جیتا جاگتا، بے تاب اور بے چین، تڑپتا اور کف اڑاتا ہوا آبشار...... لیکن اب اسی مقام پر نشان باقی رہ گیا ہے ایک بہت بڑے گھاؤ کے مانند۔

یہ آبشار ختم کیوں کیا گیا، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ جن دنوں آبشار موجود تھا اُن دنوں پہاڑی کی بلندی پر آبشار کے قریب ہی ایک بنگلہ بھی دکھائی دیتا تھا۔ پہاڑی کی چوٹی پر جگہ کم و بیش ہموار تھی جو چوڑی کم لیکن لمبی کافی تھی۔ اس کے چاروں طرف چھوٹی بڑی پہاڑیوں کا جمگھٹا تھا دور اونچے پہاڑ پر بسا ہوا شہر مسوری۔ اور پرے کوہ ہمالیہ اور کوہ شوالک کے سلسلے میلوں دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس جگہ کھڑے ہو کر دیکھئے تو قدرت کے بیسیوں مناظر دل کو موہ لیتے تھے۔ یہ مناظر شب و روز کے مختلف حصوں میں نت نئی کیفیتیں پیش کرتے تھے۔

جہاں تک بنگلے کا تعلق ہے وہ پرانی طرز کا ہلکی پھلکی چھوٹی سی دو منزلہ عمارت تھی۔ چند کمرے نیچے اور چند اوپر والی منزل پر تھے۔ کسی زمانے میں بنگلہ خوب صورت رہا ہوگا لیکن اب تو اس کی حالت خستہ تھی۔ اس سے سرائے یا ہوٹل کا کام لیا جارہا تھا۔ وہاں تک پہنچنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی تھی لیکن بعض منچلے تفریح کی خاطر وہاں تک پہنچتے تھے۔ پینے پلانے کا معقول انتظام تھا۔ گرمیوں کے موسم میں بعض اوقات خاصی چہل پہل ہوجاتی تھی۔ ایک ہی آدمی تھا وہاں جو مالک، منیجر، باورچی اور بیرا وغیرہ سبھی کچھ تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ بٹانے کے لیے دو تین پہاڑی لونڈے رکھ چھوڑے تھے۔ اس کا نام تھا کالے۔ اس کی عمر پچپن سے تجاوز کر چکی تھی۔ وہ اکہرے سے بدن کا قدرے کبڑا سا شخص تھا۔ اس کے چہرے پر گہرے خطوط کا جال سا بنا ہوا تھا جب وہ

ہنستا تھا تو اگلے دو نو نے ہوئے دانتوں کے باعث اس کی صورت مضحکہ خیز دکھائی دینے لگتی تھی۔

تقسیم ہند سے بہت پہلے موسم سرما کی ایک خوش گوار شام کو ادھیڑ عمر کا ایک مسافر وہاں وارد ہوا۔

اس کا قد چھوٹا، بدن اکہرا، داڑھی خشخشی، لباس انگریزی، صورت متین— آنکھوں پر چشمہ، سرمئی رنگ کا سویٹر— پاؤں میں گم بوٹ جو اس کے گھٹنوں تک پہنچتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ راج پور سے پیدل آرہا تھا اور راستے کی ندی نالوں کے بیچ میں سے ہوتا ہوا آیا تھا۔ اس کے پیچھے ایک پہاڑی قلی سامان اٹھائے تھا۔ بستر اور چمڑے کا بڑا سا سوٹ کیس جس پر انگریزی حروف میں اے احمد لکھا تھا۔

بنگلے کے سامنے بے تحاشہ اگی ہوئی گھاس کے لان پر وہ ٹانگیں قدرے پھیلا کر کھڑا ہو گیا اور خواب ناک نظروں سے بنگلے کا جائزہ لینے لگا...... اس کے دانتوں میں پائپ دبا ہوا تھا۔ اس کی مونچھوں کے بال دھواں کھا کھا کر بھورے رنگ کے ہوگئے تھے۔

کچھ دیر تک وہ بنگلے کو دیکھتا رہا پھر اس نے شانوں کو حرکت دے کر ادھر ادھر دور دور تک نگاہ دوڑائی۔ اس کی نظریں گھوم پھر کر بنگلے کے قریب دانہ دنکا چگنے والی مرغیوں پر رک گئیں۔

اس وقت کالے بنگلے کے ایک سرے پر بنے ہوئے باورچی خانے میں بڑے پتیلے میں کڑچھی گھما رہا تھا۔ پینے کی عادت پرانی تھی چناں چہ وہ سرور کے عالم میں انگریزی طرز پر لالا کی دھن اڑا رہا تھا اور ساتھ ہی بھونڈے پن سے کمر کو بھی ہلائے جا رہا تھا۔

جب اس کی نگاہ اجنبی پر پڑی تو فوراً کڑچھی ایک لونڈے کے ہاتھ میں تھما دی اور خود جھاڑن سے ہاتھ پونچھتا ہوا نو وارد کی جانب بڑھا اور فخریہ لہجے میں بیروں کی سی انگریزی میں دریافت کیا۔

''گڈ ایوننگ سر! یو وانٹ روم سر!''
اجنبی نے کالے کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور اسے انگریزی میں بات کرتے دیکھ کر مسکرایا۔ یس''

نو وارد اے احمد کو بنگلے کے اوپر والی منزل کا ایک کمرہ پسند آیا۔ سامان وہاں رکھوا کر اس نے سب سے پہلے گرم گرم چائے کے پیالے کی خواہش کا اظہار کیا...... کالے سرپٹ بھاگا۔

مسافر نے کمر کی پیٹی ڈھیلی کی، بوٹ اُتار کر الگ رکھے اور پاؤں کسل مندانہ انداز سے پھیلا دیئے۔

وہ اس کمرے کی فضا سے مانوس رہ چکا تھا لیکن اس طویل مدت میں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کمرہ بھی بوڑھا ہو گیا ہو۔ صاف ستھرا لیکن پرانا فرنیچر، فرش پر بوسیدہ کوپیٹ میٹنگ، صوفوں کے پھوسڑے اڑ چکے تھے دیواروں پر یا اللہ یا اللہ، لکھا ہوا کچھ دیوی دیوتاؤں کی تصویریں۔ ایک تصویر ایڈورڈ ہشتم کی بھی تھی جو ان کی نوجوانی کی تھی جبکہ وہ پرنس آف ویلز کہلاتے تھے۔ کھڑکیوں پر بندروں سے بچاؤ کے لیے لگی ہوئی جالی بھی برائے نام رہ گئی تھی۔

اس کھڑکی سے قریب ڈھائی فرلانگ پر سے آبشار نیچے گرتا دکھائی دیتا تھا اس وقت وہ یوں نظر آ رہا تھا جیسے کوئی عظیم الجثہ سفید اژدہا پہاڑیوں کی گود میں پھنکار رہا ہو۔ ہزاروں من پانی تیزی و تندی کے ساتھ کف اور چھینٹے اڑاتا سینکڑوں فٹ نیچے گر رہا تھا۔ اس گھاٹی میں گھومنے پھرنے والے انسان کیڑوں مکوڑوں کے مانند دکھائی دیتے تھے۔

احمد نے آبشار پر چند ثانیوں تک نگاہ جمائے رکھی اور سوچا کہ انسان کے جذبات کو بھی تو اس آبشار سے کس قدر مشابہت ہے...... اس خیال کے آتے ہی ان کے ذہن میں ایک دل ربا صورت کے لطیف اور نرم و نازک خطوط ابھرے اور اس کا دل زخم خوردہ

پرندے کی طرح پھڑ کنے لگا۔

اسی اثنا میں کالے سرور کے باعث قدرے لڑکھڑاتا ہوا اندر داخل ہوا اور چائے کا پیالہ میز پر رکھتے ہوئے بولا۔

"سر! پیالے کو منہ ذرا سنبھل کر لگائیے گا۔"

"کیوں......؟ آخر ماجرا کیا ہے!"

"ماجرا کچھ نہیں...... گرم ہے...... کالے کی بنائی ہوئی چائے ہے۔" یہ کہہ کر اس نے داد طلب نگاہوں سے مہمان کی جانب دیکھا۔

اس پر احمد نے خوش طبعی سے جواب دیا۔" بھئی! قائل ہوگئے تمہاری اُستادی کے...... کیوں نہ ہوں۔ آخر پرانے گھاگ ہو تم۔"

کالے سر تسلیم خم کر کے جانے کو تھا کہ احمد نے دریافت کیا۔"بھئی کالے! ایک حسین لڑکی تھی یہاں۔ بے حد حسین لڑکی...... اس کے بارے میں جانتے ہو؟"

کالے نے رک کر تامل کیا۔ بولا۔" کچھ یاد نہیں آتا...... ایک قدم چل کر رکا۔

"آپ کا مطلب میم صاحب کی لڑکی سے تو نہیں؟"

میم صاحب کون؟

انہیں کا یہ بنگلہ ہے جب وہ جوان تھیں تو بہت خوب صورت تھیں۔ کالسٹر والے چائے کے باغ کے مالک مسٹر مثرل انہیں ولایت سے لائے۔ انڈیا میں ہی ان کی شادی ہوئی لیکن بے چارے زیادہ جئے نہیں۔ یہ بنگلہ انہوں نے اپنی بیوی کے لیے بنوایا تھا۔ لیکن ان کے مرنے پر میم صاحب کا دل اتنا کھٹا ہوا کہ انہوں نے اس جگہ کی طرف رخ تک نہیں کیا۔ وہ چائے کے باغوں میں رہتی ہیں۔ اب تو وہ سوچ رہی ہیں کہ باغ بیچ باچ کر ولایت چلی جائیں۔ انہیں کی لڑکی پچھلے مہینے ادھر آئی تھیں۔ میں سمجھا آپ کا اشارہ اسی کی طرف ہے۔

"اوہ نہیں...... اچھا تو یہ بنگلہ تمہارے سپرد ہے۔

"جی ہاں میں ہی اس کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔ ان کی اجازت سے آپ ایسے صاحب لوگوں سے پیٹ پالنے کو کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے....."

"لیکن یہاں بہت کم لوگ آتے ہوں گے۔"

"جی ہاں..... گرمی کے موسم میں رونق بڑھ جاتی ہے۔ اس وقت آپ سمیت تین مسافر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک تو نیا بیاہا جوڑا ہے وہ تو اوپر والے سرے کے کمرے میں بند رہتے ہیں۔ دین و دنیا سے اُنہیں کچھ غرض نہیں..... اگر آپ کو گپ اڑانی ہو تو وہ دیکھئے سامنے کھڑکی میں سے بڑے صاحب! ہم انہیں بڑا صاحب کہتے ہیں۔ ارے بہت بڑا ڈیل ڈول ہے ان کا۔ آپ ہم ایسے آدھ درجن شخص ملائے جائیں تب جاکے ایک بڑا صاحب بنے۔ لیکن بڑے خاندانی آدمی ہیں۔ بہت بڑے افسر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی سبھی چیزیں بڑی ہیں..... رات کا کھانا اگر نیچے کھایئے تو آپ کی ان سے ملاقات ہوجائے۔ ایسی باتیں کرتے ہیں کہ دل باغ باغ ہوجاتا ہے۔"

احمد نے کھڑکی میں سے پلان کی ڈھلان پر کھڑے ہوئے بڑے صاحب کو دیکھا۔ واقعی بہت بھاری آدمی تھے۔ پورے جن دکھائی دیتے تھے۔ "اچھا بھئی کالے! نیچے ہال ہی میں کھانا کھائیں گے۔ تمہارا کہنا نہ موڑیں گے ہم۔ پھر تمہارے بڑے صاحب سے ملاقات بھی ہوجائے گی۔"

"یس سر! ضرور۔ اور پھر اب تو پرسوں تک وہ واپس جانے والے ہیں۔ دو ہفتے سے ٹکے ہوئے ہیں۔"

کالے چلا گیا۔

احمد نے منہ ہاتھ دھویا۔ کپڑے تبدیل کیے اور بستر پر نیم دراز ہوکر ریلوے بک اسٹال سے خریدے ہوئے ایک انگریزی رسالے کی ورق گردانی کرنے لگا۔ جوں جوں وقت گزرنے لگا اس کے خوابوں کی لڑکی کی یاد تازہ ہونے لگی جو حسن کی تمام روائتی خوبیوں سے مالا مال تھی۔ کیسی عجیب لڑکی تھی وہ، کس قدر والہانہ تھا اس کا عشق، کس قدر

حدت تھی اس کے سینے میں۔ کیسی شدت تھی اس کے جذبات میں، کس قدر تیز و تند تھے اس کے احساسات...... بالکل اس آبشار کی طرح...... بے چین، وحشی، طوفانی۔

لیکن اس واقعہ پر اب لگ بھگ چوتھائی صدی کی گرد جم چکی تھی۔ سچ سچ اس حسین لڑکی کے بارے میں کس قدر احمقانہ سوال کیا تھا اس نے کالے سے۔ جیسے کل کی بات ہو۔ اب تو اس کی یاد کی حیثیت ایک بھولے بسرے خواب سے بہتر نہیں کی جاسکتی...... اس وقت وہ جہاں کہیں بھی ہوگی بوڑھی ہوچکی ہوگی......

اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ حسن و شباب اور لطافت و تازگی کا مجسمہ اس ناپائیدار دنیا میں کس قدر جلد ساری خوبیاں کھو بیٹھتا ہے۔

وہ اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ خود اس کی حالت قابل دید تھی۔ کبھی وہ یہیں ایک نوعمر طالب علم کی حیثیت سے آیا تھا۔ چہرے کی تازگی اور ہمواری کی جگہ خستگی اور گہرے خطوط نے لے لی تھی۔ بال پک گئے تھے۔ صورت سے خشونت کا اظہار ہونے لگا......

رات کے آٹھ بجے کالے آیا اور کہا کہ کھانا نیچے لگ رہا ہے۔ جب وہ نیچے آیا تو بڑے صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ پیشے کے لحاظ سے جج دکھائی دیتا تھا لیکن صورت کے اعتبار سے وہ خاصہ حسین انسان تھا۔ رنگ سرخ سپید، آنکھیں بڑی بڑی۔ ناک اونچی، ہونٹ بھرپور، یہ بڑے بڑے ہاتھ، موٹی اور لمبی انگلیاں بڑی بڑی نیچے کو لٹکتی ہوئی مونچھیں جنہوں نے اس کے اوپر والے ہونٹ کا بیش تر حصہ چھپا رکھا تھا۔

اس کی گفتگو سے شگفتگی اور سنجیدگی، حرکات و سکنات سے متانت اور وقار دونوں کا اظہار ہوتا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کوئی جلا وطن تاج دار ہو۔

احمد نے سوچا اچھا ہوا جو میں کھانا کھانے کے لیے نیچے چلا آیا کیوں کہ علیک سلیک کے فوراً بعد ان کے مابین قہقہوں اور خوش گپیوں کا دور چلا۔ اور یہ صحبت اس قدر کامیاب رہی کہ دوسرے دن صبح کا ناشتہ بھی انہوں نے ایک ساتھ ہی کیا۔

دوسرے دن شام کو دفعتاً ہر طرف دھند سی چھا گئی۔ آسمان میں بادلوں کے غول کے غول جمع ہو رہے تھے۔ برآمدے کے ایک گوشے میں احمد بید کی کرسی پر بیٹھا چائے کا انتظار کر رہا تھا۔ سامنے لان پر کالے پرانے گرم کپڑے پہنے مفلر لپیٹے اپنے ٹٹو پر کاٹھی، کسنے کی فکر میں تھا۔ پھر وہ چلا کر پکار اٹھا۔

"ابے لونڈے جلدی سے چائے لے آ صاحب کے لیے......"

احمد نے کہا " کوئی مضائقہ نہیں...... ابھی تمہارے بڑے صاحب بھی تو لباس تبدیل کر کے نہیں آئے۔ ان کے بغیر چائے کا کیا لطف بھلا؟...... اس وقت کہاں کی تیاری ہے؟"

"راج پور تک جا رہا ہوں۔"

"گھومنے یا کسی کام سے"

"صاحب دونوں باتیں ہیں۔ چینی، بسکٹ، پیسٹری، انڈے سبھی کچھ لانا ہے۔ اور —" یہ کہہ کر اس نے صاحب کی طرف پر معنی نظروں سے دیکھا۔"...... اور ممکن ہے کہ کچھ اور بھی ہو جائے۔"

"وہ کیا۔" احمد نے دل چسپی کا اظہار کیا۔

اس پر کالے نے جھکی ہوئی کمر کو دفعتاً سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں صاحب اگر میں شادی کر دالوں تو کیسی رہے۔"

اس کی مضحکہ خیز صورت اور شادی اور پھر وہ بھی اس عمر میں؟ احمد نے ہنسی دباتے ہوئے پائپ میں تمباکو بھرنا شروع کیا۔

جواب نہ پا کر بھی کالے نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔

"کیا بتاؤں صاحب ایک بیوہ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑی ہے۔ کبھی سوچتا ہوں ثواب کا کام ہے کر ڈالو......" پھر اس نے کھٹ سے پتلیاں چڑھا کر آسمان کی جانب دیکھا اور مسکین لہجے میں کہا۔

''اچھا جو اللہ کو منظور ہے سو ہی ہوگا۔''

پھر کالے نے دوسرا بورا ٹٹو کے آر پار پھینکا اور اس کی لگام کھینچ کر رکاب پر رکھتے رکھتے دفعتاً رک گیا۔ '' ہاں صاحب خوب یاد آیا۔ آپ کل کس لڑکی کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ ارے آپ فیروزہ کے بارے میں تو نہیں دریافت کر رہے تھے۔ لیکن وہ تو بہت پرانی بات ہے۔ آپ اس لڑکی کو تو نہیں جانتے ہوں گے.....''

''نہیں، نہیں میں جانتا نہیں۔ یوں ہی سنا سا تھا کچھ۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں، ضرور سنا ہوگا۔ اتنے سال بیت گئے پھر بھی اس لڑکی کے بارے میں بڑے بوڑھے باتیں کیا کرتے ہیں.....کل میں کچھ نہیں سمجھا۔ اس لڑکی کے بارے میں کچھ خیال ہی نہیں آیا۔ بھلا میں یہ بات کیسے سمجھ سکتا تھا کہ اتنے برس پہلے والی لڑکی سے آپ کو کوئی دل چسپی ہو سکتی ہے.....''

''نہیں نہیں دل چسپی نہیں...... وہ تو میں......

'' ٹھیک ہے آپ کو ضرور کسی نے کچھ بتایا ہوگا لیکن جو باتیں میں بتاؤں گا وہ سولہ آنے سچ ہوں گی...... بہت پہلے کی بات ہے۔ بائیس چوبیس برس پہلے کی بات۔ ہمارے صاحب کو مرے زیادہ مدت نہیں ہوئی تھی۔ میں نے بھی دھندا اس بنگلے میں شروع کر دیا تھا۔ انہیں دنوں ایک نوجوان پٹھان ادھر آ نکلا۔ اس کے ہمراہ ایک بے حد حسین لڑکی تھی...... فیروزہ اس کا نام تھا۔ اس نوخیز لڑکی کے حسن کو کیوں کر بیان کروں۔ لفظوں میں تو ایسا کرنا ممکن نہیں...... وہ تو صاحب! الف لیلیٰ کی دنیا کی کوئی شہزادی معلوم ہوتی تھی۔''

اتنے میں چائے آ گئی۔ احمد نے چمچہ اٹھایا اور کالے نے اپنی کہانی جاری رکھی۔

وہ دونوں میرے اللہ واسطے کے مہمان بن گئے۔ یہ بات تو ظاہر تھی کہ وہ گھر سے بھاگے ہوئے تھے۔ ایک ہی رات رہنے کے بعد وہ جوان میرے پاس آیا اور میری ہتھیلی پر دس روپے رکھ کر بولا۔ اس لڑکی کو اپنی بیٹی سمجھ کر اس کا خیال رکھو۔ میں جارہا

ہوں لیکن دو تین دن تک لوٹ آؤں گا۔ تمہیں انعام دوں گا اور اسے لے جاؤں گا— !
میرے خیال میں وہ روپے کا بندوبست کرنے گیا تھا۔ لیکن دو ہفتے بیت گئے نہ وہ خود آیا نہ کوئی خط لکھا۔ لڑکی آگ پر رکھی ہوئی کلی کے مانند اندر ہی اندر جلتی رہی۔ شب و روز رونے دھونے میں مصروف رہتی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس کا تعلق کسی بھلے گھر سے ہے۔ میں نے اُسے اس کے گھر واپس بھیجنے پر آمادگی ظاہر کی لیکن اس نے ٹھرا کر انکار کردیا۔ اسے اپنے ساتھی کی بے وفائی کا بے حد رنج تھا۔"

احمد نے چمچے سے چائے میں شکر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

"اچھا تو پھر۔"

اسی اثنا میں ہمارے یہاں کالج کا ایک لڑکا آکر ٹھہرا...... اور صاحب دوسرے ہی دن سے اس لڑکی حالت میں تبدیلی پیدا ہوگئی۔ میں فکر مند ہو رہا تھا لیکن معاملے کو اس طرح سلجھتے دیکھ کر میں نے بھی دخل نہیں دیا۔ وہ دونوں شب و روز ایک ساتھ رہتے لیکن آٹھ دس دن کے بعد وہ لڑکا بھی دفعتاً غائب ہوگیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد جو حالت اس لڑکی کی ہوئی اسے بیان کرنا میرے لیے ممکن نہیں...... میں نے ہر ممکن طریقے سے اس کی ڈھارس بندھانے اور اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی لیکن اس لڑکی کی فطرت کچھ ایسی تیز و تند تھی کہ اس نے ایک نہ سنی۔ وہ نیم پاگل ہوگئی......"

اتنے میں بنگلے کے بازو والے کمرے کی کھڑکی کھلی اور نئے شادی شدہ نوجوان نے آواز دی۔

"کالے! کسی لڑکے سے کہو ہمارے کمرے میں چائے لے آئے اور پھر اس کی نوخیز حسین بیوی کا مکھڑا لحہ بھر کو دکھائی دیا اور معاً کھڑکی بند ہوگئی۔

احمد اور کالے دونوں پر کچھ دیر کے لیے خاموشی طاری ہوگئی۔ تب کالے نے لونڈے کو چائے لے جانے کے لیے کہا۔ احمد کہانی سننے کے لیے بے چین تھا چناں چہ کالے نے پھر کہنا شروع کیا۔

ایسی ہی ایک شام تھی۔ ہر طرف کہرا اور دھند۔ دور سے کالی گھٹاؤں میں بادل کی گرج سنائی دے رہی تھی۔ اسی روز نیچے گھاٹی کے گاؤں والوں کو آبشار کے شور میں نسوانی چیخوں کی آواز سنائی دی۔"

احمد کا ہاتھ رک گیا اور چائے کا پیالہ وہیں کا وہیں رہ گیا۔" تمہارا مطلب ہے وہ مر گئی۔"

"برسات کا موسم تھا۔ نالہ چڑھا ہوا تھا۔ اس لیے اس کے جسم کا کوئی سراغ نہیں ملا۔"

اتنے میں بڑے صاحب بھی آگئے۔ اپنے لمبے نیوی بلیو رنگ کے اوور کوٹ میں وہ بڑے بھلے لگ رہے تھے۔ چھ فٹ اونچے دروازے میں سے بھی انہیں جھک کر گزرنا پڑا۔

کالے نے بیڑی جلا کر دانتوں میں داب لی۔ احمد نے پوچھا۔"اچھا تو پہلے عاشق صاحب کا پتہ بھی چلا۔"

"لڑکی کے مرنے کے دو دن بعد وہ بھی آگیا۔ بڑا خوش تھا۔ اس نے بتایا کہ حالات نے مجبور کر دیا اس لیے نہ وہ خود آسکا اور نہ خط لکھ سکا...... جب اسے لڑکی کی موت کا پتہ چلا تو وہ میرے سامنے نڈھال سا ہو کر زمین پر بیٹھ گیا۔ دو تین روز تک وہ آبشار کی جانب ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ مجھ سے کالج کے لونڈے کا حلیہ پوچھا اور چھرا بغل میں دبا کر اس کی تلاش میں روانہ ہوگیا۔ کہنے لگا۔ سارا ہندوستان چھان ماروں گا۔"

احمد بہت متاثر ہوا۔ کالے نے ٹٹو پر سوار ہوتے ہوئے کہا۔ صاحب یہ تو مشہور کہانی ہے۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے اب تک یہ کہانی خوب مسالے لگا کر بیان کرتے ہیں۔"

"لیکن جو مسالے تم لگاتے ہو وہ شاید ہی کوئی اور لگاتا ہو۔" بڑے صاحب نے

مسکرا کر کہا۔

"لیجئے انہیں بھی یہ قصہ سنا چکا ہوں۔"

"جب سے میں آیا ہوں میں نے دیکھا ہے کہ تم ہر مسافر کو یہ داستان سناتے ہو۔"

اس پر کالے نے ہنس کر ٹٹو کو ایڑ لگائی اور دیر تک اس کے ٹخ ٹخ کرنے کی آواز سنائی دیتی رہی۔

بڑے صاحب نے چائے کا پیالہ ختم بھی کر لیا لیکن احمد اپنے خیالات میں ڈوب سا گیا۔ بڑے صاحب نے پیٹھ پر ہلکی سی تھپکی دے کر کہا۔

"سیر کو نہیں چلیں گے؟"

"چلیے۔"

دھند بڑھتی جا رہی تھی۔ پہاڑیوں، چٹانوں اور جھاڑیوں کے خطوط بالکل مدھم ہو گئے تھے۔

دونوں چپ تھے۔ بالآخر احمد نے مہر سکوت توڑا۔ "کس قدر دردناک سانحہ تھا۔"

"جی ہاں۔"

احمد نے ادھر اُدھر دیکھا۔ "واقعی وہ لڑکی یکتا تھی اپنے حسن کے لحاظ سے اور اپنے تیز جذبات کے اعتبار سے۔ اس مقام کے ایک ایک پتھر بلکہ ایک ایک ذرّے سے اس کی یادیں وابستہ ہیں۔ اس کے تابناک حسن کی دعوت سے کوئی انسان منہ نہیں موڑ سکتا تھا اور نہ اس کے جذبات کی گرمی کا متحمل ہو سکتا تھا...... اور پھر اس وقت میں ایک معمولی لڑکا ہی تو تھا...... بس گھبرا گیا......"

"آپ؟" بڑے صاحب نے رک کر پوچھا۔

اُس پر احمد نے مردانہ حسن کے اس مجسمے کے روبرو ذرا تن کر کھڑے ہوتے ہوئے جواب دیا۔ "جی ہاں آپ کے اس معمولی غلام ہی سے اس ماہ پارہ کو اس قدر والہانہ محبت ہوئی اور غلام ہی کی محبت کھو کر اس نے جان دے دی...... مگر چوتھائی صدی

گزرنے کو آئی کالے مجھے پہنچاتا بھی تو کیوں کر...... میں اس لڑکی کو بھول سا گیا لیکن
نہ جانے کون سی کشش مجھے یہاں کھینچ لائی۔

وہ پھر آگے بڑھنے لگے، آبشار کی جانب۔ وہ چپ تھے۔

رفتہ رفتہ بنگلے کی مرغیوں اور بطخوں کا شور مدھم ہوتا گیا اور آبشار کا شور بڑھتا گیا۔

آبشار کے قریب پہنچ کر وہ رک گئے۔ نیچے گھائی میں دھند ہی دھند تھی آبشار کا پانی
کچھ دور تک گرتا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے بعد پانی کی سفیدی دھند میں گھل مل جاتی تھی۔

''اگر آپ کو اٹھا کر یہیں سے آبشار میں پھینک دیا جائے، تو؟''

احمد نے یہ الفاظ سن کر سر اوپر اٹھایا اور ساتھی کی طرف دیکھا۔ بڑے صاحب
کے ماتھے پر ایک گہرا بل دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں آبشار کی
سی تیزی و تندی دکھائی دے رہی تھی۔ احمد کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا اس نے مریل سا
قہقہہ لگا کر دوستانہ انداز میں ساتھی کے ہاتھ پر ہاتھ مارا...... تو ساتھی نے اپنے مضبوط
ہاتھ میں اس کا کمزور ہاتھ مضبوطی سے دبوچ لیا۔

احمد کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں پھوٹ نکلیں۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''
آج کس قدر سردی ہے۔ میرا خیال ہے کہ واپس جا کر بستر میں گھس جاؤں۔''

اس کی بات کے جواب میں اس کے ساتھی کی گرفت اور مضبوط ہوگئی...... چند لمحوں
کے لیے نہایت بھدی خاموشی طاری رہی پھر بڑے صاحب کی بھاری آواز سنائی دی۔

''اتنی لمبی مدت کے بعد کالے نے مجھے بھی نہیں پہچانا۔''

یہ افسانہ 'آج کل دہلی' افسانہ نمبر مارچ 1955 میں پہلی بار شائع ہوا۔ کسی افسانوی مجموعے میں شامل
نہیں ہے۔ کلیات میں پہلی بار شائع کیا جا رہا ہے۔

ایک ہی ناؤ میں

میری آنکھ دیر سے کھلی، جب کھلی تو نگاہ اپنے دوست کپور کے اوورکوٹ پر پڑی۔
پہلے تو تعجب ہوا پھر یاد آیا کہ رات جب ہم پان کھانے کے لیے نیچے اترے تو کپور وہیں سے اپنے گھر کو رخصت ہوگیا تھا۔

اتوار کی صبح تھی یعنی یونیورسٹی میں چھٹی کا دن۔ خواب خرگوش کے مزے لوٹنے کا دن۔ مگر...... مجھے تو صبح دس بجے کا انگریزی شو دیکھنا تھا۔

غنودگی رفع کرنے کے لیے سگریٹ کی تلاش ہوئی تکیے کے نیچے یا قریب والی تپائی پر کہیں کوئی سگریٹ دکھائی نہیں دیا۔ مجبوراً اٹھنا پڑا۔ کرسی کی پشت پر لٹکے ہوئے اوورکوٹ کی جیب میں کسی وزنی شے سے ٹانگ ٹکرائی۔ جیب ٹٹولی تو اندر سے سونے کا سگریٹ کیس نکلا۔ کھولا تو سگریٹ بھی موجود پڑا۔

سگریٹ جلا کر سگریٹ کیس دیکھنا شروع کیا۔ ہمارے یار کپور کی بھی کیا شان ہے۔ سگریٹ کیس بھی اسپیشل آرڈر دے کر بنوایا گیا تھا۔ اور پھر کوٹ ملاحظہ ہو۔ کیسا نفیس کپڑا تھا۔ کس قدر حسین کاٹ اور سلائی۔ پُغد سے پُغد بھی پہن کر نکلے تو دیکھنے والوں پر رعب گٹھ جائے۔ اچھا ہوا جو وہ رات اسے یہیں چھوڑ گیا۔ سردی بھی ہے یار لوگ پہن کر ٹھاٹھ سے سنیما دیکھنے جائیں گے اور واپسی پر لوٹا دیں گے۔

میں ایک متوسط حیثیت کا طالب علم ہی سہی لیکن رنگ گورا ہے۔ ناک نقشہ اچھا ہے شخصیت بھی معقول ہے کوٹ پہنوں گا تو بس لوگ دیکھتے رہ جائیں گے۔

غنودگی رفع ہوئی تو سردی کی شدت کے پیش نظر غسل کا ارادہ ترک کرتے ہوئے شیو کرنے کی ٹھانی۔ منہ ہاتھ دھو کر اجلی قمیص نکالی اور پھر اوورکوٹ پہن کر بازار میں پنواڑی کے قد آدم آئینے میں صورت دیکھی، بچ مچ رعب ٹپکتا تھا۔

جنوری کا آغاز اور آسمان ابر آلود وفعتاً بادل کی گرج کے ساتھ بجلی چمکی مجھے ڈر لگا کہ کہیں سینما پہنچنے سے پہلے ہی بارش نہ ہونے لگے۔ لمبے لمبے ڈگ بھرنے شروع کیے۔ لیکن سینما سے ڈیڑھ فرلانگ ادھر ہی بارش نے آ لیا۔ فوراً کناٹ پلیس کے ایک برآمدے میں پناہ لینی پڑی۔ رومال نکال کر کوٹ پر پڑی ہوئی پانی کی بوندوں کو صاف کیا۔

زمین سے آسمان تک دھواں دھار ہوگیا۔ بارش کا تار بندھ گیا۔ طبیعت بدمزہ ہو رہی تھی۔ اتوار کے باعث دکانیں بند تھیں اور برآمدے سنسان۔

چند لمحوں کے بعد دیکھتا ہوں کہ ایک موٹے ستون کی آڑ سے نکل کر ایک خوش پوش انسان میری طرف بڑھا۔ عمر لگ بھگ چھیالیس برس چہرہ صفا چٹ۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ۔ دوہرا بدن اور ایک نہایت بڑھیا سوٹ زیب تن۔

مجھ سے آنکھیں چار ہوتے ہی بولے۔ "فائین ویدھر (اچھا موسم ہے)"

"اوئیس۔ ویری فائن" میں نے جواب دیا۔

میرے قریب پہنچ کر وہ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑے ہوگئے "خوب پھنسے" یہ کہتے کہتے جھپ سے ان کے منہ کا دہانہ کھلا اور سپید مضبوط دانت نمایاں ہوگئے۔

جواب میں میں نے اپنے منہ کا دہانہ اور بھی زیادہ کشادہ کیا اور دانت بھی زیادہ تعداد میں نمایاں کیے۔

وہ خاصے باتونی واقع ہوئے تھے۔ بلا توقف بولے "کہتے ہیں جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے۔ یہی مثل مجھ پر صادق آتی ہے۔ موسم اچھا

پہنچ کر اور پکچر شروع ہونے میں وقت باقی پا کر موٹر کوئنز روڈ پر رکوا دی۔ سوچا ٹہلتا ہوا چلا جاؤں۔ ذرا سیر ہی ہوجائے گی۔ اُدھر جہان آرا کو بھی کسی سہیلی کے پاس فوراً پہنچنا تھا....."

قطع کلام کر کے انہوں نے ایک نظر میری جانب دیکھا اور میرے دل کی کیفیت بھانپ کر بولے۔

"شہزادی جہاں آرا..... میری اکلوتی بیٹی۔"

یہ کہہ کر وہ بڑی پرتپاک ہنسی ہنسے..... اور تماشہ دیکھئے ادھر میں پھنس گیا ہوں اُدھر مس تمر۔ میری سکریٹری ٹکٹ خرید کر سینما گھر میں کھڑی میرا انتظار کر رہی ہوں گی ..... آپ..... کیا آپ بھی.....؟"

"جی..... جی ہاں میں بھی سینما دیکھنے جا رہا تھا۔"

"او کیا تماشہ کیا تماشہ! ایک ہی بوٹ میں..... ہاہا"

پھر اجنبی نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا میں اپنا تعارف کروادوں۔ مرا نام نواب دوست محمد یار جنگ بہادر.....آپ!!

اب میری انی سٹی گم ہوگئی۔ میں نے ہا ہا کرتے ہوئے ہاتھ بڑھایا اسی اثنا میں نواب صاحب کی نظر میرے اوورکوٹ پر پڑ گئی۔ اور بے اختیار بول اٹھے "بہت عمدہ کپڑا ہے۔ ویری کوسٹلی، کٹ اور سلائی بھی غضب کی ہے۔ کہاں سے سلایا تھا آپ نے ....."

"او..... ہی ہی..... "مجھے خود معلوم نہیں تھا۔ جلدی سے کوٹ کی اندر والی پاکٹ پر سلے ہوئے کپڑے کے لیبل کو دیکھ کر جواب دیا۔ "رینکن اینڈ کمپنی کا سلا ہوا ہے۔"

"ویری گڈ"

کچھ اور نہیں سوجھا تو میں نے جیب میں سے سونے کا سگریٹ کیس نکالا جسے دیکھ کر نواب صاحب واقعی مرعوب ہوگئے اور سمجھ گئے کہ میں بھی کوئی معمولی انسان نہیں ہوں۔ یہ کہے بغیر نہ رہ سکے۔ "آپ کے ذوق کی داد دینا پڑتی ہے..... آپ کی تعریف؟"

میں نے پہلے تو ان کا سوال ہوا میں معلق رہنے دیا۔ سگریٹ کیس آگے بڑھا کر سگریٹ پیش کیا اور ذہن پر زور دے کر جواب سوچنے لگا۔ فرسٹ جو سوجھی تو بولا "بندہ کو کنور چندر بھان سورج بنسی کہتے ہیں۔"

میرا جواب تو خاصہ نا معقول تھا لیکن جب نواب صاحب نے قدرے سر تسلیم خم کرتے ہوئے دہرایا۔ "او کنور چندر بھان صاحب سورج بنسی۔" تو میں سمجھ گیا کہ تکے نے تیر کا کام کیا ہے۔

اب میں نے حوصلہ کر کے پوچھا۔ " حکومت ہند نے ریاستیں ختم کر دی ہیں آپ......"

نواب صاحب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

میری ریاست امپھال کے جنوب میں واقع ہے اور وہ حکومت ہند کی گرفت سے باہر ہے۔"

دل ہی دل میں میں نے اپنے آپ کو شاباشی دی کہ اچھا سوال کیا ہے میں نے۔ لیکن جب نواب صاحب نے جوابی حملہ کیا۔ "اچھا تو آپ کی اسٹیٹ کا کیا حال ہے۔" تو میرے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی۔ سنبھل کر جواب دیا۔ میں ایک معقول سی ریاست کے پرنس کا چھوٹا بھائی ہوں۔"

یہ سن کر نواب صاحب نے مجھے کچھ مشکوک نظروں سے دیکھا تو میرا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ لیکن انہوں نے فوراً مسکرا کر میرا ہراس دور کرنے کی کوشش کی۔ دریافت کیا "سنیما شروع ہونے میں کتنی دیر باقی ہے۔"

"ابھی دس منٹ باقی ہیں...... ربنا ہیورتھ کی پکچر ہے خوب رش لے گی۔" میں دل ہی دل میں اس خیال سے پریشان ہو رہا تھا کہ ساڑھے دس آنے والے ٹکٹ فروخت ہو جائیں گے اور یہ یاد ہی نہیں رہا کہ میں پرنس ہوں۔

نواب صاحب نے میری ہاں میں ہاں بھری "آپ ٹھیک کہتے ہیں...... کیا حسن پایا ہے

رینا نے ... جب جہاں آرا کو لے کر میں سر آغا خاں سے ملنے کے لیے گیا تو اسے دیکھتے ہی اچھل پڑے۔ میں نے سبب پوچھا تو بولے آپ کی صاحبزادی میری بہو رینا ہیورتھ کی چھوٹی بہن دکھائی دیتی ہے......"

انہوں نے میرے والے سگریٹ کا گہرا کش لگا کر پوچھا یہ کون سا سگریٹ ہے؟ اور پھر وہ سگریٹ پر لکھے ہوئے نہایت باریک حروف کو پڑھنے کی ناکام کوشش کرنے لگے۔

میں نے بتایا کہ "یہ کیملز (Camels) سگریٹ ہے۔ یہ امریکہ کی آر جے رینالڈس ٹوبیکو کمپنی کا تیار کردہ ہے۔ میرے خیال میں یہ دنیا کا بہترین اور بے ضرر سگریٹ ہے میں ہمیشہ یہی پیتا ہوں اور دوستوں سے بھی اسی کی سفارش کرتا ہوں۔"

سگریٹ کے بارے میں میری اس قدر اپ ٹو ڈیٹ معلومات کو دیکھ کر نواب صاحب اور مرعوب ہوگئے۔ مجھے دل میں کچھ شرم بھی محسوس ہو رہی تھی کہ خواہ مخواہ ایک بزرگ کو ایسا گھٹیا دھوکا دے رہا ہوں۔

قدرے سکوت کے بعد میں نے بات کا رخ پلٹتے ہوئے کہا۔ "اگر شہزادی صاحبہ ادھر سے ہو کر چلی جاتیں تو آپ کو اس قدر زحمت نہ اٹھانی پڑتی۔"

"جی...... جی ہاں...... وہ...... وہ تو بے چاری ادھر ہی سے آرہی تھی میں نے ہی موٹر رکوا دی۔ ٹہلنے کو من ہو رہا تھا ورنہ وہ بے چاری تو میرا بے حد خیال رکھتی ہے...... بھئی کنور صاحب آپ شہزادی سے مل کر بے حد خوش ہوں گے۔ بہت ملنسار اور خوش مزاج لڑکی ہے...... شریر چھوکری!"

یہ کہہ کر نواب صاحب پھدک کر ہنسے۔ نازک اندام ہونے کے باوجود وہ شکار خوب کھیل لیتی ہے۔ شکار کو جاتا ہوں تو رائفل لے کر میرے دوش بدوش چلتی ہے۔ ارے بھائی وہ شاعری بھی کرتی ہے حالاں کہ اس کی کل تعلیم و تربیت ولایت میں ہوئی ہے لیکن مادری زبان کو نہیں بھولتی۔ بڑا آل راؤنڈ ٹیسٹ پایا ہے اس نے ...... گھڑی دکھایئے...... (جھنجلا کر) مس ٹلر بھی پریشان ہو رہی ہوگی۔ میری سکریٹری بھی بڑی چار

منگ لڑکی ہے۔ اس کے منگیتر نے اس سے کہا کہ نواب صاحب کی نوکری چھوڑ دو ورنہ میں تم سے شادی نہیں کروں گا۔ لیکن اس وفا کی پتلی نے انکار کر دیا..... واقعی کیسا بلند کریکٹر ہے اس کا—"

میں سمجھ گیا کہ نواب صاحب بھی ایک گھاگ ہیں۔ دنیا کا نشیب و فراز خوب دیکھے ہوئے ہیں۔ سوچنے لگا کہ اپنے بارے میں کیا باتیں بتاؤں۔ نہ میرے پاس کار نہ شہزادی جہاں آرا اور نہ سکریٹری۔

انہوں نے خود ہی دریافت کیا" آپ یہاں تفریح کی غرض سے آئے ہیں۔

جی اصل بات یہ ہے" میں نے بے پروائی سے نتھنوں میں سے دھواں اڑاتے ہوئے جواب دیا" ہم دہرہ دون بڑے شکار کے لیے جا رہے تھے۔ مجھے سنٹرل گورنمنٹ میں کچھ کام تھا۔ اس لیے میں آج ہی تین چار دن کے لیے رک گیا میرے ساتھی آگے بڑھ گئے ہیں۔

"آئی سی See ! تب تو جہاں آرا سے آپ کی ملاقات ضرور ہو جائے گی۔ عین ممکن ہے وہ بھی شکار کے لیے تیار ہو جائے۔ بات یہ ہے کہ وہ شکار کی بے حد شوقین ہے....."

یہ بات میری اور زیادہ پریشانی کا باعث بنی۔ لیکن میں موڈ میں آیا ہوا تھا۔ بڑی بے تکلفی سے بولا۔" اور نواب صاحب یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ شہزادی صاحبہ سے مل کر میں ہی شکار پر جانے کا پروگرام منسوخ کر دوں۔

اس پر نواب خوب ہنسے۔ انہوں نے ایک آنکھ بھٹ سے بند کر کے میری جانب پر معنی نظروں سے دیکھا اور بولے۔" یو ناٹی بوائے"

بارش خاصی دھیمی پڑ گئی۔ میں نے نواب صاحب کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ آیئے چھوٹی سی دوڑ لگائیں۔ اب تو خبروں کی ریل دکھائی جا رہی ہوگی۔

"او کے بائے"

سنیما کی ڈیوڑھی میں پہنچ کر نواب صاحب نے ادھر ادھر دیکھا "ایں..... مس طر کہاں ہیں؟"

پھر انہوں نے گیٹ کیپروں سے مس طر کے بارے میں دریافت کیا لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔ اب ان کی بے چینی بڑھنے لگی۔ جیبوں کو چھونے کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کے پاس اس وقت روپیہ بھی نہیں ہے۔ میں نے یہ موقع غنیمت سمجھا۔ میری جیب میں اتفاق سے دس کا نوٹ بھی تھا نواب صاحب کی خاطر ساڑھے دس آنے کے بجائے اونچے درجے کا ٹکٹ خریدنا پڑا۔

میرے ہاتھ میں دو ٹکٹ دیکھ کر نواب صاحب بڑبڑائے "اوہ..... وٹ؟ دو ٹکٹ؟ آپ نے میرا ٹکٹ بھی خرید لیا..... نہیں..... ایسا نہیں کرنا چاہئے آپ کو۔"

میں نے انہیں شرمندگی سے بچانے کے لیے ان کی پیٹھ پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے کہا "کوئی مضائقہ نہیں نواب صاحب! آپ کے ہمارے روپے الگ تو نہیں ہیں۔"

وہ بادلِ نخواستہ چل دیئے میرے ساتھ

"میں نے سمجھایا نواب صاحب ہوسکتا ہے مس طر کو بھی بارش کی وجہ سے کہیں رکنا پڑا ہو۔ انہیں غلط فہمی ہوئی ہو۔ کبھی ہوں آپ ساڑھے بارہ کے شو میں جائیں گے۔ اتوار کے دن ہی تو ساڑھے دس بجے صبح کو شو ہوتا ہے اور تو کسی روز ہوتا نہیں..... باقی رہی شہزادی صاحبہ تو وہ بچہ ٹھہریں..... حالاں کہ شہزادی کے ذکر کا محل نہیں تھا پر میں نے موقع پیدا کر کے پوچھ لیا۔" بھلا کیا عمر ہوگی ان کی؟"

نواب صاحب کی خوش مزاجی عود کر آئی بڑی میٹھی آواز میں بولے "اوہ..... سولہ برس..... نہیں سولہ برس کی بھی نہیں ہوئی ابھی ساڑھے تین مہینے باقی ہیں..... اوہ اِز اے سویٹ چائیلڈ!"

سینما کے ہال میں پہلی بار صوفے پر بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ اتنے روپوں کا خون ہو جانے کی وجہ سے کوفت تو ہو رہی تھی لیکن نواب صاحب کی صحبت کی خاطر سب کچھ

برداشت کرنا پڑا۔

پردۂ سیمیں پر جب ریتا ہیورتھ رقص کرتی دھوم مچاتی آئی تو نواب صاحب آپے سے باہر ہوگئے۔ بے چینی سے لگے ہاتھوں کو مروڑنے اور انگلیاں چٹخانے۔

''اس کی ٹانگیں ملاحظہ ہوں۔ کس قدر سڈول اور گدرائی ہوئی بھرپور۔ واللہ! کیا بات ہے کیا بات ہے۔''

میں نے جواب دیا'' نواب صاحب یہ کیا ہے پیرس کے اسٹیج پر جو رقص ہوتے ہیں ان کے مقابلے میں یہ سب ہیچ ہیں۔''

''سچ؟'' نواب صاحب نے منہ کھول کر میری جانب دیکھا۔

''آپ تو پیرس گئے ہوں گے'' میں نے یاد دلایا۔

''گیا کیوں نہیں..... لیکن ہے ہے کنور صاحب! غور فرمایئے نوجوان بیٹی میرے ساتھ ہو اور ہر جگہ میرے ہمراہ جانے پر بضد ہو تو میں بھلا ایسی جگہوں پر کیسے جاسکتا ہوں۔ خود ہی غور فرمایئے۔ یہ کہہ کر نواب صاحب نے بچوں کے سے بھول پن سے میری جانب دیکھا۔'' آج تو سچ پوچھئے میں خود شہزادی کو جُل دے کر آیا ہوں۔''

''درست ہے درست ہے۔'' میں نے پیرس کے بارے میں سنی سنائی باتوں کو یاد کرنے کے لیے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔

''اچھا تو کنور صاحب! ذرا تفصیل سے بتایئے کہ وہاں کیا ہوتا ہے؟''

''ارے صاحب وہاں رقاصائیں کچھ اس انداز سے پیش کی جاتی ہیں کہ ضعیف سے ضعیف آدمی بھی پھڑک اٹھے۔

''سچ؟''

''جی''

اب تو نواب صاحب کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ بجائے سنیما کے پردے کی طرف دیکھنے کے میری جانب دیکھنے لگے۔

''آپ کا مطلب..... یعنی کہ..... بالکل.....؟''

''قریب قریب..... بالکل''

''اُف اُف..... بہت مزا آتا ہوگا۔''

''بس کچھ نہ پوچھئے وہ فضا' وہ حسن وہ.....''

''اور وہ جوانی—'' کا اضافہ کر کے نواب صاحب میرے ہاتھ پہ ہاتھ مار کر اور ایک آنکھ بند کر کے ہنسے۔

اب تو وہ خوب کھل کھیلے۔ انہوں نے آپ بیتیاں سنائیں کچھ میں نے گھڑ گھڑا کر انہیں خوش کیا۔ یہاں تک کہ جب پکچر ختم ہوئی تو ہم دونوں کے تعلقات خاصے گہرے ہو گئے تھے۔

گیلری سے اترتے وقت انہوں نے کہا'' کنور صاحب میری کار آئی ہوگی۔ میں آپ کو رہائش گاہ تک چھوڑ آؤں گا۔

میں دعائیں مانگنے لگا کہ بھگوان کرے ان کی کار نہ آئی ہو میری پرارتھنا قبول ہوئی۔ نواب صاحب نے سراسیمہ ہو کر کہا ''کنورصاحب آج تو غضب ہو رہا ہے۔ چندے انتظار کرتے ہیں.....''

میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے دولت کدے تک جائیں اور خواہ مخواہ میرا پول کھل جائے۔ اس لیے میں نے جلدی سے کہا۔ ''کوئی ہرج نہیں نواب صاحب میں آگے سے ٹیکسی لے لوں گا۔''

''آپ ٹھہرے کہاں ہیں؟''

''پٹودی ہاؤس میں۔''

''اچھا تو کب ملیے گا پھر؟''

''جب آپ کہئے'' میں نے جواب دیا۔

''آج اتوار ہے..... پیر' منگل..... بدھ ہاں بدھ کی شام خالی ہوگی میری۔

چائے اکٹھے پئیں گے۔"

بہتر کس جگہ

"بھئی کنور صاحب میں ایک دوست کے وہاں مقیم ہوں..."

"بہتر..... میں خود ایک دوست کے وہاں رکا ہوا ہوں۔ بیچ وہاں ایسی بے تکلفی سے بات چیت نہیں ہو سکے گی۔ اچھا تو بیکنز کے وہاں ملیں گے۔ ہوٹل میں ہی ٹھیک رہے گا۔"

"بہت اچھا۔" نواب صاحب نے ہاتھ ہلا کر جواب دیا۔ چلتے چلتے میں نے تاکید کی۔ "اور شہزادی جہاں آرا کو بھی ساتھ لایئے گا۔"

"ضرور..... ضرور"

وہاں سے بھاگا تو سیدھے اپنے کمرے میں پہنچ کر دم لیا۔

رات بھر شہزادی جہاں آرا کے متبسم ہونٹوں' عطر بیز زلفوں اور بے عیب نو خیز جوانی کے مناظر پیش نظر رہے۔

اب نئے کپڑوں کی ضرورت محسوس ہوئی سوچا کم از کم ایک سوٹ تو سر دست ایسا تیار ہونا چاہئے کہ شہزادی بھی دیکھے تو پھڑک اٹھے ایک بار اس فیصلے کے بعد روپے کی فراہمی کا سوال پیدا ہوا۔ چناں چہ کچھ ادھار کچھ کتابیں بیچ باچ کر سوٹ کا بڑھیا کپڑا خرید اپنے دیرینہ درزی کے پاس پہنچا اور کہا کہ ایک سوٹ سلانا ہے مگر ارجنٹ۔

"رے صاحب کہیں چار مہینے بعد صورت دکھائی اور وہ بھی ارجنٹ کام لائے....."

اتنے میں میری نظر سامنے کی کھونٹی پر پڑی وہاں وہی نواب صاحب والا سوٹ لٹکا ہوا تھا۔ حیرت ہوئی کہ نواب صاحب بھی یہاں سے کپڑے سلاتے ہیں۔ میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ اس پر دکان دار نے جواب دیا۔ "جناب آج کل بہت بڑے بڑے لوگ ہم سے سلوانے لگے ہیں۔ بات یہ ہے کہ آج کل ہمارے یہاں ایک بہت اچھا کٹر آیا

ہوا ہے۔ ایسا کاری گر کہ بس طبیعت صاف ہو جائے گی۔"

میں خوش ہوا۔ کپڑا تو بڑھیا تھا ہی۔ اب کٹنگ اور سلائی کی کسر بھی پوری ہو جائے گی۔

دکان دار نے پکار کر کہا۔ "جلنے خاں بھئی ذرا ادھر آ کے ناپ لے لو بابو جی کا۔"

میں نے کہا۔ "بھئی یہ تو اچھا ہوا۔ بات یہ ہے کہ کل اتفاق سے ایک نواب صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ تھے وہ گھن چکر۔ مجھ کو راجہ مہاراجہ سمجھ کر بیٹھے۔ میں نے انہیں ان کی بیٹی شہزادی جہاں آرا سمیت پرسوں چائے پر بلایا ہے بس اسی چکر میں ساری پونجی لگا کر یہ سوٹ سلوا رہا ہوں......"

دکاندار کو میری ان باتوں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی میری بات ختم ہوتے ہی بولا۔ "جلنے خاں آپ کے پیچھے کھڑا ہے...... میں نے مڑ کر دیکھا تو جلنے خاں...... ارے نواب صاحب؟...... نواب صاحب میلا کچیلا پائجامہ پہنے اور گلے میں غلیظ فیتہ لٹکائے چپ چاپ کھڑے تھے۔ ادھر مارے حیرت کے میرے منہ سے آواز تک نہ نکل سکی۔

مالک نے کہا "ڈریسنگ روم میں چلے جائیے اطمینان سے ناپ دیجئے۔"

ڈریسنگ روم کی تنہائی میں پہنچتے ہی جلنے خاں نے اطمینان سے سر جھکا کر مجھے فرشی سلام کیا اور انتہائی سنجیدگی سے ایک آنکھ بند کر کے میری جانب لمحہ بھر دیکھنے کے بعد فرمایا۔

"حضور کنور چندر بھان صاحب چندر جسی!"

میں نے اور بھی زیادہ ادب کے ساتھ سر تسلیم خم کر کے آداب بجا لاتے ہوئے جواب دیا۔

"اعلیٰ حضرت نواب دوست محمد یار جنگ بہادر!!"

یہ افسانہ پہلی بار 'آج کل' دہلی جون 1954 میں شائع ہوا۔ کسی افسانہ مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ پہلی بار کلیات میں شامل کیا جا رہا ہے۔

جزیرے

There is a River
Called the River of no return
Sometimes it's peaceful
And Sometimes wild and free

جب میں کم سن تھا اس وقت میرے پاس انگریزی کی ایک موٹی سی باتصویر کتاب تھی۔ اس میں متعدد چھوٹی بڑی کہانیوں، نظموں اور کارٹونوں کے علاوہ رنگین و سادہ تصاویر کی بھرمار تھی۔

صفحہ اول کے مقابل چکنے کاغذ کے پورے صفحے پر نو یا دس سالہ حسین لڑکی کی تصویر مدت دراز تک میرے حافظے کے دھندلے تہ خانوں میں فروزاں رہی — ایک بہت بڑا پرندہ تھا جو محض پھولوں کا بنا ہوا تھا۔ ایک بڑا سا سردہ اس کا جسم تھا اور اس کے پر کیلوں کے بنے ہوئے تھے اور باقی اعضا یعنی سر، چونچ، دم وغیرہ کے لیے بھانت بھانت کے پھل اور سبزیاں استعمال کی گئی تھیں۔ پرندے آسمان کی نیلگوں بلندیوں سے ایک سرسبز و شاداب وادی گیاہ و گل میں اتر رہا تھا۔ اس کی پشت پر وہ لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کے رشکِ منیر گول چہرے کے پیچھے لیکن نہایت سرخ لب شمع کی لو کی طرح دک

رہے تھے اور ان کا دہکتا ہوا رنگین عکس اس کے رخساروں پر جھلملا رہا تھا۔ ابرو کمان، مژگاں، ستاں اور آنکھیں شربتی تھیں۔ بوب طرز سے کٹے ہوئے گھنے بھورے بال ہوا میں شعلے اڑا رہے تھے۔ اس کے طفلانہ گول مٹول ہاتھ پرند کی پشت پر دھرے تھے۔ ہوا میں اڑتے ہوئے فراک کے سرک جانے سے اس کی پنڈلیوں اور ٹخنوں کی گدراہٹ نمایاں ہوگئی تھی— پاؤں میں سبز رنگ اور سرخ بٹنوں والا انگریزی جوتا تھا۔

بوقتِ فرصت میں اُسے اکثر دیکھا کرتا یوں محسوس ہوتا جیسے وہ پرند دیکھتے ہی دیکھتے سطحِ زمین کو چھولے گا اور اس پر سوار کچھ خوش اور کچھ سہمی ہوئی لڑکی اطمینان کی سانس لے کر نیچے اُتر پڑے گی...... پھر......

میں اکثر سوچا کرتا کہ وہ اُتر کر کہاں جائے گی۔ تصویر میں کوئی آبادی کوئی مکان نظر نہیں آتا تھا نہ کوئی انسان ہی دکھائی دیتا تھا۔ ہر چہار جانب ہریالی ہی ہریالی پھول ہی پھول، شادابی ہی شادابی...... یہاں سے میں اپنی قوتِ تخیل سے کہانی کو آگے بڑھاتا...... پھولوں کی فلاں کنج میں سے دفعتا میں نکل آؤں۔ مجھے دیکھ کر پہلے تو وہ گھبرا جائے اور پھر مسکرا دے— لیکن اُنہیں ، یوں کیوں نہ ہو کہ میں جھاڑی کی اوٹ سے جنگلی بلّے کی طرح ایک خوف ناک میاؤں کروں اور اس کے سہم جانے کا تماشہ دیکھوں۔ اور جب وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر تاک رہی ہو تو میں نمودار ہو کر اُسے دلاسا دوں۔ بلّے کی تلاش کے بہانے سے ہم کنج کنج، جھاڑی جھاڑی پودا پودا چھان ماریں...... اس دوران میں ہم کیسے ایک دوسرے سے چھو چھو جائیں...... اگرچہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پھر کیا ہو...... لیکن تخیل اپنے شہپر پھیلاتا تو ان جانی، ان سمجھی اور ان بوجھی لذتوں کے بار سے دل لرزلرز جاتا۔

اب ایک معجزہ ہوا...... عملی زندگی میں ایسے معجزے شاذ و نادر ہی ظہور پذیر ہوتے ہیں— اس رنگین تصویر کی رنگین لڑکی جیتی جاگتی، ہنستی بولتی چہکتی، گنگناتی میری زندگی میں داخل ہوئی۔ ہم فرض کیے لیتے ہیں کہ اس کا نام کانتی تھا...... شوبھا، لتا، نمی، شمی کے اس زمانے میں کانتی غالباً بوسیدہ سا نام معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مجبوری ہے کیوں کہ یہی نام اس

کے نام سے مِلتا جلتا معلوم ہوتا ہے..... اگر وہ اب بھی زندہ ہے تو نہ جانے کس حال میں ہوگی۔ کب اس کی شادی ہوئی ہوگی۔ کیسا پتی ملا ہوگا، کتنے بچے ہوئے ہوں گے، کتنی موٹی کتنی بھدّی ہوگئی ہوگی وہ!

ماضی..... ماضی..... ماضی..... کئی برس..... کئی صدیوں، کئی یگوں کی بات ہے یہ، جب کہ میں بچہ تھا۔ دنیا میں آئے اتنے کم سال ہوئے تھے کہ انہیں گننے کے لیے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کافی تھیں..... یہ مقام دہرہ دون— یہ وہ جگہ ہے جہاں میرے لڑکپن کا بیش تر حصہ بسر ہوا۔ میرے والد شہر سے الگ تھلک ایک سرکاری کالج میں ملازم تھے۔ انگریز کا زمانہ تھا اس کالج میں صرف روسا کے بچے ہی پڑھتے تھے۔ حاکم کا خوف اس قدر تھا کہ والد صاحب قومی اخبار چھپ چھپ کر پڑھا کرتے تھے۔ یورپین اور ہندوستانی اسٹاف کے لیے کالج کے حدود کے اندر ہی بنگلے بنے ہوئے تھے۔

کالج اسٹاف ہی کے ایک ممبر کی لڑکی تھی۔ وہ میری ہم عمر یا مجھ سے ایک آدھ سال بڑی ہوگی۔ حلیہ ہو بہو متذکرہ بالا تصویر والی لڑکی کا سا۔ مجھے اس کی صورت بے حد پسند تھی اور میرے دل میں اس کی چاہت بہت شدید تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ نہیں رہ سکتے تھے۔ ہر دم کا ساتھ تھا۔ موسم کے ہر رنگ کے ساتھ وہ بھی رنگ بدلتی تھی۔ موسم سرما میں وہ موم کی مورتی بن جاتی، گرمیوں میں انگارہ، برسات میں پری اور خزاں میں آفت کا پرکالہ..... گھنٹوں ہم پائنے کے باغ میں ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں پر ٹہلا کرتے، پیڑوں کے نیچے، دیواروں کے سائے تلے، برآمدوں کے گوشوں میں ہم گھروندے بنا بنا کر کھیلا کرتے تھے۔

والد صاحب مرحوم بچوں کو بہت پیار کرتے تھے لیکن شرطیں دو تھیں۔ بچہ خوب صورت ہو اور صاف ستھرا۔ ان کے لاڈ پیار کرنے کا انداز یہ تھا کہ بچے کی بغل میں ہاتھ دے کر ہوا میں اکثر اچھالتے اور چومتے۔ بہت چھوٹے بچے کو اچھالنا مناسب نہ سمجھتے تو اسے ہاتھ پر بٹھا کر اوپر تک لے جاتے اور دائیں بائیں خوب گھماتے۔ اس

طرح کبھی کبھی کانتی کی باری بھی آ جاتی۔ میں صحن میں بیٹھ اس کا انتظار کر رہا ہوتا۔ چھوٹی سے چھوٹی آہٹ پر کان لگے ہوتے..... ادھر پل پل بھاری ہو رہا ہوتا اُدھر صحن کی چار دیواری کے باہر خوب کھلکھلا کر ہنسنے کی آوازیں آتیں..... کانتی کی ہنسی..... کانتی کی ہنسی!

باہر نکل کر دیکھتا کہ اچھی بہت اچھی، رنگین کپڑوں میں ملبوس، غبارہ سی، گڑیا سی کانتی..... ہوا میں اُچھالی جا رہی ہے اور وہ مارے ہنسی اور گدگداہٹ کے لوٹن کبوتر بنی جا رہی ہے..... میں اس وقت تک ضرور رکا رہتا جب تک کہ وہ مجھے دیکھ نہ لیتی۔ آنکھیں چار ہوتے ہی نظر پھیر کر دھیرے دھیرے زمین کو بے ڈول چھڑی سے پیٹتا اور سست قدموں سے باغ کے دوسرے گوشے کی طرف چل دیتا۔

اگر میں یہ کہوں کہ والد صاحب کا کانتی کو پیار کرنا مجھے سخت ناپسند تھا تو مبالغہ نہ ہوگا..... اور بچوں سے جتنا چاہیں پیار کریں لیکن کانتی سے ان کا لاڈ پیار مجھے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔

کانتی چھٹکارا پاتے ہی میرے پاس پہنچتی۔

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا لیکن بظاہر میں بے گانہ پن کی بھبوت ملے اور بے اعتنائی کی دھونی رمائے چپ چاپ بیٹھا رہتا۔

بعض اوقات جی میں آتا کہ کس کر پتھر مار دوں اس کے منہ پہ یا اس زور کی لات رسید کردوں کہ دور تک لڑھکتی چلی جائے۔ لیکن عملی طور پر ایسا کرنا میرے لیے ناممکن تھا اور پھر یہ بات بھی تو تھی کہ وہ مجسم قصور وار، سرتا پا گنہگار، رواں رواں شرم سار بنی چپ چاپ کھڑی رہتی..... وہ جانتی تھی اپنا قصور — کہ وہ بیٹھک کی بجائے جہاں والد صاحب بیٹھے ہوتے تھے، پچھواڑے سے مکان میں داخل کیوں نہیں ہوئی تھی۔ لیکن وہ کیسے بتائے کہ وہ پچھواڑے سے ہی آ رہی تھی لیکن والد صاحب نے اچانک دیکھ کر آواز دی۔ "بٹیا رانی ادھر آؤ"

اسے یوں شرمسار سا دیکھ کر میں خود ہی زمین میں گڑ جاتا تھا لیکن قانونی

کارروائی بھی لازمی تھی۔

میں اس کی طرف دیکھنے سے احتراز کرتا۔ یہ اس کے لیے بڑی جان لیوا بات ہوتی تھی۔ وہ بڑی لاڈلی بچی تھی۔ میرے سوا شاید ہی کوئی اس سے بے اعتنائی سے پیش آتا ہو۔ وہ چاہتی تو میری پرواہ بھی نہ کرتی لیکن اس نے ایسا کبھی نہیں کیا شاید وہ سمجھتی تھی کہ اور سب مجبور تھے اور میں مجبور نہ ہو کر بھی اسے چاہتا تھا..... حالاں کہ سب سے بڑا مجبور تو میں ہی تھا۔

ہماری پھر سے صلح ہونے کا طریقہ کچھ اس قسم کا ہوتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے میں زمین پر چھڑی سے ایک لکیر کھینچ دیتا۔ وہ گہری توجہ سے اس لکیر کو دیکھنے لگتی۔ میں ایک لکیر اور کھینچ دیتا۔ وہ میرے قریب بیٹھ جاتی۔ میں فلسفیانہ موڈ بنائے لکیریں کھینچے جاتا اس کی دل چسپی بھی بڑھتی جاتی..... وہ اور قریب کھسک آتی میں اس کے بے تیل کے روکھے سوکھے بالوں کی مخصوص باس محسوس کرنے لگتا وہ زمین پر بنے ہوئے بے ڈھب نقشے کو دیکھتے ہوئے پوچھتی، یہ کیا ہے؟ میں تامل کرتا۔ کیوں کہ میں اس آغاز گفتگو میں پوشیدہ صلح یا سمجھوتے کے امکان کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ چناں چہ میں جبیں پر ایک عدد شکن ڈال کر بے کیف بھاری آواز میں جواب دیتا۔ "تم نہیں سمجھ پاؤ گی" اس پر وہ مزید غور کر کے ان آڑی ترچھی لکیروں کا جائزہ لیتی۔ اس کی دانست میں میں حکیم آئین سٹائین سے کم نہیں تھا۔ وہ قائل ہوجاتی کہ یہ نقشہ اس کی فہم سے بہت بلند ہے۔ معاً وہ جھپٹا مار کر میرا ہاتھ پکڑ لیتی اور پھر چشم زدن میں اسے اپنی گود میں چھپا لیتی..... یہ عجیب حرکت ہوتی تھی اس کی..... جیسے میرا ہاتھ مجھ سے الگ تھلگ شے ہو جسے اس نے شرارتاً چھپا لیا ہو — اور پھر جب میں اس کی طرف دیکھتا تو اس کی آنکھوں میں اور چہرے پر جذبات کی وہ فراوانی اور گونا گونی ہوتی جو میری سمجھ میں نہیں آتی تھی..... غالباً وہ بھی کچھ نہ سمجھتی تھی..... اس کے ہنستے ہوئے منہ کے گوشوں پر رنگین تتلیاں آنکھ مچولی کھیلنے لگتیں۔

اس زمانے میں کچھ اور لڑکیاں بھی میری دوست بنیں — حقیقت یہ تھی کہ کالج

کے احاطے میں چند گنے چنے گھر تھے ان میں لڑکوں کی نسبت لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ علاوہ ازیں عمر اور سماجی درجے کی رکاوٹیں بھی بچوں کے میل جول پر اثر انداز ہوتی تھیں۔ چناں چہ میں انہیں مجبوریوں کا شکار تھا۔

دوسری لڑکی جو مجھے یاد ہے اس کا نام خورشید تھا۔ اس کے والد بڑے افسر تھے۔ میرے والد کو ان کا پاس تھا۔ ہم دونوں کے گھروں کے درمیان ایک فرلانگ کا فاصلہ ہوگا۔ خورشید اکثر رات کو آٹھ بجے آتی تھی۔ اپنی چھوٹی بہن کو ساتھ لے کر پہلے تو بیٹھک میں والد صاحب کے پاس پہنچتی تھی۔ والد حسب عادت بچوں سے خوب زور زور سے باتیں کرنے لگتے۔

''کھوشیدو بٹیا! بھئی آج کیا کیا چیز کھا کر آئی ہو...... ہمیں بھی تو کھلاؤ...... اپنے ہاتھ سے پکا کر۔''

ننھی خورشید نہ جانے کیا جواب دیتی۔ اسے در اصل مجھے اپنے ہم راہ لے جانا ہوتا تھا اس لیے والد صاحب کی اجازت ضروری تھی۔ وہ جانتی تھی کہ میں اپنے ابا سے بہت ڈرتا ہوں اور جب تک وہ خود مجبور نہ کریں میرا رات کے وقت اِدھر اُدھر مٹرگشت کرنا قطعاً ناممکن تھا۔ یہ تو مسلمہ حقیقت تھی کہ والد صاحب اسے ہمیشہ اجازت دے دیتے تھے۔ جب وہ میرے کمرے میں داخل ہوتی تو میں خواہ مخواہ پڑھنے میں محو ہو جاتا۔ پہلے وہ میری خوشامدیں کرتی۔ پھر میری ضد پر خوب جز بز ہوتی۔ والد صاحب سے شکایت کی جاتی۔ وہ پکار کر کہتے۔'' جاؤ بٹیا! دیکھو تو شیدو تمہیں لینے کے لیے آئی ہے۔''

حالاں کہ میرا دل مارے خوشی کے بلیوں اچھل رہا ہوتا، تاہم یہ ساری کارروائی ناگزیر تھی۔ بس ایک بار گھر سے باہر نکلتے ہی پڑھائی لکھائی کے سب تفکرات مسرت کے ایک ہی نعرے میں اڑ جاتے۔

خورشید عمر میں مجھ سے تین برس بڑی تھی لیکن بچپن مجھ سے کہیں زیادہ تھا بے حد چلبلی، بات بات میں کھی کھی، گیوں کا ہنڈارا، خوب ڈرپوک، اگرچہ پٹھان خاندان سے

تھی، رنگ بے حد گورا، لیکن بال اور آنکھیں بے حد کالی۔ نازک اندام اور خوش خرام۔

وہ مجھے بڑا پہلوان سمجھتی تھی۔ اس کی موجودگی میں میں بھی دلیر ہوجاتا۔ اس کے خوف زدہ ہونے پر میری ہمت بڑھ جاتی ۔ مجھے اس کا ڈرپوک ہونا بہت مرغوب تھا.....

ایک بار رات کے ساڑھے آٹھ بجے کے قریب اپنے گھر سے نکل کر ہمارا چھوٹا سا قافلہ ان کے گھر کو جارہا تھا۔ دفعتاً خورشید رُک گئی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''اوئی اللہ! وہ دیکھو!'' میں نے صحن کے دیو نما پیڑ کے پیچھے کسی جانور کا سایہ دیکھا جو تھوتھنی سے چڑ چڑ کی آواز نکال رہا تھا۔ چائے کا باغ قریب تھا جہاں رات کو اکثر جنگلی جانور آجایا کرتے تھے۔ تنہائی کی حالت میں شاید خود ہی بھاگ کھڑا ہوتا لیکن خورشید کی موجودگی میں میرا شیر ہونا لازمی تھا۔ میں نے زمین سے دو تین پتھر اٹھائے۔ ادھر بڑھنے کو قدم اٹھایا تو خورشید نے روک کر مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا جیسے میں بڑا اکھڑ مزاج جنگجو ہوں۔ '' تم مت جاؤ بھئی'' لیکن میں کب رکنے والا تھا۔ خورشید کا حلق اس قدر خشک ہوگیا کہ کچھ کہے نہ بنتا تھا وہ چھوٹی بہن کو گود میں اٹھا کر میرے پیچھے پیچھے ہولی۔ ذرا فاصلے پر رُک کر میں نے زور کا نعرہ لگایا جس میں خوف زیادہ اور للکار کم تھی۔ خوش قسمتی سے وہ ایک معمولی کتا نکلا، آواز سنتے ہی بھاگ نکلا..... اسے بھاگتے دیکھ کر میں نے بھی ایک پتھر بے نشانہ پھینک دیا— خورشید کو خوب پسینے چھوٹے (اور مجھے بھی) لیکن اس کے دل میں میری دھاک بیٹھ گئی۔

ان کے مکان میں ایک بہت بڑا کمرہ ایسا بھی تھا جس میں اکثر بچا کھچا ٹوٹا پھوٹا سامان بکھرا ہوتا۔ یا وہ چیزیں جن کی ضرورت محض عارضی ہوتی تھی۔ اس کمرے میں ہم خوب دھاچوکڑی مچاتے تھے۔ بستروں کے اندر، باہر، چارپائیوں کے اوپر تلے، الماریوں کے آگے پیچھے...... آنکھ مچولی، چور چور، شیر شکاری میاؤں میاؤں ...... سبھی قسم کے بچکانہ کھیل۔

ایک اور لڑکی تھی جس کا نام یاد نہیں آرہا— اس کے ساتھ بھی بعض اوقات

گاڑھی چھٹی تھی لیکن اس کا نمبر تیسرا تھا۔ اول کانتی ، دوم خورشید — اس کا نام شنی فرض کیے لیتے ہیں۔ شنی کے سر پر بالوں کی وہ افراط تھی کہ ذرا فاصلے سے ایک بال کو دوسرے سے الگ دیکھنا قریب ناممکن تھا۔ بس یوں لگتا تھا جیسے سیاہ رنگ کا ایک بڑا سالکۂ ابر اس کے بیضوی چہرے کو تین طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ چہرے کا رنگ زردی مائل، ناک کھڑی، ہونٹ باریک، ٹھوڑی آم نما، آنکھیں چہرے کے لحاظ سے بہت بڑی۔ سوئے سوئے سوئے سے۔ گھنی لمبی پلکیں جنہیں وہ بہت کم جھپکاتی تھی۔ ہم عمر لیکن عادات میں بچپن نہ الھڑ پن۔ وہ بڑی سنجیدہ اور پر اسرار صورت بنائے رکھتی۔ میں اس کی طرف کم ہی متوجہ ہوتا۔ کبھی کبھی وہ میرا ہاتھ تھام لیتی اور اپنی موٹی، کالی کالی بے حس آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ کر کہتی۔ "ہمارے ساتھ نہیں کھیلو گے۔"

میں اس سے کچھ کتراتا تھا۔ اس کی کم گوئی، سنجیدگی اور بھیگی بھیگی آنکھوں سے مجھے ایک ان جانی جھجک سی محسوس ہوتی تھی۔ کبھی یوں لگتا جیسے وہ جادو کے زور سے ایک دم لمبی داڑھی والا بکرا بن جائے گی — اور پھر نہ جانے بھی کیا ہو۔

ان کے علاوہ کچھ اور بھی کالی پیلی نیلی ناک سرسراتی لڑکیاں تھی لیکن ظاہر ہے کہ کانتی اور خورشید کے مقابلے میں ان کا چراغ جلنا ناممکن تھا۔

ہندوستانی پروفیسروں کے بنگلوں کے احاطے والی تقریباً ساڑھے چھ فٹ اونچی دیوار احاطے کے باہر والی ایک سڑک کے ساتھ دور تک چلی گئی تھی۔ سڑک، پر راہ گیروں کی کچھ ایسی گہما گہمی نہیں ہوتی تھی، اس کا دوسرا کنارا ایک نہر کے لب سے لب ملائے تھا۔ زمین بے حد ڈھالو ہونے کے سبب ہر تہائی فرلانگ پر نہر کا پانی ایک جھال سے گرتا تھا اور دور تک نگاہ دوڑانے والے کے لیے یہ جھالیں بہت دل کش منظر پیش کرتی تھیں۔ جا بجا چوکور پتھروں کے فٹ فٹ بھر چوڑے پل بنے ہوئے تھے۔ ان کی شکل اونٹ کے کوہان کی سی تھی۔ نہر پہاڑوں کے سلسلوں میں سے نکل کر آتی تھی۔ اگر پہاڑ کی جانب منہ کر کے چلیں تو وہ دیوار ایک بڑے سے لکڑی کے سفید پھاٹک سے چند قدم آگے

جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ یہاں سے نہر ایک چھوٹے سے گاؤں گڑھی میں داخل ہوتی تھی۔ یہ گاؤں اس نہر کے دائیں بائیں بسے ہوئے چند مکانوں پر مشتمل تھا۔ وہاں گورکھوں اور گڑھوالیوں کی آبادی تھی۔ جابجا ہری بھری باڑوں میں سے بے بو کے جنگلی گلاب جھاڑیوں میں اپنی جھلک دکھاتے تھے۔ وہاں عجب خاموشی اور سکون کا راج تھا۔

اس گاؤں سے آگے نہر کی بیس بیس فٹ اونچی جھالیں بنی ہوئی تھیں جن کے زور سے پن چکیاں چلتی تھیں۔ آدھ میل سے کم اوپر جائیں تو ایک اور آبادی دکھائی دیتی تھی جس کا نام ڈاکرا تھا۔ وہاں بھی زیادہ گورکھوں کی آبادی تھی۔ کچھ سکھ بھی آباد تھے ان کا گوردوارہ بھی تھا۔ کبھی کسی تہوار کے موقع پر وہاں جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ شام کے وقت گورکھے اکثر تلی مچھلی یا کیکڑے کے پکوڑوں کی دکانوں کے ارد گرد منڈلایا کرتے۔ اس وقت کی نم ناک فضا مچھلی اور تیل کی بو سے بوجھل ہو جاتی تھی۔

یوں دون وادی ہی کوہ ہمالیہ اور کوہ شوالک کے سلسلوں سے تین طرف گھری ہوئی تھی۔ لیکن ڈاکرا وہ مقام تھا جو اس وقت میرے لیے دنیائے الف لیلیٰ کے ایک قلعہ سے کم وقعت نہیں رکھتا تھا۔ بے ڈول پتھروں کے بنے ہوئے مکانات اور ان پر رنگ برنگی چھتیں۔ صحنوں کی چار دیواری سے ابھرے اُبھرے پپیتے کے پیڑ، چھاج کی طرح لہراتے ہوئے کیلوں کے پتے۔ مکانوں کے بیچوں بیچ چوڑی نہر، نہر کے پانی میں رنگ برنگ بطخیں، ہموار سلوں کے بنے ہوئے پل۔ پن چکیاں پہاڑی چڑیاں و دیگر ننھے ننھے پرندے یوں دکھائی دیتے تھے جیسے رنگوں کے تودوں میں بجلی کی تڑپ سرایت کر گئی ہو ـــ میں نے بارہا چاہا کہ معلوم کروں کہ وہ نہر کہاں سے آتی تھی۔ وہاں میرا ایک گورکھا دوست تھا جس کے ہم راہ نہر کی پتھریلی منڈیر پر چلتے چلتے ہم دور تک نکل جاتے۔ لیکن نہر ہری بھری یا پھیکی چٹیل اور آپس میں گھڑی ہوتی ہوئی پہاڑیوں کی ڈھلانوں کے گھلے ملے غبار رنگین میں دل ربا نغمے کے مانند گم ہو جاتی تھی...... وہ نہر ایک نظم تھی...... ایک راگنی تھی۔

ڈاکرے کے ایک بازو پر تو اوبڑ کھوبڑ زمین پر دور تک پھیلے ہوئے کھیت تھے اور دوسرے بازو پر ایک گہری ڈھلان جس کے قدموں کو چومتا ہوا دریائے ٹونس بہتا تھا۔

لیکن پہلے میں ایک اور واقعہ سنادوں۔

موسم سرما کی ایک صبح کو میں نیکر باکر پہنے، پنڈلیوں تک پھندنے دار جرابیں چڑھائے۔ نعل جڑے کالے رنگ کے بوٹوں کو کھنکھٹاتا نہر کی ٹیڑی پٹڑی گڑھی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ میرے داہنے ہاتھ کو وہ دیوار تھی جو دیسی صاحب لوگوں کے بنگلوں سے گزر کر انگریزی صاحب لوگوں کے بنگلوں پر ختم ہوجاتی تھی۔ جب لکڑی کے سفید پھاٹک کے قریب پہنچا تو میں نے سوچا کہ نہر کے کنارے اُگی ہوئی برہمی اور پیپرمنٹ کی بوٹیوں کی پتیاں توڑ کر منہ میں ڈال لوں کہ اتنے میں قدرے انوکھی سی آواز سنائی دی۔ گھوم کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ بڑے پھاٹک کے اندر کی جانب کھڑا ایک انگریز مجھے بلا رہا ہے...... وہ چھوٹا ڈرل ماسٹر تھا۔ وہ نیا نیا آیا تھا۔ قریب چار چھ مہینے پہلے — بڑا ڈرل ماسٹر جس کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ ہوگی موچھوں پر فرنچ کریم لگا کر انہیں بچھو کے ڈنک کی طرح تانے رکھتا تھا۔ لیکن چھوٹے ڈرل ماسٹر کی موچھیں نہ تنی نہ گری ہوئی تھیں۔ اس کے سر اور چہرے کے بھورے بھورے بال بہت مہین اور نرم سے دکھائی دیتے تھے۔ عمر اٹھائیس کے قریب، دراز قد، وجیہہ اور حسین شخص تھا وہ ۔ اس نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا جب میں پاس پہنچا تو اس نے ٹوٹی پھوٹی پیش کی۔ انگریزی میں نام پوچھا میں نے انگریزی میں جواب دیا لیکن جلد ہی میری انگریزی کی لیاقت ختم ہوگئی...... اب اس نے کچھ کچھ ناک میں بولتے ہوئے اپنا مدعا بیان کرنے کی کوشش کی اور پھر تہ کیا ہوا ایک رقعہ دیا۔

اس کی مہین بھوری موچھیں، پیلے لیکن خوش وضع دانت، تیزی سے ہلتے ہوئے ہونٹ، اس کے وہ ہاتھ اور بازو جن پر اژدہا اور پریاں گدی ہوئی تھیں مجھے اب تک یاد ہیں — اس نے خود ہی رقعہ میری جیب میں ڈال دیا اور پھر ایک چھوٹے سے پھاٹک کی

طرف اشارہ کیا جو ہری بھری پتیوں اور رنگ برنگے پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ لیکن میں اس قدر چھوٹا تھا کہ اس پھاٹک کو پھاندنا بھی میرے بس کا روگ نہیں تھا۔ چناں چہ اس نے میری بغلوں میں ہاتھ دے کر مجھے ایک چڑیا کی طرح اوپر اٹھایا اور میں پھر سے اڑ کر باغیچہ کے اندر جا کھڑا ہوا۔

سامنے چند قدم کے فاصلے پر کوئی دو فٹ چوڑی نہر تھی جو باغیچے کو سیراب کرنے کے لیے بڑی نہر سے لائی گئی تھی میں اس کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ تیزی سے بہتے ہوئے صاف و شفاف پانی کی تہ میں رنگ برنگے سنگ ریزے صاف جھلک رہے تھے۔ نہر کمان کی طرح گھومتی ہوئی سبزیوں کے پودوں، جنگلی گلاب کی جھاڑیوں، کتا گھاس، بچھو بوٹی اور انچھو کی جھاڑیوں کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی— ایک فرلانگ جانے پر مجھے دور سے کھپریل والے چند معمولی سے مکان دکھائی دیتے جو آپس میں گڈ مڈ ہو رہے تھے، اور میرے سامنے نہر کی چھوٹی سی پلیا تھی جس پر ایک لڑکی بیٹھی تھی— اس کی عمر سولہ یا سترہ برس کی ہوگی اسے دیکھ کر پہلے تو میں جھجکا پھر بڑھا۔ اس کا دھیان میری جانب نہیں تھا۔ وہ ہاتھ میں گلاب کی لمبی سی شاخ تھامے اس سے نہر کے پانی کو ہلکے ہلکے پیٹ رہی تھی۔

میں قریب پہنچ کر چپ چاپ کھڑا ہوگیا۔

زندگی بھر میں دیکھی ہوئی حسین ترین صورتوں میں ایک وہ لڑکی تھی، پیشانی رخساروں اور آنکھوں سے کچھ کچھ منگولی اثر جھلکتا تھا۔ صرف ناک، گوسبک، لیکن تیکھی تھی۔ اس کے بال بہت لمبے نہیں لیکن خوب گھنے اور گیلے کوئلے کی طرح سیاہ تھے اس کی کلائیوں کی گدراہٹ نا قابل فراموش تھی اور ہاتھ یوں دکھائی دیتے تھے جیسے نرم و نازک شاخوں سے کونپلیں پھوٹ رہی ہوں۔ اس نے نیلا لہنگا اور زرد کرتا پہن رکھا تھا۔ کرتے کے اوپر شوخ سرخ رنگ کی واسکٹ جس پر سیپ کے بڑے بڑے بٹنوں کی بھرمار تھی۔ واسکٹ کے دونوں پلو ہوا میں پھڑ پھڑا رہے تھے کیوں کہ ایک بھی بٹن کاج میں اٹکا ہوا

نہیں تھا۔

معاً اس کا ہاتھ رکا۔ اسے میرے وجود کا احساس ہوا۔ اس نے سر گھما کر مجھے دیکھا...... چھوٹے قد کا دبلا پتلا بچہ، بانہیں اور ٹانگیں پتلی پتلی لیکن چہرہ بھرا بھرا۔ سر کے بال گھنگھریالے......

اس کی شفاف پیشانی پر ننھا سا بل ابھر آیا۔ غالباً اس کا موڈ ٹھیک نہیں تھا۔ اس وقت گورکھالی زبان میں بولی۔ "کو چھے ؟ کیا ہے؟ کیلائی آؤ نو ہو؟" (کس کام سے آئے ہو)

" میں گورکھالی اچھی طرح نہیں بول پاتا تھا۔ میں نے جواب دیا" میں دیورو پا سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"میرو ای نام دیورو پا ہو۔"

میں نے قدرے تامل کیا۔ پھر رقعہ آگے بڑھا دیا۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو وہ رقعہ ہندی میں لکھا ہوا تھا۔۔۔ غالباً لکھوایا گیا تھا۔ خاصہ طویل رقعہ تھا۔ اس دوران میں جبکہ وہ رقعہ پڑھ رہی تھی میں زمین میں گڑے ہوئے کھونٹے کی طرح کھڑا رہا۔ پڑھتے وقت اس کی انگلی لفظوں کا پیچھا کرتی ہوئی بائیں سے دائیں حرکت کر رہی تھی، ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے۔ گو آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ ابرو پلک رہے تھے۔ خدا خدا کر کے رقعہ ختم ہوا تو دیورو پا نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے داب کر کن انکھیوں سے میری جانب دیکھا...... اور پھر دفعتاً کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے دانت چھوٹے، سپید اور شفاف تھے۔ دونوں بازو پھیلا کر وہ نغمہ ریز ہوئی۔۔۔ "ایتا اودُں نو ہس" (ادھر آؤ)

اس نے میرے روکھے سوکھے ہاتھ پکڑ لیے اور انہیں اپنی گردن کے گرد حمائل کر کے بغل گیر ہوگئی۔ میں حیرانی اور بوکھلاہٹ کے مارے جلد جلد آنکھیں جھپکا رہا تھا۔ اور میری پلکیں اس کی اُجلی اور نرم گردن پر چابک کی طرح برس رہی تھیں۔

جب اس نے مجھے الگ کیا تو اس کی آنکھیں پرنم تھیں...... وہ دوڑ کر قریب کے مکان سے گڑ چڑھے سیو لے آئی اور مجھے گود میں بٹھا کر بولی:

''یہو مٹھائی کھالو ہس''

میں بری طرح شرما رہا تھا۔ میرے اصرار پر اس نے مجھے گود سے اتار دیا اور میری خواہش کے مطابق دوسرے راستے سے گاؤں کی ایک اور سڑک تک مجھے رخصت کرنے آئی۔ اس کے پیار دلار سے گھبرایا ہوا میں بڑی نہر کے اس پل پر جا کر بیٹھ گیا جہاں سے پانی دو نہروں میں بٹ جاتا تھا...... میرے پاؤں نیچے کو لٹکے ہوئے تھے، نظریں رنگین بلبلوں پر جمی تھیں، ہاتھ سے سیو ایک ایک کر کے منہ میں ڈال رہا تھا اور ذہن...... ذہن دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

میں دریائے ٹونس کا ذکر کر رہا تھا۔ یہ کہنے کو دریا لیکن دیکھنے کو نالہ تھا جو برسات میں بپھر اٹھتا۔ یہ دریا، دو اونچے اونچے کناروں میں دبکا ہوا ٹپکیشور جی کے مندر کے آگے سے بہتا تھا۔ شو جی اور پاربتی جی کا یہ مندر ایک گپھا میں واقع تھا جہاں ہر سال میلہ لگتا تھا۔ مندر سے کھردرے پتھروں کی خوب چوڑی سیڑھیاں اوپر چڑھتی ہوئی ایک نیم ڈھالو زمین کے ٹکڑے پر ختم ہوجاتی تھیں۔ پکوڑوں والے، چاٹ کلفی والے، بزاز اور بساطی، غبارہ اور پٹاخہ فروش سب یہیں رونق افروز ہوتے تھے۔ انتظام کے لیے اسکاؤٹ اور پولیس موجود رہتی۔ یہاں بوڑھے، بچے عورت، مرد، فوجی، شہری سبھی لوگ جوق در جوق جمع ہوتے تھے۔ ان میں سے نوجوانوں کا طبقہ اکثر نٹنیوں کے رقص سے لطف اندوز ہونے کے لیے انہیں گھیرے رہتا۔

جے پور اور اجمیر کی نٹنیوں کے متعدد گروہ میلے میں شامل ہوتے۔ ان کے ہم راہ ایک مرد ڈھولک بجاتا دوسرا سارنگی، اور نٹنیاں سر پر چونک جمائے اور چندری کا ایک کونا ان کی نوک پر اٹکائے بڑے فخر سے گاتیں، ٹھک ٹھک ناچتیں اور ناچ ناچ کر چک

پھیریاں لیتیں۔ یار لوگ انہیں دیکھ دیکھ کر خشک ہونٹوں پر جیبھ پھیرتے۔ پھر جس کسی کو اکنی دونی دکھائی جاتی وہ کولھے مٹکاتی قریب آن کھڑی ہوتی اور سکہ دینے لینے کے دوان میں انگلیاں الجھتیں، مڑتیں، ٹوٹتیں— ہلکی آہوں کے ساتھ اوئی جی...... ہائے رام جی...... کی سرگوشیاں، سبک خرامیاں کرتی ادھر سے اُدھر نکل جاتیں۔

بعض اوقات بڑے دل چسپ واقعات پیش آجاتے۔ ایک مرتبہ ایک بھاری بھرکم پچاس سالہ داروغہ کے پاس ایک چودہ سالہ لڑکا کسی لفنگے کی آستین کھینچتا ہوا آیا، شکایت کی کہ اس نے ہمارا جھمھن لے لیا ہے۔ کوتوال نے لفنگے کو زور سے ڈانٹا اورنہایت سنجیدگی سے لڑکے کو چومتے ہوئے پدرانہ شفقت کے ساتھ بولے۔ ''جاؤ بیٹا کھیلو''

آج کل جذبات کے اظہار سے ہم گھبراتے ہیں۔ حالاں کہ انسان پہلے کہ بہ نسبت کہیں زیادہ جذباتی ہو چکا ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں چاہتا کہ وہ جذبات کی رو میں بہہ جائے۔ یا اگر بہے تو کوئی غیر اسے دیکھے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جذبات کے بارے میں یہ رویہ اختیار کرنے سے ہم تکان زدہ ہوجاتے ہیں...... سردست میں یہ فتویٰ تو نہیں دوں گا کہ کون سا رویہ اختیار کرنا مستحسن ہے۔ لیکن میں اس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ بچپن میں بالخصوص کوئی بھی شے مجھے مسحور کرسکتی تھی۔ پیڑ کی چھاؤں، پرندے کی پرواز، آسمان کا رنگ، نہر کا پانی، بادل کی گرج، بارش کی بوچھاڑ، پہاڑی لڑکوں کے بول، پھولوں کی مہک ، پہاڑیوں کے آڑے ترچھے خطوط، چھوٹے موٹے کیڑے، جھاڑیوں کی ہریالی، بئے کا گھونسلہ — ایسی ان گنت چیزیں......

تنکے تنکے سے پیار کرتے، کلی کلی کے لیے آہیں بھرتے، بوٹے بوٹے کو گلے لگاتے ذرے ذرے سے آنکھ لڑاتے، جھونکے جھونکے سے کندھا بھڑاتے، گیت گیت پر آنسو بہاتے ، نغمے نغمے پر دل گنواتے...... زندگی بسر کرنے کا انداز بھی ایک انداز تو ہے...... لیکن یہ انداز کسی بے حد مجبور ہی کا انداز ہوسکتا ہے...... جس کے لیے اس کے

سوا کوئی چارہ کار ہی نہ ہو۔

ہمارے شہر سے چند میل کے فاصلے پر پہاڑیوں کے دامن میں گندھک کے پانی کا ایک چشمہ تھا جو ایک ندی کے کنارے قریب ہی تھر کتا رہتا تھا اور جسے بالآخر ندی اپنی گود میں بہا کر لے جاتی تھی۔ ہر دو جانب سر بلند پہاڑیوں کے درمیان یہ ندی اپنے مخملی کناروں، لہلہاتے پھولوں اور رنگ برنگی چٹانوں سمیت بہت ہی دل ربا منظر پیش کرتی تھی۔ پہاڑی کے سینے میں ایک گپھا تھی جہاں بارہوں مہینے پانی ٹپکتا رہتا تھا۔ اگر باہر آگ برس رہی ہو تو بھی گپھا کے اندر پہنچ کر انسان کے دانت کٹکٹانے لگتے تھے۔ وہاں اکثر دور دراز سے لوگ آتے تھے، قریب کے مندر میں گوشہ گیر مورتیوں کے درشن کرنے اور گندھک کے پانی میں نہانے کے لیے۔

ایک روز میں وہاں پہنچا۔ اس وقت میری عمر چودہ برس کے لگ بھگ ہوگی مجھے گندھک کے پانی سے زیادہ دل چسپی نہیں تھی۔ اس لیے میں نے لنگوٹ کسا اور کپڑے بغل میں داب کر ندی میں سے اس گوشے کی جانب بڑھا جہاں مچھلیاں ملنے کی امید تھی۔

جہاں پانی ذرا گہرا تھا وہاں چند گورکھالی لڑکیاں نہا رہی تھیں۔ ان کی موجودگی سے غافل ان کے قریب سے گزر کر میں نے ریت میں سے ابھرے ہوئے ایک پتھر پر پاؤں رکھا تو ان میں سے ایک کی آواز آئی۔

''ہرنوہس'' اوکٹیا کو گوڑکتی رامرو چھو (دیکھو اس لڑکے کے پاؤں کتنے سندر ہیں۔)

میں نے گھوم کر دیکھا۔ بات کہنے والی تو منہ پھیر چکی تھی۔ لیکن ایک ...... جو مجھے سب سے اچھی لگی...... میرے پاؤں سے نظر جلدی سے نہ ہٹا سکی۔

اس دنیا...... اس وادی گیاہ و گل میں پہلے پہل قدم رکھنا کس قدر سہانا لگتا تھا۔

یہ عشق کا قصہ نہیں...... حرص و آرزو کی داستان نہیں......

اگلے دو گھنٹوں میں ہمارا متعدد بار آمنا سامنا ہوا...... لڑکی کے دل معصوم

چور...... سہا سہا اس کی چھوٹی لیکن چکیلی آنکھوں میں آن بیٹھا تھا۔

حسن میں وہ یکتا نہ سہی لیکن اس کے رشکِ گل سڈول جسم سے پیار کے سوتے پھوٹ نکلے تھے۔

آخر کار جب ان کا خاندان روانہ ہوا تو انہوں نے ندی کے کنارے کنارے رینگتی ہوئی اور بالآخر طرح دار پہاڑیوں میں کھو جانے والی پگڈنڈی اختیار کی۔

میں مدھم دھوپ میں لہراتے ہوئے ان کے شوخ رنگ کے کپڑوں کو دیکھتا رہا۔ ان کپڑوں کے ایک ہیولے میں دھڑکتے ہوئے دل کی دھڑکن سنتا رہا۔ اس نے بھی مجھے گھوم گھوم کر اچٹتی ہوئی نظروں سے دیکھا...... طفلانہ تجسس سے لبریز نظریں— یگ بیت گئے...... بڑے ہو کر بھی جب کبھی اُدھر گیا تو بے اختیار اُن راہوں کو تکتا رہا...... ڈرتا ہوں کہ اگر جدید سائنس نے گم ہوتی ہوئی راہوں کی ساری منزلیں پالیں تو باقی کیا بچے گا؟

یہ اور اس قسم کے بیسیوں لیے شبنم کی طرح بربط آحساس پر رقص کرتے ہیں اور ساغرِ دل کیف و کسک سے چھلک جاتا ہے۔

Gone, Gone for ever

Down the river of no return

یہ افسانہ 'آج کل دہلی' جنوری 1958 میں شائع ہوا تھا۔ کسی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ کلیات میں پہلی بار شائع کیا جارہا ہے۔

چالان

رات کے ساڑھے نو بجے تھے۔

لبرٹی سینما ہاؤس نے شو ختم ہونے کے بعد جب ان تین دوستوں کو باقی لوگوں کے ساتھ اگل کر باہر پھینکا تو انہوں نے اپنے سامنے ایک اکے والے کو کھڑا پایا۔

"مالک اکہ چیے؟"

سینما کی عمارت دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ بیسیوں ننھے منے بلب اپنی مجموعی روشنی سڑک پر اور سڑک کے اس پار لکڑی کے تختوں کی بنی ہوئی دکانوں پر پھینک رہے تھے۔ ان میں ایک پنواڑن کی دکان بھی تھی، جس نے اپنی دکان پر ایک ہزار واٹ کا ایک ہی بلب لگا رکھا تھا۔ گویا سو سنار کی اور ایک لوہار کی۔

تینوں دوست اُجلی دھوتیاں اڑاتے پنواڑن کی دکان پر پہنچے۔ پنواڑن کے چہرے کی ٹکیا پرکشش تھی۔ عمر لگ بھگ تیس برس، آنکھیں بس بھری، ہونٹوں پر دھڑی بھر مستی اور تولہ بھر ہنسی۔

سگریٹوں کے رنگ برنگے ڈبوں کی دیوار کے بیچوں بیچ جڑے ہوئے قد آدم آئینے میں انہوں نے دیکھا کہ اکے والا اب بھی اپنے سوال کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ چنانچہ ایک نے جواب دیا۔ "نہیں چیے"

"انہیں معلوم نہیں تھا کہ اٹھے والا ان کے محلّے میں نیا ہی آیا تھا۔ وہ انہیں پہچانتا تھا۔ اسی لیے تو اس کا دل ان پر پھسل پڑا تھا۔ رات کا وقت تھا، گھوڑا تھک گیا تھا۔ اُسے کھولنا تھا، محلے کی سواریوں سے پیسے بھی مل جائیں گے اور وہ مزے سے گھر پہنچ جائے گا۔ بولا: "ہم آپ کو چینت (پہچانتا) ہے مالک۔ ہم بھی آپ کے محلے میں رہتے ہیں.....آپ گھر تو چلیو ہی کر ہو.....سرک پر رات تو نہ گجا رو گے....."

وہ گھڑی دو گھڑی پنواڑن سے چہل کرنا چاہتے تھے بولے۔ "ہمیں لیم گی۔"

"کیا کم ہے جی"

لنگے والے کے پوپلے منہ سے کیا کم ہے جی کے الفاظ سجے نہیں۔

تینوں دوستوں میں سے دو بہت بھاری بھرکم اور تیسرا بہت چھوٹے قد اور اکہرے بدن کا شخص تھا۔ دونوں موٹوں کے چہرے صفا چٹ تھے۔ لیکن کاغذی پہلوان کی خوب پلی ہوئی مونچھیں موجود تھیں۔ اس کی گھنی اور لمبی مونچھیں مصنوعی سے دکھائی دیتی تھیں۔ جیسے بارہ برس کے لڑکے نے دو آنے والی مونچھیں نتھنوں میں اڑا رکھی ہیں۔ دونوں موٹے منہ اوپر اٹھا کر پان کی پیک کو روکتے ہوئے خوب قہقہے لگا کر ہنستے تھے لیکن مونچھوں والا اس انداز میں ہنسنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کی باچھیں محض ذرا چر جائیں اور پھر بھی نہ پاتیں کہ پھر سمٹ کر اپنی جگہ پر پہنچ جاتیں۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ اگر وہ مونچھیں منڈوا دے اور دیگر لوگوں کی طرح بے تحاشہ ہنسنے لگے تو اس کا رعب اور شان خاک میں مل جائیں گے— پان کھا کر جب وہ چلنے کو ہوئے تو پنواڑن نے مہین آواز میں کہا "اجی! کہاں چلے، ٹھاکر تو تمہارے لیے سپاری بنا رہا ہے۔"

سٹے باز ٹھاکر اونچے قد کا لال لال ڈوروں والی میلی کچیلی آنکھوں لیکن متجسس نظروں والا انسان تھا۔ اس وقت وہ اپنی چوڑی چکلی ہتھیلیوں میں مسالہ ملے سپاری کے ٹکڑوں کو مسل رہا تھا۔

"یہ مرا بھتیجا ہے۔" پنواڑن نے بتایا۔ "ہمیں نے کہا بھیا ہمارے کھاس گاہک ہیں بابو جی جرا سپاری تو بنا دے۔"

"اجی۔" ان میں سے ایک موٹے نے آنکھ بھینچ کر کہا۔ "تمری ان ہی باتوں

نے تو راتوں کی نیند اڑا دی ہے۔"

ہو ہاہا...... ہو ہاہا— سب ہنسے۔

اکے والا اب بھی کاٹھ کا الو بنا کھڑا تھا اور تو اور اس کا نہایت دبلا پتلا مریل گھوڑا ایک ٹانگ اٹھائے تین ٹانگ پر بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ جیسے کسی نے جادو کے زور سے اُسے جوں کا توں بنا دیا ہو۔

خدا خدا کر کے ٹھاکر نے سپاری مسلنا، رگڑنا اور گھسنا ختم کیا۔ دونوں موٹے سپاری کے ٹکڑے پھانک کر بڑے زور سے ہنسے اور پھر یکلخت خاموش ہو گئے۔ مونچھوں والے کی باچھیں چریں اور پھر سمٹ کر اپنی جگہ آ رہیں— ان کا ہنسنا یا مسکرانا کسی جذبے کے تحت معلوم نہیں ہوتا تھا بلکہ یوں لگتا تھا، جیسے ان کے بدن میں بٹن لگے ہیں۔ بٹن دبا تو ہنس دیئے اٹھایا تو چپ۔

لیکن پٹواڑن کے ہونٹوں پر تولہ بھر مسکراہٹ جوں کی توں موجود تھی— ٹکسالی مسکراہٹ۔

اب سواریاں اکے کی طرف بڑھیں۔ ایک موٹا بیٹھا تو اکہ پیچھے سے بولا۔ دوسرا موٹا بیٹھا تو چیں کی سی آواز آئی اور جب مونچھوں والا آگے کو جوان کی برابر بیٹھا تو کچھ بھی نہ ہوا— گھوڑا اس کارروائی سے بے خبر، بغیر کان پھڑکے سادھی میں مگن سنیاسی کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہا۔

اکے والے نے لگام تھامی ہی تھی کہ مونچھوں والے نے اُسے روک دیا۔ سامنے سڑک کے اوپر ریل کے پل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"تھم کھاؤ— گاڑی آ رہی ہے، اسے گذر جانے دو۔"

پھر اس نے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "یار اوپر سے گاڑی گزر رہی ہو تو نیچے سے جانے میں ڈر لگتا ہے۔ بھئی اگر اوپر سے کوئی موت رہا ہو تو؟"

اور تمہاری مونچھیں بھیگ جائیں...... اس کے ساتھیوں میں سے ایک نے کہا اور

پھر دونوں موٹوں کے قہقہے گاڑی کی گڑگڑاہٹ میں گھل مل گئے۔

گاڑی گذر گئی تو لگام کھینچی، چھڑی لہرائی اور گھوڑے نے کل کی طرح ہنے تلے قدموں سے مستانہ چال دکھانی شروع کر دی۔

''ہے بیٹا— چل بیٹا۔'' اکے والے کی للکار گونجی۔ لیکن ہنواڑن کی مسکراہٹ کی طرح گھوڑے کی چال بھی بندھی ہوئی تھی۔ چیخنے، چلّانے، مار پیٹ یا گالیوں سے اس کی چال میں فرق نہیں آ سکتا تھا۔

ان کی منزل شہر سے قریب دو میل پرے تھی۔ کچھ دیر بعد اکہ شہر کے بازار سے نکل کر کھلی سڑک پر چلنے لگا۔ دائیں بائیں کوٹھیوں پر شمشان کی سی خاموشی طاری تھی۔ گھوڑے کے سم ایک ہی تال پر کھٹا کٹ بول رہے تھے۔

گھوڑے کی مستانہ چال سے اکتا کر ایک موٹے نے اکے والے سے کہا۔

''کیوں میں! اس گھوڑے کی چال کتنی بڑھتی نہیں ہو سکتی؟''

''اجی ہو جی...... یہ بڑ نر گھوڑا ہے۔ آپ کو ایسا تماشہ دکھاؤں کہ آپ حیران رہ جائیں۔

''امیں سچ؟''

''ابھی لیجئے— میں گانا گاؤں گا اور گھوڑا کھش ہو کر بھاگے گا۔''

یہ کہہ کر اس نے کانوں پر ہاتھ رکھا اور پھٹے بانس کی سی لے اٹھائی۔ اور سچ مچ گھوڑے نے تیز دوڑنا شروع کر دیا۔

جس آواز اور لے میں وہ گا رہا تھا اسے گانا کہنا گانے کی توہین کرنا تھا، ایک سواری نے کہا۔ اماں یہ گانے سے کھش ہو کر نہیں ڈر کر بھاگ رہا ہے۔''

اس پر قہقہے بلند ہوئے۔

گانا گونج رہا تھا اور قہقہے اڑ رہے تھے کہ ایک چوراہے کے بیچ والے سائبان تلے سے سیٹی کی تیز آواز سنائی دی۔

''اکّہ روکو'' تحکمانہ لہجہ میں سپاہی نے کہا۔

اکّہ رک گیا۔

اکّے والا حیران تھا کہ اُسے روکنے کی کیا وجہ تھی، پیشتر اس کے کہ وہ کچھ سمجھ پاتا سپاہی نے آگے بڑھتے ہوئے ڈپٹ کر کہا۔'' تمہاری لائٹ؟''

اکّے والے نے بے اختیار لیمپ کی طرف اشارہ کیا۔

''اسے لیمپ تو مجھے بھی دکھ رہے ہیں۔ لیکن انہیں جلایا کیوں نہیں۔''

''جلا ہے مالک!...... ارے بجھ گیا' جلایا تھا......''

''جلایا ہوگا اس وقت تو بجھا ہے نا۔''

''مالک میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔''

سپاہی نے ٹارچ کا بٹن دبا کر روشنی اکّے پر ڈالی۔''کیا نمبر ہے تمہارا؟''

''صاحب لیمپ جلا تھا— آپ ان سواریوں سے پوچھ لیجئے۔''

''پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے دونوں لیمپ بجھے ہوئے دیکھے ہیں۔''

سواریوں میں سے بھی کسی نے اکّے والے کی حامی نہیں بھری کیوں کہ انہوں نے خیال نہیں کیا تھا کہ لیمپ جلے تھے یا نہیں؟ سپاہی نے بھورے رنگ کی نوٹ بک پر نمبر لکھ لیا۔''اچھا تمہارا نام ہے؟''

''صاحب نام تو بھگوان کا ہے...... میرا کیا نام ہے۔''

سپاہی یہ سن کر جھلایا نہیں لیکن خوش بھی نہیں ہوا۔ دھیمی لیکن مضبوط آواز میں بولا۔''جلدی سے نام بتاؤ۔''

''میرا چالان مت کیجئے، میں بے موت مر جاؤں گا صاحب۔''

''دیکھو تم نے قانون توڑا ہے۔ اس لیے تمہارا چالان ضرور ہوگا۔''

''صاحب! میرے بچے پہلے ہی بھوکوں مر رہے ہیں۔''

''ارے تمہیں کوئی جیل میں نہیں ڈال دے گا۔ ذرا جرمانہ ہو جائے گا۔''

"صاحب میں جرمانہ نہیں دے سکتا ہے۔ اکے والے نے گلو گیر آواز میں کہنا شروع کیا۔" پچھلے مہینے بھی میں نے جرمانہ دیا تھا تو آنے کے لیے ایک دمڑی تک نہ بچی تھی۔"

"اچھا تو تم عادی مجرم ہو۔ تب تو تمہارا چالان ضرور ہوگا۔"

اتنے میں کچھ راہ گیر بھی حلقہ باندھ کر کھڑے ہوگئے۔

سپاہی نے پھر کہا۔ "بولو بھئی اپنا نام بتاؤ میری ڈیوٹی ختم ہوگئی ہے مجھے گھر جانا ہے۔"

"حضور آپ کو گھر جانے سے کون روک سکتا ہے...... اب کے ماپھ کردیں۔"

" تم نے پہلے بھی جرمانہ بھرا ہے لیکن تمہیں پھر بھی عقل نہیں آئی۔ یہ معافی وافی کی بات جھوٹی ہے۔ چالان ضرور ہوگا۔"

"صاب مو کے کی بات ہے غلتی بھی تو ہو جاتی ہے۔"

"قانون یہ سب نہیں جانتا۔ تم نے قانون توڑا تمہیں سزا ملنی چاہیے۔"

"پر سرکار میرے لیمپ جلے تھے۔ میں نے کھد جلائے تھے۔"

"وہ سب ٹھیک ہے میں نے تمہارے لیمپ بجھے دیکھے۔ تم نے خود بھی دیکھے۔"

"ہاں صاب دیکھے بیچ کھیت کے دیکھے۔"

"تو بس پھر نام پتہ بتاؤ اور جھگڑا چکاؤ"

اکے والے نے لاچار نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ تماشائی بغلوں میں ہاتھ دبائے چپ چاپ کھڑے تھے۔ ان کے چہرے جذبات سے خالی تھے۔

اتنے میں سوٹ بوٹ پہنے یونیورسٹی کے دو نوجوان ادھر سے گزرے۔ بھیڑ دیکھ کر رک گئے۔ اکے والے اور سپاہی کی باہمی گفتگو سن کر وہ آپس میں کھسر پسر کرنے لگے۔ ایک نے دوسرے کے کان میں کہا۔" یار یہ کیا جھنجھٹ ہے۔ اگر یہ اس کا چالان نہ بھی کرے تو کیا حرج ہے؟"

''اس نے قانون توڑا ہے۔'' دوسرے نے سرگوشی میں جواب دیا۔
''مان لیا لیکن چالان نہ بھی ہو تو کون سی آفت آجائے گی۔''
''تو پھر قانون بنانے کا فائدہ ہی کیا۔''
''ٹھیک ہے قانون انسان کے لیے ہے۔ انسان قانون کے لیے نہیں بنا۔''
''تو ہم لوگ بغیر قانون بنائے کیوں نہیں رہ سکتے؟''
''چھوڑو یار' قانون بھی بن گیا تو کیا ہے..... دیکھو کس قدر غریب شخص ہے یہ۔ اس کے بدن پر لٹکتے ہوئے چیتھڑے دیکھو۔''
''میرے دیکھنے سے کیا ہوتا ہے— قانون یہ چیزیں نہیں دیکھتا..... وہ صرف سزا دیتا ہے۔''
''صرف سزا دیتا ہے ہونہہ..... میرے خیال میں اس غریب کو کافی سزا مل چکی ہے۔''
''شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن سپاہی قانونی کارروائی کر رہا ہے..... وہ اسی کام کی تنخواہ پاتا ہے۔''
''میرے خیال میں اگر وہ چالان نہ بھی کرے قانون کا کچھ نہیں بگڑ جائے گا۔''
''میرے خیال میں اگر وہ چالان کرتا ہے تو محض اپنا فرض ادا کرتا ہے اسے برا یا غلط نہیں کہا جا سکتا۔''
اس پر پہلے نوجوان نے گرمی میں آکر کچھ کہنا چاہا تو دوسرے نے روک دیا۔
''چھوڑو اپنی قانون دانی کو..... سینما شروع ہونے والا ہے۔ چلو باقی بحث وہیں پر کریں گے۔ آخر یہاں ہماری باہمی بحث سے یہ مسئلہ تو حل ہو نہیں جائے گا۔''
وہ دونوں چپ چاپ آگے بڑھ گئے۔
ذرا پرے کچھ کتے مستی میں آکر چہل کر رہے تھے۔
کانسٹیبل نے قدرے جھنجھلا کر کہا۔ ''دیکھو بوڑھے میں تم سے کوئی بے جا بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ نام بتاؤ اور جاؤ' میں نے تمہیں گالی نہیں دی' مارا نہیں' رشوت نہیں

مانگی۔ صرف نام پوچھتا ہوں — میں صرف اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔'' .

ایک موٹے نے دوسرے موٹے سے پوچھا۔ ''آپ کے سنتے کاز کام کیسا ہے اب۔''

مجبور ہو کر اٹھنے والے نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ ایڑیاں اٹھیں اور اس کے گھٹنے آگے کو جھکے اور وہ زمین پر دو زانو ہو کر بیٹھ گیا...... اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ صرف ہونٹ کانپ رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو بہہ رہے تھے۔

سپاہی نے بھاری اور دکھی آواز میں کہا۔ '' یار عجیب آدمی ہے اپنی مجبوری جتا رہا ہے پر میری مجبوری کو نہیں سمجھتا۔'' پھر اس نے بوڑھے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اوپر اٹھایا اور نرم آواز میں بولا۔ '' دیکھو مجھے تم سے دشمنی نہیں ہے۔ میں تمہیں برا یا بدمعاش بھی نہیں کہتا لیکن تمہیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ اگر میرے سامنے قانون شکنی ہوگی تو میں چالان کرنے پر مجبور ہوں...... ایسا نہ کرنا نمک حرامی ہوگی......''

بوڑھے نے مایوس ہو کر مجمع کے لوگوں کی طرف دیکھا۔ '' بھائیو یہ سچ کہتے ہیں لیکن میں بوہت گریب ہوں۔ آپ میری سپھارش کر دیجئے۔''

زیادہ تر لوگ چپ رہے۔ ایک دو نے دبی آواز میں کہا۔ '' ہم کیا کر سکتے ہیں؟''

بوڑھے نے پھر سپاہی سے کہا۔ تھو رلیمپ ہوا سے بجھ گیا ہوگا۔''

'' ہوسکتا ہے۔ لیکن میں نے جب دیکھا تو لیمپ بجھے ہوئے تھے۔ میں دیکھا ان دیکھا نہیں کرسکتا— میں نے کبھی رشوت نہیں لی۔ کبھی کسی کو گالی نہیں دی کبھی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا...... کبھی کسی بے گناہ کو تنگ نہیں کیا— لیکن ساتھ یہ بات بھی ہے کہ میں نے کبھی کسی قانون شکنی کرنے والے کو چھوڑا بھی نہیں۔

''ہاں میں نے قانون توڑا مگر میں بوہت گریب ہوں...... مجھے جرمانہ ہو جائے گا۔''

یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

مونچھوں والے نے للکار کر کہا۔ ''اماں مرد بنو مرد۔''

اکے والے نے دم بھر کو رونا دھونا بند کیا' اور آنسوؤں کی چادر میں سے آنکھیں مونچھوں والے کی آنکھوں میں ڈال کر کہا۔ ''ہیو جی میرے آٹھ بچے ہیں۔ پورے آٹھ بچے..... کیا میں مرد نہیں ہوں۔

سب لوگ ہنسنے لگے۔ مونچھوں والے نے (جس کا ایک بچہ بھی نہیں تھا) تاؤ میں آ کر کہا۔ '' سالے نام کیوں نہیں بتا دیتا..... کیا ہم ساری رات یہیں رہیں گے؟''

بوڑھے نے پھر رونا شروع کر دیا۔ اس کی شکل دیکھ کر ہنسی آتی تھی۔ وہ رونے دھونے کے دوران اپنے منہ کو ٹیڑھا میڑھا کرنے اور ہونٹ بسورنے سے ذرّہ برابر نہیں ہچکچاتا تھا......

اس نے آسمان کو دیکھا پھر شہر کی طرف...... اس مہذب شہر کی روشنیوں کا غبار آسمان کے اتھاہ اندھیرے میں سہا سہا دکھائی دیتا تھا۔

آخر کار سپاہی نے اس کا نام اور پتہ نوٹ کر لیا تو بڑبڑاتا ہوا ایک طرف کو چل دیا۔ ''سمجھ میں نہیں آتا عجیب لوگ ہیں۔ قانون شکنی کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ چالان بھی نہ ہو۔''

اکے والا سسکیاں بھرتا ہوا اکے پر سوار ہو گیا اور ایک بار پھر اکہ ٹک ٹک کرتا چل نکلا۔

لوگوں کا مجمع بکھر گیا۔ صرف دو میاں بیوی رہ گئے جو پاس کی کوٹھی سے ٹہلنے کے لیے نکلے تھے لیکن بھیڑ دیکھ کر رک گئے اور بحث مباحثہ سنتے رہے۔ اب وہ بھی آگے بڑھ گئے۔ پتی دیو پروفیسر تھے۔ اکثر اپنے خیالات میں گم رہتے۔ ذرا سی بات کو گھنٹوں سوچا کرتے۔

پتنی کچھ مہینوں تک ماں بننے والی تھی۔ ابھی تک اس نے یہ راز پتی کو نہیں بتایا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ سنیں گے تو ناچ اٹھیں گے۔ اس نے یہ بھید کھول دینے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔

لیکن جب اس نے شرما اور لجا کر بات کہی تو پتی دیو ہوا میں ہی دیکھتے رہے۔ جیسے انہوں نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ پتنی کو بڑا غصہ آیا وہ جانتی تھی کہ وہ اکثر اپنے خیالات میں گم رہتے تھے۔ لیکن ایسا بھی کیا......

تھوڑی دور جاکر پتی کو احساس ہوا کہ شریمتی جی خفا ہیں۔ اس کی واقعی یہ بری عادت تھی کہ اکثر بے توجہی میں سنی بات اَن سنی کر دیتا تھا۔ چنانچہ اس نے فوراً بیوی کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''ارے تم کچھ کہہ رہی تھیں۔ میرا دھیان کسی اور طرف تھا۔ تم......تم کسی بچے کے چالان کی بات کر رہی تھیں۔''

''بچے کا چالان؟'' یہ کہتے کہتے پتنی کے چہرے کی سوجن دور ہوگئی—— اور وہ اٹھلا کر ہنس دی۔

یہ افسانہ 'سالنامہ پگڈنڈی'، امرتسر' 1959 میں پہلی بار شائع ہوا۔ کسی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ کلیات میں پہلی بار شائع کیا جارہا ہے۔

صابن کی ٹکیہ

شوبھا مجھ سے خفا تھی — اور میں بے حد پریشان تھا...... اس کا خفا ہونا بھی جائز تھا اور میرا پریشان ہونا بھی برحق۔

بات در اصل یہ تھی...... اب کیسے بتاؤں؟ آپ مرد کی فطرت یا کمزوری سے واقف تو ہیں ہی...... وہی پرانا قصہ تھا کہ محبت کا دعویٰ تھا شوبھا سے لیکن دیکھے گئے لتا کے ساتھ...... بے چاری شوبھا خفا نہ ہوتی تو کیا کرتی۔ ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ مجھے پیار شوبھا ہی سے تھا یوں کبھی کبھی لتا سے دو چار میٹھی بتیاں بھی ہو جایا کرتی تھیں۔ اسی لیے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے۔

چناں چہ ایک بہت لمبا چوڑا کچا چٹھا لکھ کر شوبھا کی خدمت میں روانہ کیا جس میں اپنی صفائی کے لیے نہ صرف ہر ممکن اور ناممکن دلیل سے کام لیا گیا بلکہ کان پکڑ کر ناک سے لکیریں نکالیں...... صرف ایک ملاقات کے لیے درخواست کی گئی۔ یہ بھی لکھا کہ لتا کو تمہاری جوتی صاف کرنے کے قابل نہیں سمجھتا بے شک چاہو تو یہ چٹھی اسے دکھا دو۔ اگر ہمارے تعلقات ہیں بھی تو لتا جل کر خود انہیں ختم کر دے گی۔

اس چٹھی کے جواب میں ملاقات والی درخواست ایک فقرے میں قبول کی گئی تھی۔ ملاقات کے لیے جگہ تھی پارک کے ایک خاص گوشے میں بوسیدہ بینچ۔ اٹھارہ لاکھ

کی آبادہ کا شہر تھا۔ یہ پارک اس کی سوسی کے مکان سے بہت دور تھا۔ وہ یہاں پڑھنے کے لیے آئی تھی اور سوسی کے ہاں مقیم تھی۔

موسم سرما میں دن بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ ساڑھے چھ بجے ملاقات کا وقت مقرر ہوا تھا لیکن میں اس قدر پریشان تھا کہ وقت سے پون گھنٹہ پہلے پہنچ گیا۔ اس وقت بھی تاریکی نے پر پھیلا دیے تھے۔ جلد پہنچنے میں ایک مصلحت بھی تھی وہ یہ کہ اپنی پسندیدہ بنچ پر پہلے ہی سے قبضہ جما لیا جائے۔

یوں تو اس طویل و عریض پارک میں بیسیوں بنچیں بچھی تھیں لیکن ہماری محبوب بنچ سب سے الگ تھلک ایک گھنے پیڑ کے تلے بچھی تھی یا زمین میں گڑی تھی۔ دور سے دیکھا تو ایک بزرگ کو اپنی بنچ پر تشریف فرما پایا۔ انہیں دیکھ کر زیادہ کوفت نہیں ہوئی کیونکہ ابھی شوبھا کے آنے میں پون گھنٹہ باقی تھا اور مجھے اس بات کا بھی پختہ یقین تھا کہ یہ بزرگ اس قدر سردی میں زیادہ دیر تک بیٹھے نہ رہیں گے۔ چنانچہ میں ان کے پہلو میں جا بیٹھا۔ حضرت میری موجودگی سے کچھ ناخوش سے نظر آنے لگے۔ سینہ پر ہاتھ رکھ کر کھانستے بھی جا رہے تھے۔ غالباً برانکائیٹس کے پرانے شکار تھے۔ میری باچھیں کھل گئیں۔ ایسے آدمی کے لیے ٹھنڈی نم دار ہوا قطعاً نقصان دہ تھی۔

میرا خیال درست نکلا۔ حضرت سات آٹھ منٹ بعد اٹھنے کے لیے اپنی لاٹھی سے کشمکش کرنے لگے۔ میں نے ان کی کہنی کو سہارا دے کر اٹھنے میں مدد دی تو کھرکھراتی آواز میں غرا کر بولے۔ "تھینک یو۔"

انہیں رخصت ہوتے دیکھ کر بڑی روحانی خوشی حاصل ہوئی۔ جب تنہا رہ گیا تو شوبھا کے بارے میں سوچنے لگا۔ جب وہ آئے تو مجھے کیسی صورت بنانی چاہئے۔ کیا کہنا چاہئے اور کیا نہیں کہنا چاہئے۔ یوں تو اس طویل چٹھی کے بعد کہنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا اور اس کے مجھ سے ملنے پر آمادہ ہوجانے کے بعد خفگی کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا یا کم از کم یہ سوال بہت حد تک حل ہو چکا تھا۔ پھر بھی معاملہ نازک تھا...... ہاں اگر وہ آتے ہی مسکرا دے یا میری کسی حرکت یا بات پر اس کی بتیسی نکل پڑے تو پو بارے۔ بہرحال عقل مندوں کا کہنا ہے کہ ہر کام میں تصویر کے تاریک پہلو پر نگاہ رکھنی چاہئے اس لیے

میں نے کل تفصیلات کا جائزہ لیا اور اپنے آپ کو ہر حالت کے لیے تیار کر لیا۔

پارک کی فضا بڑی بوجھل سی ہو رہی تھی۔ ایک تو یوں بھی یہ گوشہ شور وغل سے دور تھا دوسرے شہر کا دھواں دب کر زمین کے سینہ سے سینہ ملا کر رہ گیا تھا۔ البتہ اس گھٹن میں بھی دور بازار کی تیز روشنیاں اور آسمان کے تارے دیکھ کر دماغ کو ہلکی سی فرحت محسوس ہو رہی تھی...... اسی کیفیت میں ملی جلی کیفیت غم جاناں کی بھی تھی غرض یہ کہ ان سب جانی اور ان جانی کیفیتوں نے باہم دگر ہو کر عجب کسک کی صورت اختیار کر لی تھی۔

عین اسی وقت ایک صاحب بے تلے قدموں سے ادھر آتے دکھائی دیئے۔ مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں ہماری بنچ پر ہی آ کر براجمان نہ ہو جائیں لیکن وہ تو سچ مچ میری جانب بڑھے چلے آ رہے تھے۔ نوجوان اور خوش پوش کندھے پر اوور کوٹ، ہونٹوں میں دبا ہوا سگریٹ، شو ضرورت سے زیادہ چمک دار۔

میرا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ حضرت آئے اور دھاک سے میرے پہلو میں بیٹھ گئے۔ بیٹھتے ہی سگریٹ پرے پھینک دیا۔ حالانکہ سگریٹ آدھے سے زیادہ باقی تھا۔ پھر بے اختیار اُف کہہ کر نیا سگریٹ جلایا۔ وہ تین کش لے کر پھر اف کہا اور سگریٹ پرے پھینک دیا۔ سر پر ہاتھ پھیرا۔ ہونٹ دانتوں تلے دبایا پھر اُف کے بعد نیا سگریٹ نکالا لیکن نہ جانے کیا خیال آیا اسے جلانے سے پہلے سگرٹوں کا ڈبہ میری طرف بڑھایا۔

''شوق فرماتے ہیں؟''

تھری کیسل کا ڈبہ تھا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ ''شکریہ! میں نے ابھی پیا ہے۔''

''خوب——'' اس نے جیسے بے خبری میں کہا۔ اپنا سگریٹ جلایا۔ دھواں آسمان کی جانب چھوڑا اور ستاروں سے آنکھیں لڑاتے ہوئے بولے۔

''گڈ گاڈ! اب کیا ہوگا؟''

اداکاری کے جوہر بھی دکھا رہے تھے اور اپنے آپ سے باتیں بھی کیے جا رہے تھے۔ ظاہر تھا کہ وہ مجھے متوجہ کرنا چاہتے تھے لیکن میں متوجہ ہونے کے موڈ میں قطعاً نہیں

تھا۔ میں انہیں وہاں سے بھگا دینے کی فکر میں تھا۔

وہ بڑے بے چین بلکہ پریشان نظر آرہے تھے یا پریشان دکھائی دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ دیکھنے میں خاصے معقول انسان دکھائی دیتے تھے لیکن یہ ساری دنیا چھوڑ کر میرے پہلو میں آ بیٹھنے میں کیا مصلحت تھی ان کی؟ خیر میں چپ رہا۔ سوچا خود ہی بک جھک کر دفع ہوجائیں گے۔ لیکن کچھ دیر کے بعد جب انہیں یقین ہوگیا کہ میں ان کی ذات سے دلچسپی کا اظہار کرنے سے بے زار ہوں تو خود ہی بول اٹھے۔ ''معاف کیجئے گا حضرت! آپ کے روبرو اس وقت دنیا کا سب سے زیادہ بے وقوف شخص بیٹھا ہے۔''

میں کہنا چاہتا تھا کہ میں بے وقوفوں کی صحبت سے پہلے ہی تنگ آچکا ہوں لیکن میں چپ رہا۔

بھلا وہ کب پیچھا چھوڑنے والے تھے۔ ''جانتے ہیں آج میری کیسی گت بنی ہے؟''

وہ یہ سوال میری ناک سے ناک بھڑا کر کر رہے تھے۔ اب جاؤں تو کہاں جاؤں۔ مجبور ہو کر سر ہلا دیا۔

انہوں نے بار بار مصنوعی پسینہ پونچھتے ہوئے سلسلہ کلام جاری رکھا:

''حضرت! غضب ہوگیا...... لیکن یہ حادثہ کسی کے ساتھ بھی ہوسکتا تھا...... یعنی کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی پھر بھی مصیبت تو مصیبت ہی ہے......''

میں نے از حد بے کیف لہجے میں پوچھا ''آپ تو اچھے بھلے دکھائی دے رہے ہیں آخر کیا مصیبت ہے؟''

''اجی مصیبت سی مصیبت ہے...... لیجئے کلیجہ تھام کر سنئے۔''

کلیجہ تو میں نے پہلے ہی تھام رکھا تھا۔

''ہوا یہ کہ میں آج ہی گاڑی سے اترا ہوں......''

''کہاں سے آرہے ہیں آپ؟''

''کلکتے سے......''

"بہتر۔ آگے بڑھیے۔"

"اسٹیشن پر ایک ہوٹل کا گائیڈ ملا۔ اس نے ہوٹل کا کارڈ دکھایا۔ میں اس کے ساتھ ہولیا۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے سامان کمرے میں رکھا اور چند ضروری چیزیں خریدنے کے لیے بازار چلا آیا۔"

"تو کیا جیب کٹ گئی؟"

"نہیں صاحب! آپ سنئے تو .... بازاروں میں گھومتا پھرتا دور نکل آیا۔ پہلے میں نے صابن کی ٹکیہ خریدی۔ اس کے دام دے دیئے تو پتہ چلا کہ میری جیب میں چند آنے بچے ہیں دوسری چیزیں خریدنے کے لیے دام نہیں۔"

"تو کیا آپ گھر سے روپیہ لے کر نہیں چلے تھے؟"

"کیوں نہیں۔ روپے کی ہمارے یہاں کمی نہیں ہے..... بات یہ ہوئی کہ سارا روپیہ میرے سوٹ کیس میں پڑا تھا.... اور سوٹ کیس ہوٹل کے کمرے میں....."

"خوب تو آپ ہوٹل جاکر روپیہ لا سکتے تھے اس میں پریشانی کی کیا بات تھی؟"

"اجی صاحب یہی خیال میرے دل میں بھی آیا لیکن اب میری حماقت ملاحظہ ہو، میرے ذہن سے ہوٹل کا نام غائب تھا اور اب بھی غائب ہے..... اس شہر میں پہلی مرتبہ آیا ہوں۔ نہ شہر سے واقف نہ کسی سے جان پہچان....."

مجھے ان کی یہ انمل بچو کہانی سن کر ہنسی آگئی۔ وہ بولے:

"خوب ہنسیے پردیسی کی پریشانی پر۔"

میں نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں در اصل میں آپ کا مذاق نہیں اڑانا چاہتا، لیکن آپ کا قصہ ہی ایسا ہے کہ یقین نہیں آتا۔"

"یہ تو میں تسلیم کرتا ہوں کہ آپ کو اس حادثے کا یقین ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ ہی پر کیا موقوف ہے کوئی بھی معقول آدمی مجھ ایسی حرکت کرنے والے کو پرلے درجے کا احمق سمجھے گا۔"

''نہیں نہیں آپ تو ناحق اپنے آپ کو گالیاں دینے پر اتر آئے۔ ایسا مت کیجئے......''

''شکریہ مجھے ایسے جنٹل مین کی ہی تلاش تھی۔''

یہ سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔

''اب میری مصیبت یہ ہے کہ سامان پاس نہیں، ہوٹل کا نام یاد نہیں جیب میں دام نہیں...... بتائیے میں پردیس میں رات کہاں کاٹوں؟''

وہ میرے جواب کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن میں کیا جواب دیتا، اس پر انہوں نے بمنت تمام کہا۔ ''دیکھئے آپ میرے لیے اجنبی ہیں میں آپ کے لیے۔ مگر آپ نے دنیا دیکھی ہے اس لیے برے بھلے آدمی میں تمیز بھی کر سکتے ہیں...... مجھے آپ پندرہ روپے دے دیجئے۔ میری آج کی رات کٹ جائے کل دن بھر میں میں ہر ہوٹل میں گھوم کر پتہ لگالوں گا اور آپ کے روپے واپس کردوں گا۔ آپ اپنا پتہ مجھے لکھا دیجئے۔ ہوسکتا ہے مجھے آج ہی ہوٹل کا پتہ لگ جائے...... لیکن سوال یہ ہے کہ آج پتہ نہ لگا تو رات کہاں کاٹوں گا...... کھانا کیسے کھاؤں گا؟''

مجھے ان کی بات پر یقین نہیں آیا اس لیے روپیہ دینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ در اصل ان کی اداکاری کچھ حد سے زیادہ بڑھی چڑھی نظر آتی تھی۔ پتہ نہیں کیوں مجھے وہ اوّل درجے کے دھوکے باز دکھائی دے رہے تھے۔

وہ مجسم سوال بنے میری جانب دیکھ رہے تھے۔ پھر نہ جانے کیسے مجھے ایک بات سوجھی میں نے کہا۔ '' اگر آپ سچے ہیں تو صابن کی ٹکیہ ہی دکھا دیجئے جو آپ نے ابھی ابھی خریدی تھی۔''

اس پر انہوں نے پھر اداکاری دکھاتے ہوئے جیبوں پر ہاتھ مارا۔ پھر اوورکوٹ (جو ان کے گھٹنوں پر رکھا تھا۔ کی جیبیں ٹٹولیں۔ لیکن حضرت کی صورت سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہیں۔ بڑے جھینپے۔ فوراً کپڑے جھاڑ کر جدھر سے آئے تھے ادھر کو چلے گئے۔

میں نے سوچا حضرت مجھے بے وقوف بنانے آئے تھے خود ہی احمق بن گئے۔ پھر میں نے اپنے آپ کو، اپنی ذہانت کو اور اپنی حاضر دماغی کو داد دی۔

اب پھر بنچ خالی تھی۔ میں نے سگریٹ ہونٹوں میں دبایا اور دور بازار میں گھستے ان حضرت کو دیکھتے ہوئے ماچس کی ڈبیا کے لیے بنچ پر ہاتھ پھیرا۔ دھیان دوسری طرف ہونے کی وجہ سے ڈبیا نیچے جا گری۔ میں جھک کر اٹھانے لگا تو معاً پاس ہی ایک چھوٹا سا بنڈل دکھائی دیا۔ ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھایا تو پتہ چلا کہ باقاعدہ پیک کی ہوئی صابن کی ٹکیہ ہے۔

ٹکیہ میرے ہاتھ میں تھی اور میں دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہا تھا۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ابھی شوبھا کے آنے میں بیس منٹ باقی تھے۔ یوں بھی اگر وہ مجھے وہاں نہ پاتی تو انتظار کرتی۔ لیکن میں یہ سوچ کر دوڑ پڑا کہ وقت مقررہ سے پہلے واپس آجاؤں گا۔

بازار میں گھس کر میں دائیں بائیں دیکھتا چلا گیا۔ لیکن اس شخص کا کہیں پتہ نہ تھا۔ کافی دوڑ دھوپ کے بعد میں مایوس ہو کر لوٹنے ہی کو تھا کہ اچانک وہی حضرت دکھائی دیئے۔ مجھ سے آنکھیں چار ہوتے ہی آنکھیں پھیر لیں۔ وہ کھسکنے کو ہی تھے کہ میں نے جا دبوچا اور لجاجت آمیز لہجے میں کہا "بھائی صاحب! غلطی معاف کیجئے۔ آپ کی صابن کی ٹکیہ بنچ کے نیچے گری پڑی تھی۔ یہ لیجئے میں نے ناحق آپ کو شرمندہ کیا۔ واقعی زیادہ چالاکی بھی اچھی چیز نہیں۔ مجھے سچ سچ بہت عمدہ سبق ملا ہے آج۔ یہ لیجئے پندرہ روپے، یہ رہا میرا کارڈ معہ پتے کے۔ چاہیں تو بے شک صبح میرے یہاں چلے آئیں۔ ہوٹل تلاش کرنے میں آپ کی مدد کروں گا۔۔۔ اب میں رخصت چاہتا ہوں کیونکہ مجھے ایک صاحب سے اسی وقت ملنا ہے۔"

اب ہم نے بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور دو اچھے دوستوں کی طرح جدا ہوئے۔ لوٹتے وقت میں نے سوچا کہ یہ دلچسپ قصہ شوبھا کو سناؤں گا تو وہ ضرور خوش ہوگی۔

وقت ہو چکا تھا۔ ادھر میں بنچ کے قریب پہنچا اُدھر شوبھا بھی آگئی۔ یوں تو وہ

خوب بنی ٹھنی تھی اور بہت پیاری لگ رہی تھی لیکن منہ پھولا ہوا تھا۔ میں جانتا تھا کہ منہ کا یہ پھلاؤ اصلی نہیں بناوٹی ہے۔

میں نے اس کے بازو کو سہارا دے کر بنچ پر بٹھانا چاہا تو اس نے بازو جھٹک کر پرے ہٹا لیا۔ خشک لہجے میں بولی۔ ''رہنے دیجئے خود ہی بیٹھ جائیں گے۔''

چھوٹتے ہی میں نے کہا۔ ''ارے شوبھا! آج بڑے مزے کی بات ہوئی۔ تم سنوگی تو حیران بھی ہوگی اور خوش بھی۔''

اس تمہید کے بعد میں نے خوب مصالحہ لگا کر سارا واقعہ کہہ سنایا لیکن وہ نہ حیران ہوئی اور نہ خوش۔

اب مجھے محسوس ہوا کہ گھاؤ زیادہ گہرا ہے۔ معمولی مرہم سے کام نہیں بنے گا۔ بھلا اب کس جتن سے روٹھی رانی کو منایا جائے۔

میں اسی اُدھیڑ بن میں تھا کہ پھر ایک سایہ اپنی جانب بڑھتا دکھائی دیا۔ بڑی کوفت ہوئی کہ اب معاملہ بالکل کھٹائی میں پڑ جائے گا۔

وہ حضرت اِدھر اُدھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ پھر مجھ سے دریافت کیا۔

''کیوں صاحب! آپ نے یہاں صابن کی ٹکیہ تو نہیں دیکھی؟...... بالکل نئی...... پیکٹ میں بند......''

اب میں نے پہچانا۔ حضرت وہی پہلے والے بوڑھے تھے۔ یہ سن کر میں سر سے پاؤں تک شل ہوگیا۔

انہیں صابن کی ٹکیہ نہیں ملی۔ جس طرح سے آئے تھے اسی طرف کو واپس چلے گئے۔

میں نے شوبھا کی جانب دیکھا۔ اب وہ حیران بھی تھی اور خوش بھی!

یہ افسانہ 'آج کل' نومبر 1959 میں پہلی بار شائع ہوا۔ کسی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ کلیات میں پہلی بار شائع کیا جا رہا ہے۔

ایک بھیگی شام

میں آپ سے پوچھتا ہوں، کیا آپ نے کبھی محبت کی ہے؟ درست ہے محبت ایک گھساپٹا ہوا لفظ ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ اس افراتفری کے زمانے میں محبت کرنے کی فرصت ہی کس کو ہے، اور اس سے بھی انکار نہیں کہ ہماری مادی دنیا میں انسان کی انسان سے توجہ ہٹ گئی ہے۔ روپیہ، صرف روپیہ ہی سب کچھ ہے، یہی ماں یہی باپ یہی بیوی بلکہ یہی بھگوان ہے۔ جو اسے جمع کر لیتے ہیں موج اڑاتے ہیں جو اس سے غافل رہتے ہیں وہ نہ صرف پچھتاتے ہیں بلکہ انہیں باعزت زندگی تک بسر کرنا دوبھر ہو جاتا ہے...... یہ سب کچھ تسلیم کر لینے کے بعد بھی اگر میں آپ سے کہوں کہ میں نے سچ مچ محبت کی ہے تو اسے میرا پاگل پن تو نہ سمجھیں گے؟ اگر آپ ایسا سمجھیں بھی تو کیا فرق پڑتا ہے— محبت سے مراد ہوس نہیں ہے بلکہ محبت سے مراد وہ جذبہ ہے جس کے تحت آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کا اپنے محبوب کے بغیر گزر ممکن نہیں، جب آپ کا ساتھی جب آپ کے روئیں روئیں میں سما جاتا ہے، جب وہ آپ کی کائنات بن جاتی ہے...... آپ چاہیں تو اسے بکواس محض کہہ سکتے ہیں۔ اور اس کے جذبے کی جس طرح چاہیں توہین کر سکتے ہیں لیکن مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میرا جذبہ محبت کچھ اسی قسم کا تھا۔

اب میں آپ کو اپنی محبت کا قصہ سنانے نہیں بیٹھوں گا۔ آپ مطمئن رہئے میں آپ کا قیمتی وقت ضائع نہیں کروں گا— میں اپنی محبت کی داستان کا انجام ایک فقرے میں بتا کر اس کے بارے میں اور کچھ نہیں کہوں گا اور وہ ایک فقرہ یہ ہے کہ مجھے اپنی محبت میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ محبوبہ کے والدین نہیں مانے اور میری دلنواز محبوبہ کی شادی اور جگہ طے ہوگئی۔ مجھے پتہ چلا کہ میری محبوبہ نے دل پر پتھر رکھ کر اس نئے رشتے کو منظور کر لیا ہے تو مجھے پہلے پہل یقین نہیں آیا۔ میں نے ملاقات کی صورت نکالی، آمنا سامنا ہوا تو میری ہر آہ، ہر سوال اور ہر نوحے کا جواب خاموشی اور آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں ملا تو میں ناکام نامراد واپس چلا آیا۔

اسی حالت میں میں نے طے کیا کہ میں چند ماہ کے لیے اس مکار دنیا سے الگ تھلگ کہیں چلا جاؤں گا۔ اپنے زخمی دل پر قدرتی نظاروں کا پھاہا رکھوں گا۔ ممکن ہے اس ماہئ بے آب کو قرار آئے۔ زندگی تو جس طور بسر ہونی تھی سو ہونی تھی، لیکن خودکشی کی نوبت تو نہ آنے پائے۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں گڑھوال میں مقیم اپنے ایک دوست کو دلی کیفیت اور اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ وہ شخص یونیورسٹی میں میرا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔ میں نے بی اے پاس کرنے کے بعد اپنے والد مرحوم کا کاروبار یعنی پٹرول کے چند پمپ جو مختلف شہروں میں ایستادہ تھے سنبھالا۔ میرے دوست نے لاء پاس کیا اور پھر پریکٹس کے لیے اپنے وطن واپس چلا گیا۔ لیکن وہاں اس کا کام جما نہیں تو کچھ ہی عرصہ پہلے اس نے مجھ اس سلسلہ میں خط و کتابت کی۔ میں نے اپنے شہر کے وکلاء سے مل کر اور ادھر ادھر سے بھی وکالت کے بارے میں جو کچھ پتہ چل سکا، ان ساری معلومات سے دوست کو آگاہ کیا اور اسے یقین دلایا کہ اگر وہ آنا چاہے تو امید ہے وہ جلد ہی کامیابی سے ہم کنار ہوگا— تمہید ذرا لمبی سی ہوگئی ہے، بتانا میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ میری اس حقیر خدمت کے لیے میرا شکر گزار تھا۔ چنانچہ اس نے میری دل جوئی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس نے لکھا: ''یار تم جانتے ہی ہو کہ میں اپنا سارا اثاثہ بیچ باچ کر تمہارے شہر آنے کو ہوں کیوں کہ بال بچوں اور والدین کو یہاں پر چھوڑ کر خود پردیس میں کام کرنا ناممکن ہے۔ ادھر تم شہر سے فرار ہونا چاہتے ہو...... میں تم پر الزام نہیں

دھروں گا، کیوں کہ جو حالات تم نے لکھے ہیں، انہیں پڑھ کر تو خود میری آنکھوں میں آنسو آ گئے...... بہر کیف اب جو تم نے سوچی ہے مستحسن ہے، میں تم سے متفق ہوں۔ ادھر گڑھوال کے راستے میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس کا نام بانو ہے، اس مقام کا نام مشہور نہیں ہے۔ جگہ واقع بڑی معروف سی ہے لیکن تمہارے لیے بہترین مقام ہے، آؤ اور یہیں پر قیام کرو۔ سڑک سے چھ میل ہٹ کر ایک بنگلہ ہے...... اب بنگلے کے نام سے دھوکا نہ کھانا، کیوں کہ شہر کے بنگلے سے قطعاً مختلف ہے۔ دیواریں بڑے بڑے پتھروں کی چھت پر کھپریل اور فرش بھی اسکول کا بنا ہے، چاروں طرف ایک باغیچہ بھی ہے، لیکن محض نام کو۔ کیوں کہ یہاں سوائے لمبی لمبی گھاس دیگر جڑی بوٹیوں کے اور کچھ نہیں ہے۔ ہاں برسات میں جو آج کل میں شروع ہوا ہی چاہتی ہے اگر یہاں کچھ نیلے پیلے جنگلی پھول سر مٹکاتے نظر آ جائیں تو مجھ پر الزام نہ دھرنا۔ آٹا، دال، نمک ایندھن وغیرہ بازار میں مل جاتا ہے جو تم نوکر بھیج کر منگوا سکو گے اپنی آمد و رفت کے لیے تمہیں ایک ٹٹو رکھنا ہوگا۔ موٹر سائکل، سائکل یہاں قطعاً بے کار ہے، ایک باورچی اپنے ہمراہ ضرور لیتے آنا کیوں کہ اس جگہ اچھے باورچی کا ملنا ناممکن ہے، البتہ دیگر ملازم کافی تعداد میں اور کم تنخواہ پر مل سکتے ہیں باقی جو کچھ تم چاہتے ہو یہاں موجود ہے، یعنی قدرتی مناظر، خاموشی اور سکون شغل کے طور پر قریب کے نالے میں مچھلیاں پکڑنے کے لیے جا سکتے ہو، لیکن ذرا سنبھال کر کیوں کہ — مائی ڈیر! ہمارے پہاڑ کی پہاڑن لڑکیوں میں سے بعض تو بڑے غضب کے دانے ہوتے ہیں...... خیر چھوڑو، میں اس بات کو زیادہ طول نہیں دوں گا، کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ تم اس وقت مناسب موڈ میں نہیں ہو، مگر میرا پختہ یقین ہے کہ وہاں کچھ دن قیام کرنے کے بعد تم خود ہی مجھے ان کافر ادا الھڑ لیکن کامل جادوگرنیوں کے بارے میں لکھا کرو گے...... سب حالات سے تمہیں آگاہ کر دیا ہے۔ اگر تمہیں میری تجویز پسند آئے تو لکھو کیوں کہ تم جانتے ہی ہو میں خود یہاں سے ڈیرہ ڈنڈا اٹھا لے جانے کی فکر میں ہوں، تمہارا جواب آتے ہی کل انتظام ٹھیک کر کے یہاں سے نکلوں گا۔"

مجھے اس کی تجویز پسند آئی گو پہاڑن لڑکیوں کے بارے میں اس کے خیالات معلوم کر کے میرے لبوں پر زہر خنداں پیدا ہوا، سچ سچ تماشائی عاشق کے جذبۂ صادق کو بازیچۂ اطفال سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ خیر اس باب میں میں چپ رہا، البتہ اسے مطلع کر دیا کہ چھٹی ملتے ہی بنگلہ کرائے پر لے کر دو ماہ کا کرایہ پیشگی ادا کر دے، مجھے فوراً اطلاع دے دے تاکہ میں روانہ ہو سکوں۔

چناں چہ اس طرح سے میں نے اپنے ماحول سے دل برداشتہ ہو کر مانند مجنوں کے گھر سے نکل کر ویرانے کا رخ کیا۔

چوں کہ کچھ معلوم نہیں تھا کہ آئندہ زندگی کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے، اس لیے کپڑے لتے اور دیگر ضروری وغیر ضروری سامان کا معقول انتظام کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ ریل اور لاری کے سفر کے بعد جب ٹٹوؤں کا سفر شروع ہوا تو میرے سامان کی وجہ سے خاصہ بڑا کارواں سا بن گیا۔ تماشائی بھی سمجھے کہ کوئی خاندانی رئیس ہے۔

راہنمائی کے لیے ایک گائیڈ کی خدمات حاصل کیں، جو بہ ذات خود عجیب و غریب شخصیت کا مالک تھا۔ عجیب و غریب سے میرا مطلب یہ نہیں کہ اس کی شخصیت پر اسرار تھی بلکہ میری مراد کچھ اور ہے مثلاً یہی کہ وہ خاصہ رسیدہ تھا لیکن منہ میں دانت اور پیٹ میں آنت سلامت تھی، سرو قد تھا، مسلمانوں ہونے کی وجہ سے شرعی داڑھی پال رکھی تھی لیکن ساتھ ہی اس میں کالجیٹ لڑکوں کا سا البیلا پن بھی تھا۔ طبیعت حسن شناس تھی اور دل..... معشوق کی جانب بھٹکنے جانے کے لیے بے تاب تھا۔ باتوں باتوں میں یہ بھی پتہ چلا کہ میدانوں میں بھی کافی رہ چکا تھا۔ شرطیہ لڑکا پیدا ہونے کی دوا مجمع لگا لگا کر بیچنے سے لے کر ہوٹلوں کی گائیڈی تک ہر قسم کے پاپڑ بیل چکا، بڑا چرب زبان اور باتونی تھا وہ۔ مجھے اس کی اس ایک عادت سے بڑی کوفت ہوئی— پہلے پہل جب وہ میرے رو برو آ کر کھڑا ہوا تو اس کی صورت ذرا عجیب سی لگی۔ سر پر بے پھندنے کی

ترکی ٹوپی، لمبی داڑھی، آنکھوں میں کاجل، مسوڑھوں پر پان کی سرخی پہاڑی ٹائپ کا تنگ نہ کھلا پائجامہ، قمیص گھٹنوں سے ایک انچ اوپر تک لمبی اور کالا کوٹ قمیص سے نصف ہاتھ چھوٹا۔ بغل میں دبا ہوا کسی پہاڑی لکڑی کا ڈنڈا۔ صورت سے سنجیدگی ٹپکتی تھی اور یہ تو بالکل معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ حضرت جب بات کرنے پر آئیں گے تو سلاست و بلاغت کے دریا بہا دیں گے، دریا بھی ایسے جن کا آغاز نہ انجام۔ الجھن کے باوجود دل پر پتھر رکھنا پڑا، کیوں کہ تین دن کا سفر تھا اور وہ بزرگ سفید ریش خضر راہ۔ اس لیے کانوں کو ان کی آواز سے مانوس کر لینے کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں تھا۔

میں یہ بات تو بتانا بھول ہی گیا کہ اس بوڑھے گائڈ کو جس کا نام حنیف تھا شعر پڑھنے کا بھی بہت شوق تھا۔ سب سے پہلے اس کے اشعار ہی سے میرا دل اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ کوئی عالم یا ادیب تو نہیں تھا شاید اس کی تعلیم بھی معمولی تھی، اسی لیے وہ اکثر آسان اور عام فہم شعر ہی پڑھتا تھا لیکن بہ موقع اشعار پڑھنے میں اسے مہارت حاصل تھی۔

ٹٹوؤں کے کارواں کے آگے آگے میں ایک مضبوط ٹٹو پر سوار حنیف کی رہنمائی میں بڑھتا تھا اور میرے ہم راہ وہ پیدل چلتا تھا۔ اس عمر میں اس کی ہمت اور قوت پر مجھے تعجب ہوتا تھا۔ پہلا دن کچھ بے کیف سا گزرا، میری روح کی گہرائیوں میں ناکامی محبت کا غم سر چھپائے سسکیاں بھر رہا تھا۔ البتہ دن بھر میں جب کبھی حنیف شعر پڑھتا تو دل میں لذت انگیز کسک کا احساس ہوتا۔

ہم پہاڑوں کے لا متناہی سلسلوں میں داخل ہو چکے تھے۔ آڑی ترچھی پگڈنڈیوں پر سے ہمارا قافلہ مست خرام تھا۔ جب کبھی حنیف کی باتوں کا سلسلہ ختم ہوتا تو فضا کے روح پرور سکون کا احساس ہونے لگتا۔ محض ٹٹوؤں کے گلے سے بندھی ہوئی گھنٹیوں کی ٹناٹن سے یہ خواب ناک دنیا مترنم سی ہو کر رہ جاتی۔ دیکھتے دیکھتے پہاڑوں کی اوٹ سے دیو نما گھٹاؤں نے سر اٹھایا اور دامن افق پر اپنے علم لہرانے لگیں۔ ہوا

بھی تیز تند چلنے لگی اور پھر یکا یک بادلوں کی وہ بھرمار ہوئی کہ تاریکی سی چھانے لگی۔ حنیف نے مشورہ دیا کہ مناسب جگہ دیکھ کر کسی بڑے پیڑ کے نیچے قیام ہونا چاہیے۔ اس نے بتایا کہ خوش قسمتی سے قافلہ ایک مندر کے قریب پہنچ چکا ہے جس پر ایک بہت قدیم بڑ کے پیڑ کا سایہ ہے وہاں قیام کرنا مناسب ہوگا۔ اس پر مزدور اور ٹٹو قدم تیز کر کے آگے بڑھے اور ہم بارش پڑنے سے پہلے ہی برگد کے نیچے جا پہنچے۔ ٹٹوؤں کو قریب قریب کھڑا کر کے ان پر ایک لمبی چوڑی برساتی ڈال دی، تاکہ بارش کی صورت میں سامان خراب نہ ہونے پائے۔

ان چھوٹے موٹے کاموں سے فارغ ہو کر میں اس مندر کے سامنے بنے ہوئے چبوترے پر جا بیٹھا۔ کچھ دیر بعد حنیف بھی آیا۔ اس نے انگوچھے سے اپنی لمبی داڑھی کو پونچھا اور پھر مجھ سے دس بارہ فٹ پرے بیٹھ گیا۔ اتنے میں آسمان میں زور کا دھماکہ ہوا اور پھر اک دھڑاکے کے ساتھ پانی ٹوٹ کر برسا۔ یہاں تک کہ آسمان سے زمین تک دھواں دھار ہوگیا۔ رنگ برنگی پہاڑیاں یوں دکھائی دیتی تھیں جیسے بوندوں کی چادر کے پیچھے پریاں غسل کر رہی ہوں — یہ دل فریب منظر دیکھ کر اگر کوئی اور زمانہ ہوتا تو میرا دل ناچ اٹھتا یا شاید میں خود بھی اٹھ کر رقص کرنے لگتا۔ لیکن اب تو ذہن پر مردنی سی چھائی تھی۔ چپ چاپ اس لگاتار بارش کو دیکھتا رہا جیسے میرے سارے غم اسی میں دھل جائیں گے۔

تھوڑی دیر بعد محسوس ہوا کہ اس منظر نے مجھی کو مسحور نہیں کر رکھا خود حنیف بھی اس سے بری طرح سے متاثر نظر آتا تھا۔ اس نے حسب معمول اپنے جذبات کے اظہار پر کوئی پابندی نہیں لگا رکھی تھی۔ چنانچہ اس نے ایک ہاتھ کان پر رکھا اور دوسرا ہوا میں اٹھا کر ایک شعر پنجابی طرز پر گا کر پڑھا۔

زلفیں بادل نے لہرائی ہیں لو ہونے لگی برسات
بوندوں کے جل ترنگ میں یاد آنے لگی اک بات

شعر معمولی تھا، لیکن اس فضا میں وہ ترنم کانوں کو کتنا بھلا لگا اس کا بیان نہیں ہوسکتا۔ اس وقت شعر نے جادو کا کام کیا اور پھر مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ حنیف اس قدر خوش گلو واقع ہوا ہے، مجھ سے نہ رہا گیا ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے میں نے پوچھا:

''بھئی تم نے تو گلا بھی غضب کا پایا ہے۔''

''آداب عرض ہے...... جناب لعل کی قدر جوہری ہی جان سکتا ہیں۔''

''لیکن یہ پنجابی طرز کہاں سے سیکھی؟''

''اجی جہاں کی چیز سیکھنے کو من چاہا بہ ذات خود وہاں پہنچ کر ہی سیکھی۔ آپ جانتے ہی ہیں، میں نے پنجاب میں بھی عمر عزیز کا کافی حصہ گزارا ہے۔''

اس کے بعد حنیف نے مزے لے لے کر اپنی زندگی کے دل چسپ واقعات سنانے شروع کیے۔ اس نے بتایا کہ کس طرح اپنی خوش الحانی کے باعث اسے ایک لڑکی کی محبت حاصل ہوئی اور پھر اس عشق نے ایسا طول پکڑا کہ نوبت شادی کی بات چیت تک پہنچی لیکن لڑکی کے والدین اگر چہ مسلمان ہی تھے لیکن وہ ایک غیر پنجابی کے ساتھ لڑکی کی شادی کرنے پر رضا مند نہیں ہوئے، چناں چہ شادی نہیں ہوسکی۔

میں نے پوچھا ''اس ناکامی کا تمہاری زندگی پر بہت برا اثر پڑا ہوگا۔''

''آپ کا خیال بہت حد تک درست ہے لیکن دنیا میں کئی چیزیں ایسی ہیں جو ہم حاصل نہیں کرسکتے۔ کس کس کو روئیں کس کس کے لیے سینہ کوبی کریں...... صبر کرنا ہی پڑتا ہے۔ کیوں کہ اللہ کی حکمتیں اللہ ہی جانے......''

''یہ ٹھیک ہے لیکن بھئی بعض اوقات تو بھگوان کے نام کا سہارا بھی کمزور ثابت ہوتا ہے۔ انسان کے دل اور روح پر ایسا غبار چھا جاتا ہے کہ کچھ بس نہیں چلتا۔ نہ کامیابی سے ہم کنار ہوتے ہیں اور نہ دل کو چین ہی آتا ہے......'' نہ جانے میں یہ سب الفاظ کیوں کر کہہ گیا۔

کچھ دیر تک خاموشی طاری رہی۔ بارش موسلا دھار ہو رہی تھی۔ مندر برگد کے گھنے اور پھیلے ہوئے پیڑ کے تلے تھا اور جس چبوترے پر ہم بیٹھے تھے اس کی چھت بھی تھی۔ اس لیے ہم بارش سے محفوظ تھے۔ البتہ ہمارے ٹٹو بری طرح سے سکڑے کھڑے تھے۔ ٹٹو ہانکنے والے بھی مندر کے ایک چھجے تلے دبکے ہوئے تھے۔ آس پاس کی پہاڑیوں سے پانی کا شور عجب کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ پھر مجھے حنیف کی ذرا گہری سی آواز سنائی دی۔

"صاحب اگر برا نہ مانیں تو کچھ کہوں؟"

میں نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے تاہم میں نے جواب دیا۔ "برا ماننے کی کیا بات ہے کہو بے کھٹکے کہو...... بھئی تم بھی پڑھے لکھے انسان ہو۔ دنیا گھومے ہو۔ تم کوئی غیر معقول بات تو کہہ نہیں سکتے......"

اس پر اس نے پھر کچھ تامل کیا اور پھر بولا۔ "سرکار بھی دل پر کچھ چوٹ کھائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔"

میں چونکا مجھے قطعاً اس بات کا خیال نہیں تھا کہ ہماری گفتگو ایسی کروٹ لینے کو ہے۔ لیکن اس میں کسی کا کیا قصور؟ میں نے ہی اس قسم کی باتیں کہیں کہ وہ اصلیت کو بھانپ لینے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے سوال سے میں چونکا ضرور، لیکن جلد ہی سنبھل گیا۔ کچھ موسم کی رنگینی اور کچھ دل کی غمناک کیفیت نے بے اختیار سا کر دیا۔ جواب دیا۔ "تمہارا اندازہ ٹھیک ہے بھائی۔"

"کیا اس لڑکی کے ماں باپ نے رکاوٹ ڈالی ہے؟"

"ہاں۔"

"کیا لڑکی کی شادی اور جگہ ہو چکی ہے؟"

"ہوئی نہیں، ہونے کو ہے۔"

"کیا لڑکی نے بے وفائی کی؟"

''کیسے کہوں— ہمارے یہاں لڑکیوں کی مجبوریاں بھی تو بہت ہوتی ہیں.....''

''لڑکی تو بالغ ہی ہوگی۔''

''ہاں بالغ ہے۔''

''وہ چاہتی تو آپ کا ساتھ دے سکتی تھی۔ کیوں کہ وہ پڑھی لکھی بھی تو ہوگی۔''

''ہاں پڑھی لکھی بھی ہے۔''

''یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے، لڑکی کو ہمت سے کام لینا چاہیے تھا..... میرا مطلب ہے کہ اگر اس کے عشق میں کچھ بھی صداقت تھی تو.....''

''لیکن ایسا ہوا نہیں۔''

''کتنے دکھ کی بات ہے اگر پڑھی لکھی لڑکیاں بھی اپنی پسند کے مرد کو چھوڑ سکتی ہیں تو پھر ان پڑھی لڑکیوں کا کیا ٹھکانہ ہے.....''

میں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ پھر بولا۔

''آخر ان لوگوں کو اعتراض کیا تھا آپ پر.....''

''یہ قصہ بہت لمبا ہے..... کیا کہوں.....''

''نہیں رہنے دیجیے مت بتایئے..... کیوں کہ اس طرح ہر تلخ واقعہ کی یاد تازہ ہوجائے گی— معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ عرصے کا واقعہ نہیں ہے۔''

''نہیں۔''

''اگر میں غلطی نہیں کرتا تو آپ اپنا غم بھلانے کے لیے ہی اس ویرانے میں چلے آئے ہیں۔''

''ہاں۔''

''ہائے ہائے..... ذرا اندازہ لگایئے، اگر ان حسین وادیوں میں اور اسی برسات میں وہ آپ کے ہمراہ ہوتیں تو کیا خوب ہوتا۔''

میں نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ ''بھئی اب دل کو چرکے مت لگاؤ.....نہ جانے

زندگی کے کیا کیا پروگرام تھے، سب دھرے کے دھرے رہ گئے— بھئی برا نہ ماننا—
اب اتنے پر صبر کرو مجھ سے اور سوال مت پوچھو۔"

"بہتر ہے میں آپ سے آپ کے بارے میں کوئی سوال نہیں کروں گا— مگر آپ کے اطمینان کے لیے یہ ضرور کہوں گا کہ آپ ذرا کرید کر دیکھیں تو آپ کو زندگی میں ایک سے ایک بڑھ کر دردناک واقعات دکھائی دیں گے...... جب میں ایسے لوگوں کے حالات سنتا ہوں جن پر اس سلسلہ میں مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تو میرے دل کو ایک گونا تسکین سی حاصل ہوئی، بے اختیار آسمان کی جانب ہاتھ اٹھ جاتے ہیں کہ خدایا! تیری حکمت اور مصلحت کو سمجھنا ہم خاکی انسانوں کی محدود عقل کے بس کی بات نہیں......
اب آپ جہاں جارہے ہیں وہیں ایک ایسا عجیب وغریب اور دردناک واقعہ پیش آچکا ہے کہ جو سنے خون کے آنسو روئے۔"

میں نے گفتگو کا رخ بدلتے دیکھ کر قدرے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔"کیوں کیا واقعہ پیش آیا تھا؟"

اس پر حنیف نے ایک سگریٹ کا سوال کیا جو میں نے فوراً پیش کردیا۔ اس نے دھواں اڑاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"صاحب کوئی پینتالیس برس ادھر کی بات ہے کہ بھلے گھر کا ایک نوجوان نہ جانے کہاں سے ادھر آنکلا۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ان دنوں ان پہاڑیوں کی طرف بہت کم لوگ آتے تھے۔ یہی پہاڑی لوگ روزگار کی تلاش میں میدانوں کو جاتے اور پھر وہاں کچھ روپیہ پیدا کرلیتے تو واپس چلے جاتے— ان مٹی مٹی سی پگڈنڈیوں پر صرف ان پہاڑی لوگوں ہی کے قدم پڑتے تھے......"

"تم اس نوجوان کی بات کررہے تھے۔"

"ہاں جی، تو صاحب وہ نہ جانے کیسے ادھر آنکلا، اس بات کا تو آج تک پتہ نہ چلا، لیکن ان پہاڑیوں میں آنا اس کے لیے بڑا منحوس ثابت ہوا......"

''کیوں کیا ہوا؟''

''بس وہی — عشق۔''

''کس سے؟''

''یہیں ایک پہاڑی لڑکی سے۔ آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ ادھر حسن نہیں ملتا ابی صاحب کبھی کبھی تو ایسی صورتیں نظر آ جاتی ہیں کہ آپ ان کا مونہہ دیکھتے رہ جائیں حلق سوکھ جائے، آواز تک نہ نکلے۔ قدرت کا وہ رنگ و روغن ان چہروں پر دکھائی دیتا ہے کہ شہروں کے روژ اور لپ اسٹک پھیکے پڑ جاتے ہیں.....''

''تو کیا لڑکی کو بھی اس سے محبت ہوئی کہ نہیں.....''

''ہوئی صاحب، خوب ہوئی..... لیکن پہلے پہل نہیں۔''

''وہ کیسے؟ کیا پہلی نظر کا پیار نہیں تھا.....؟''

''ہوسکتا ہے جی کہ پہلی نظر کا ہی پیار ہو..... مگر آپ جانتے ہی ہیں کہ محبت بھی تو کئی صورتیں اختیار کرتی ہے، کبھی محبت نفرت اور حقارت کے بھیس میں آتی ہے اور بعد میں یہ چولا اُتار کر اصلی حالت میں آجاتی ہے یہی قصہ یہاں پیش آیا۔''

یہ کہہ کر اس نے سگریٹ کے پے در پے تین چار کش لیے اور پھر کہنا شروع کیا ''کہتے ہیں کہ پہلے پہل ان کی آنکھیں چار اس وقت ہوئیں جب کہ لڑکی تن تنہا گاؤں سے کچھ دور ندی میں نہا رہی تھی۔ نوجوان گھومتا پھرتا ادھر جا نکلا۔ اس نے جھاڑیوں پر کچھ کپڑے دیکھے وہ یہ پہچان بھی نہیں پایا کہ کپڑے زنانہ ہیں کہ مردانہ کہ دفعتاً وہ لڑکی لا علمی میں ندی سے نکلی اور اسے دیکھتے ہی شعلے کی طرح لپک کر اس جھاڑی کے پیچھے چھپ گئی جس پر کہ اس کے کپڑے پڑے تھے۔ جلدی جلدی ہانپتے کانپتے اس نے کپڑے پہنے اور پھر وہ اس نوجوان کی طرف بڑھی اور زن سے اس کے منہ پر طمانچہ مارا اور خود آگے بڑھ گئی۔

''پہلی ملاقات تو بہت خطرناک رہی۔''

''جی ہاں— لیکن اس کے بعد لڑکی جدھر جاتی نوجوان اس کے راستے پر نظریں بچھائے دکھائی دیتا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی بولی تو سمجھتے نہیں تھے۔ لڑکی اکثر اسے ڈانٹ ڈپٹ دیتی۔ آخر بڑی مشکل سے لڑکے نے اسے ٹوٹی پھوٹی زبان میں سمجھایا کہ وہ کوئی بدمعاش آدمی نہیں تھا۔ اتفاقاً ادھر جا نکلا، جہاں وہ نہاری تھی اور پھر اس کو رو برو دیکھا تو اس کے اوسان ہی خطا ہوگئے اسے اس بات کا ہوش تک نہ رہا کہ وہ خود کون ہے کہاں کھڑا ہے، اسے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ بالآخر بہ ہزار خرابی اس حسین بت کا دل موم ہوا، اور اپنے عاشق کے عشق کو صاد دیکھ کر اس کے دل میں بھی محبت کی چنگاری بھڑکی اور ایک روز انہیں پہاڑیوں کی کسی کنج میں اس نے اپنے پیارے کا سر سینے سے لگا کر اسے اپنی محبت کا یقین دلایا...... اور اس مہ رو قاتل کے اس پیار نے عاشق کو اور کسی کام کا نہ چھوڑا......''

''میرے خیال میں ان کے عشق کا بھانڈا جلد ہی پھوٹ گیا ہوگا۔''

''جی ہاں— ایک بار جب دونوں کے دل میں محبت کی کلی چٹکی تو پھر صبر کا دامن ہاتھ سے جاتا رہا۔ دونوں نے ہر ممکن لمحہ ایک دوسرے کے بازوؤں میں گزارنا شروع کردیا۔ لازمی بات تھی کہ لوگوں کو بھی ان کی محبت کا علم ہو— جب ذرا بات پھیل نکلی تو لڑکی نے لڑکے سے کہا کہ وہ اس کے ماں باپ سے اس سے شادی کی بات کرے۔ نوجوان نے ایسا ہی کیا تو ماں باپ نے معمولی حیل و حجت کے بعد اجازت دے دی۔''

''اچھا تو اجازت ملنے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی۔ جب کوئی حریف نہ تھا اور نہ کوئی رکاوٹ تو پھر......؟''

''اجی صبر تو کیجئے...... شادی طے ہوجانے پر نوجوان نے کہا کہ وہ اپنے گھر جائے گا اور باپ سے اپنے حصے کی جائیداد لے لے گا اور پھر اسے بیچ باچ کر کل روپیہ اور اپنا سامان لے آئے گا اور زندگی کے باقی دن انہیں پہاڑیوں کے دامن میں گزار

دے گا۔۔۔ یہ کہہ کر وہ اپنے وطن لوٹا اور وہ پہاڑی حسینہ اس کے پیچھے پیچھے دور تک بھاگی بھاگی گئی لیکن جدائی ناگزیر تھی۔ آخر بصد آہ و بکا اسے محبوب سے الگ ہونا پڑا۔۔۔ ادھر قصہ یہ ہوا کہ ماں باپ نے لڑکے کی شادی اور جگہ طے کر رکھی تھی۔ لڑکے سے کسی نے پوچھا تک نہیں۔ جب لڑکے کو اس بات کا علم ہوا تو وہ سٹپٹایا اور اس نے شادی سے صاف انکار کر دیا ادھر جس لڑکی سے ماں باپ نے اس کی شادی طے کی تھی، اس کے گھر والوں پر یہ بھید کھل گیا کہ حضرت کہیں اور نظر لڑا کر آئے ہیں۔ اس پر باہمی تلخی اور بڑھی۔ لڑکی والوں نے اس میں اپنی انتہائی ذلت سمجھی۔ آپ سمجھئے کہ وہ زمانہ کون سا تھا۔ بالآخر مایوس ہو کر لڑکی والوں نے کسی ترکیب سے لڑکی کا خون کر کے الزام اس کے منگیتر پر جڑ دیا۔ قتل کی وجہ بتائی گئی یہ کہ اس نے کسی اور لڑکی سے شادی رچانے کا تہیا کر لیا تھا......"

"حد ہے بدمعاشی کی......"

"اجی بس اپنا اپنا دماغ ہے۔"

"اچھا تو پھر کیا ہوا؟"

"خدا آپ کا بھلا کرے پھر ہوا یہ کہ مقدمہ چلا۔ طویل قانونی بحثوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ نوجوان کو طویل مدت کے لیے قید سخت کی سزا ملی......"

"سزا ملی؟"

"جی ہاں۔۔۔ اب سارے حقائق کا کسے علم ہے؟ سنی سنائی بات بتا رہا ہوں۔"

"ادھر پہاڑن لڑکی کا کیا بنا......؟"

"ادھر یہ غریب شب و روز پیا کے انتظار میں گھڑیاں گنتی رہی۔ نوبت ہفتوں، مہینوں سے گزر کر سالوں تک پہنچی۔ پیا نے آنا تھا نہ آیا۔۔۔ جسم آخر گوشت پوست کا لوتھڑا تھا کہاں تک صعوبتیں سہ سکتا۔ آخر ایک روز عین عالم شباب میں موت کو لبیک کہا لیکن آنکھیں اس حالت میں بھی منتظر تھیں......"

"بھئی یہ تو بہت ہی دردناک کہانی ہے...... اس بے چاری کو عاشق کی مجبوری کا

عمر ہی نہیں ہوا ہوگا.....''

''ہوتا بھی تو نتیجہ وہی نکلتا.....''

میں نے اداسی میں سر نیچے جھکا لیا۔ ہم دونوں کچھ دیر تک خاموشی سے بارش کا شور سنتے رہے پھر حنیف نے کہا ''میں نے جو یہ قصۂ محبت آپ کو سنایا تو اس کی دو وجوہ تھیں۔''

''وہ کیا؟''

''ایک تو یہ کہ آپ کے دل کی کچھ تو ڈھارس بندھے۔ آپ کو معلوم ہو جائے کہ راہِ عشق کس قدر پرخار ہے۔ آپ جان جائیں کہ اس راہ میں کیسے کیسے دکھ سہنے پڑ جاتے ہیں اور دوسرے اس لیے کہ آپ جس مکان میں قیام کریں گے اس سے ایک آدھ فرلانگ پرے ایک چھوٹی سی سادھی بنی ہوئی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسی جگہ اس نامراد لڑکی کا جسم سپردِ آتش کیا گیا تھا.....''

اس سے میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ حنیف نے پھر کہنا شروع کیا ''ادھر تین چار برس سے ایک بوڑھا ان پہاڑیوں میں گھومتا پھرتا نظر آتا ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ اپنا زیادہ تر وقت اسی سادھی کے قریب گزارتا ہے۔ کبھی کبھار کسی غرض سے چند منٹ کے لیے ادھر اُدھر چلا جائے تو بات اور ہے..... مشہور ہے کہ یہ وہی پرانا عاشق ہے جو جیل سے چھوٹنے کے بعد زندگی کے آخری سال محبوبہ کی سادھی کی قربت میں گزار رہا ہے۔''

میرے دل کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی میں نے دریافت کیا ''کیا تم نے اس سے بات چیت نہیں کی کبھی؟''

''وہ گونگا بھی ہے اور بہرہ بھی..... صرف اداس آنکھوں میں قوتِ بینائی باقی ہے ورنہ محبوبہ کی سادھی کے ہر دم کے دیدار سے بھی محروم رہتا..... آپ اسے اکثر دیکھا کریں گے آپ کے مکان سے چند قدم پر ایک پیڑ تلے بیٹھا رہتا ہے وہ..... اس کی موجودگی

سے کوفت تو نہ ہوگی آپ کو؟ بے چارے پر رحم کیا جائے وہ قطعاً بے ضرر انسان ہے۔"
"نہیں بھائی میں اس سے کچھ نہیں کہوں گا۔ آخر بچارا میرا کیا لے گا۔"

بارش تھمی تو ہمارا قافلہ پھر روانہ ہوگیا۔
سفر کا باقی حصہ اکثر اس قصۂ محبت کے مختلف پہلوؤں پر تبادلۂ خیال کرنے میں گزرا۔
بالآخر ہم منزل تک جا پہنچے۔ مجھے وہ مقام بہت پسند آیا۔ فی الحقیقت ارد گرد کے قدرتی مناظر اس قدر حسین تھے کہ بہشت بریں کا دھوکہ ہوتا تھا۔
وہاں اپنے وکیل دوست سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ چند دن میرے پاس رہنے کے خیال سے وہاں پہلے ہی سے موجود تھا۔ حنیف دوسرے دن رخصت ہوا تو بھی میرے دل کو کچھ دھکا سا لگا کیوں کہ انجانے میں اس سے بھی لگاؤ پیدا ہوگیا تھا۔ میں نے کہا "حنیف تم ادھر کبھی کبھار آتے ہی ہوگے جب آؤ مجھ سے ضرور ملنا۔"
اس نے گرم جوشی سے جواب دیا "ان شاء اللہ ضرور ملاقات ہوگی۔ خود میری بھی تمنا ہے اچھا آداب۔"
یہ کہہ کر وہ رخصت ہوگیا۔
میرا دوست چند دن میرے ساتھ رہا۔ ہم دونوں نے اس سادھی کو بھی دیکھا جہاں اس وقت سوائے چند ٹوٹے پتھروں اور خار دار جھاڑیوں کے اور کچھ نشان باقی نہیں تھا۔ بوڑھے والی بات بھی سچ نکلی۔ میں نے اسے اکثر دیکھا لیکن قریب جانے کی کوشش نہیں کی۔ کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ وہ گونگا ہے اور بہرا بھی۔ اس لیے ملاقات اداس نظروں کے تبادلے کے سوا اور کچھ نہ ہوگی۔

مجھے وہاں آئے دس دن بیت چکے تھے۔ میرا دوست بھی رخصت ہو چکا تھا،

کیوں کہ اسے اپنا پروگرام پورا کرنا تھا۔ ادھر میں بالکل تنہا رہ گیا۔ آس پاس چھوٹے موٹے دیہات تھے۔ مجھے انہیں لوگوں میں اپنا من بہلانا تھا لیکن برسات کی وہ شدت تھی کہ ادھر اُدھر جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ تنہائی میں مجھے اپنی شوبھا کی یاد اور شدت سے ستانے لگی۔

دل بہلانے کے لیے میں نے گھر کے کاموں میں دل چسپی لینی شروع کی۔ باورچی خانے میں صرف باورچی پرانا نوکر تھا۔ میں نے کھانا پکانے کی کتابوں کو دیکھ دیکھ کر اس سے کچھ نئے کھانے پکوائے۔ میرے پاس باغبانی پر چند کتابیں تھیں ان کا مطالعہ شروع کردیا تا کہ اس خیال کو عملی صورت دی جاسکے۔

میرے دوست نے پہاڑی لڑکیوں کے بارے میں جو اشارے کیے تھے وہ بھی بہت حد تک درست ثابت ہوئے۔ بعض پہاڑی عورتیں اور لڑکیاں کبھی کبھی ہمارے مکان کا چکر لگاتی تھیں، وہ لکڑیاں، کوئلہ یا کچھ سبزیاں وغیرہ لے کر آتی تھیں۔ لیکن یہاں تو دل ہی بجھ چکا تھا۔ اس قسم کی چہل بازی کی گنجائش ہی کہاں تھی۔

ایک دوپہر — کہنے کو دوپہر، لیکن آسمان بادلوں سے اٹا پڑا تھا اور بارش موسلا دھار ہو رہی تھی۔ میں اردگرد کے حسین نظاروں کا احساس رکھتے ہوئے بھی دل کی اداس نگری میں گم تھا۔ پھر میں نے بصد کوشش اپنے آپ کو اس کیفیت سے نکالنے کی کوشش کی۔ میں نے باورچی کو آواز دے کر چائے لانے کے لیے کہا اور پھر سوچنے لگا کہ میں اپنا باغ کیسے تیار کروں گا۔

سامنے ایک چھوٹے سے پیڑ تلے وہی بوڑھا بیٹھا تھا۔ سوچا وہاں بھاگ رہا ہوگا۔ اسے بلا کر برآمدے تلے لے آؤں۔ ایک آدھ گلاس چائے پی لے گا...... میں اب تک اس کے قریب نہیں گیا تھا نہ جانے میں اپنے آپ میں اتنی ہمت کیوں نہیں پاتا تھا۔

چھتری تانے میں وہاں پہنچا تو قریب سے اس کی صورت نظر آئی۔ وہ یوں بھی عمر رسیدہ تھا، لیکن ان دکھوں نے تو اس کے چہرے کے خطوط کو اور گہرا کر دیا تھا۔

آنکھوں میں بے رونقی اور بے چینی کے سوا زندگی کے آثار تک مفقود تھے۔۔۔ میں نے چاہا کہ وہ میری طرف متوجہ ہو لیکن وہ تو ایک بے جان بت کی طرح بیٹھا۔ پیڑ کی شاخوں سے بوندیں ٹپک رہی تھیں اور تنے کی نمی اس کی پیٹھ کو گیلا کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ کبھی وہ بھی حسین جوان رہا ہوگا اس کے پہلو میں تڑپتا ہوا دل ہوگا۔۔۔ اس سے بات کرنا لا حاصل تھا۔ چنانچہ یہ سوچ کر کہ اسے چائے کا گلاس اسی جگہ بھجوادوں گا واپس چلا آیا۔

نوکر اسے چائے دے آیا۔۔۔ اس وقت میں برآمدے میں آرام کرسی پر نیم دراز تھا، بارش کا زور کم ہو رہا تھا، رنگ برنگے پہاڑ عظیم الجثہ جانوروں کے مانند دکھائی دے رہے تھے۔ ڈھلانوں پر لمبی ہری گھاس بارش کی بوندوں کے تھپیڑے کھا کھا کر رقص کر رہی تھیں۔۔۔ اسی اثنا میں دور سے ایک آدمی آتا دکھائی دیا۔ وہ ادھر ہی کو آرہا تھا۔ قریب پہنچا تو میں نے پہچانا کہ وہ حنیف تھا۔

اسے دیکھ کر مجھے قدرے خوشی محسوس ہوئی۔ کیوں کہ بے حد تنہائی کا احساس کر رہا تھا۔ اس نے برساتی اوڑھ رکھی تھی اور سر کے اوپر ٹوپ کے بجائے پتوں کا چھتر تھا۔ قریب پہنچ کر اس نے ہنستے ہوئے آداب عرض کی۔ میں نے قریب پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے برساتی اتار کر الگ رکھ دی اور بولا۔ ''کہیے! مزاج اچھا تو ہے نا؟''

''مزاج کی بھلی پوچھی...... تم اپنی کہو۔''

''میرا وہی حال ہے دس دن کے بعد حاضر ہوا ہوں۔ ایک سواری کو ادھر لانا تھا...... ارے صاحب عجیب بات یہ کہ وہ بھی مریضِ عشق ہیں۔''

میری دل چسپی بڑھی۔ بھیگی بھیگی شام، خواب ناک فضا میں ایک اور داستانِ عشق!

میں نے سر گھما کر نوکر کو آواز دی ''دو پیالے چائے لانا بھئی!''

میرے منہ سے یہ الفاظ ادا ہوئے ہی تھے کہ میں نے فرش پر دو زنانہ پاؤں

دیکھے— میں دم بخود ہو کر رہ گیا— سر سے پاؤں تک پہلے تو ایک جھنجھلاہٹ پیدا ہوئی اور پھر گرم گرم سی کیفیت...... یہ پاؤں تو میرے جانے پہچانے پاؤں تھے......

سر اٹھا کر اوپر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی...... یہ پاؤں یہاں کیسے پہنچے سب رشتے، سب ناطے توڑ کر...... میری تنہائی دور کرنے......

گورے گورے پاؤں سنہرے سینڈلوں میں جھلک رہے تھے، حسین، غیر متحرک، دردناک امید و بیم کی کیفیت لیے ہوئے......

حنیف کی دبی دبی ہنسی کی آواز سنائی دی اور پھر وہ بلند آواز میں پکار کر بولا

"اے باورچی! دو نہیں تین کپ چائے لانا......"

یہ افسانہ سالنامہ بانو جنوری 1960 میں شائع ہوا تھا۔ کسی افسانوی مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔ کلیات میں پہلی بار شامل کیا جاتا ہے۔

ISBN: 978-81-7587-279-0

कौमी काउंसिल बराए फरोग़े-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

West Block-1, R.K. Puram, New Delhi-110066